ہزار داستان



ایڈیٹر

لاہور

قواعد وضوابط

(۱) ہزار داستان ہر انگریزی مہینہ کے دوسرے اور چوتھے ہفتہ میں دارالاشاعت ادب لطیف لاہور سے شائع ہوجایا کریگا۔

(۲) رسالہ کی ضخامت کم از کم ۴۸ صفحات کی ہوگی۔ اور ایک سال کی مجموعی تعداد کم از کم ایک ہزار دو سو صفحات پر مشتمل ہوا کریگی۔

(۳) مضامین صرف افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے پیرائے میں درج رسالہ ہونگے۔

(۴) مضامین میں تعلیم، تہذیب اور تفریح کے اصول اور معیارِ زبان کا لحاظ ضروری ہے۔

(۵) مذہبی، سیاسی، دل آزار ذاتیات، اور دلشکن تنقیدی مضامین درج رسالہ نہ ہوسکینگے۔

(۶) مستند اور مقبول مصنفین کے ترجمے، قابلِ قبول ہونگے۔

(۷) اُجرت طلب مضامین کا معاوضہ مضامین کی نوعیت وحیثیت کے لحاظ سے ادا کیا جائیگا جسکے متعلق اڈیٹر سے مراسلت کرلی جائے۔

(۸) وہی نظمیں اور غزلیں قابل اشاعت ہونگی جن کو ہمارے شعبہ نظم کے ناظم نے قابلِ اشاعت قرار دے دیا ہو

(۹) مضامین کے متعلق جملہ مراسلت اڈیٹر سے ہونی چاہیئے۔

(۱۰) خریداری، ترسیل زرِ چندہ اشتہارات اور اسی سلسلہ کے دوسرے امورِ ہنگامی کی بابت مینجر سے خط وکتابت کرنی چاہیئے

(۱۱) سالانہ قیمت آٹھ روپے ششماہی پانچ روپیہ۔ قیمت پرچہ نمونہ ۸ر

(۱۲) خط وکتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔ جو لفافہ پر مندرج ہے۔

(۱۳) جواب طلب خطوط کے لئے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ ارسال کرنا لازمی ہے۔

(۱۴) ترسیل زر کے وقت منی آرڈر فارم پر اپنا پورا نام مع مفصل وصاف پتہ کے تحریر کرنا ضروری ہے۔

(۱۵) ہزار داستان میں خلاف تہذیب اشتہارات قطعاً درج نہیں ہوسکتے۔

(۱۶) رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں تاریخ اشاعت سے ایک ہفتہ کے اندر اندر دفتر میں اطلاع موصول ہوجانی چاہیئے تاکہ رفع شکایت کا انتظام کیا جائے بصورت تاخیر دفتر پرچہ بلاقیمت بھیجنے سے معذور سمجھا جائے۔

مینجر رسالہ ہزار داستان لاہور

ہزار داستان

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی-اے (علیگ)

جلد ۱ | اشاعتِ اوّل ماہِ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تصویر:- شاعر اور اس کا ساقی

[illegible]

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں

عرضِ تمنّا

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
مُدّت ہُوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہُوئے

~~~~~~~~~~

کیا ہی خوشگوار ہے شب انتظار کی وہ رُوح پرور کلفت، جس کے آغوشِ اضطراب میں صبحِ کامرانی مُسکراتی ہُوئی نظر آئے۔ اور کس قدر مُبارک ہے کامرانی کا وُہ نشاط آور منظر، جس کی ایک لذّتِ دید دل و دماغ کو نئی آرزوؤں، نئے ولولوں، نئی کشاکشوں کا جولانگاہ بنا دے۔ وہ سیلِ تمنّا جو مُدّتوں تک صبر و ضبط کی بندشوں سے متصادم ہو ہو کر قلب کو ایک محشرستانِ بیقراری بنائے ہوئے تھا۔ آج روانی کی راہ ڈھونڈھ کر متلاطم ہو رہا ہے۔ آرزوؤں کا وہ سوزِ پنہاں جس نے برسوں تک داغہائے جگر کو روشن کر رکھا تھا۔ آج شعلۂ شمع بنکر گرمیِ محفل کو ایک نئی سوزش ایک نئی تپش کا پیغام دے رہا ہے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس | عرصہ ہُوا ہے سیرِ چراغاں کئے ہُوئے

مَیں نہیں عرض کر سکتا کہ مناسبتِ طبعی، اور اضطرابِ ارادی نے کیا عالم کر رکھا تھا کہ ادبِ لطیف کے دلکش مگر منتشر اجزا کو علمی رسائل میں جگہ تلاش کرتے دیکھ کر اور بسا اوقات فقدانِ تنظیم و عدمِ قدر شناسی کے ہاتھوں اِن کو نذرِ پریشانی پا کر جی تڑپ جاتا تھا۔ دِل کا ذوق چاہتا تھا۔ کہ اِس شیرازۂ پریشان کی جمعیّت، آنکھوں کا تقاضا تھا۔ کہ اِس جمعیت میں رنگینی اور نگاہ پروری کا سامان ہو۔ اپنے عشق کو حُسن کی صُورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنّا تھی۔ اور اس حُسن کی شعلہ سامانیوں سے دوسروں کے دل میں عشق کی آگ بھڑکانے کی آرزو۔

تماشائے گلشن تمنائے چیدن | بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم
~~~~~~~~~~

اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی — ہجوم تمنا سے ناچار ہیں ہم

دوسرے ممالک میں ادب لطیف کی تربیت و تنظیم میں ادبی حلقوں کی سرگرمیاں اور اس باب میں معاصرین ملک کی بے پروائیاں میری آتش شوق کے لئے ہوا کے جھونکے تھے جن سے آگ بھڑکتی تھی۔ اور جوش زندہ ہوتا تھا

عشق در من آتشے افروختہ است — فرصتش باد اکہ جانم سوختہ است

عرصے تک میں اس آتشکدہ میں رہا۔ اسباب کی تلاش تھی۔ اور انجام کی فکر۔ اپنی کم مائگی کا احساس تھا۔ اہل ذوق کی بے نیازی کا خیال وسوسے تھے اور موانع ۔ وسوسوں کو اسی آگ نے جلا دیا۔ موانع ... آنسوؤں میں بہ گئے۔ سوزش دروں نے ارادوں میں حرارت عمل پیدا کر دی ۔ اور دیوانگی شوق نے عقل کی مصلحت ... سے بے پروا ہو کر اس گرمیِ اندیشہ کو ایک مادی صورت میں متشکل کر دیا۔

ہزار داستان اسی ذوق اسی شوق اسی دیوانگی کی تعبیر اسی بیتابیِ نظارہ، اسی ہجوم تمنا اسی ... شوق کی زندہ تصویر ہے۔ جو سیل جذبات میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔ اب ہزار داستان کے صفحات ... ہے۔ جو صہبائے تصور میری پرنم آنکھوں میں چھلکتی تھی۔ اب ہزار داستان کے نقش و نگار میں جھلک رہی ہے۔

جس زبان کی لطافت نے دل کو ذوق ادب سے سرشار کیا تھا۔ اس کا قرض سر پر تھا۔ سو آج ... اردو میں ادب لطیف کی کمی جس فرض کو یاد دلاتی تھی۔ اس کا بار گراں دل و دماغ پر تھا۔ سو آج اس سے ... ہوں۔ ع۔ دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا ۔

ادب لطیف علم و فنون کی کن اصناف سے مرکب ہے۔ اور کن سے متغایر ایک بحث طلب سوال ہے۔ ممکن ہے کہ علم و فن کے علمبردار علوم و فنون کے فلسفیانہ مباحث کو بھی ادب لطیف کی نازک حدود میں داخل کرنے ... اور ادب کی رنگینیوں کے شیدا ادب لطیف کے نظر فریب دائرہ میں علمی نظموں اور زندگی کی بے لطفی ... لبریز افسانوں کے شمول کو بھی دخل در معقولات تصور کریں۔ بہر حال ہزار داستان کے صفحات اس قسم کی ... نہیں ہو سکتے۔ وہ عقل و دلائل کا حریف بننا نہیں چاہتا۔ بلکہ ذوق و وجدان کو دعوت دیتا ہے۔ وہ ... کا مدعی نہیں صرف چشم تماشا اور دل حساس کا طلبگار ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب — چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اِس لئے ادبِ لطیف کی یہی تعریف بس ہے۔ کہ وہ تمام فنونِ لطیفہ جو عالمِ نقش و رنگ میں سما سکیں۔ اور جن کا منتہائے نظر باوجودِ تعلیم تفریح ہو۔ اور باوصفِ تفریح تہذیب ہو۔ ادب لطیف کے عناصر ہیں۔

اہلِ علم ادبِ لطیف سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ موضوعاتِ علم مسائلِ ادب سے مختلف نہیں۔ صرف اسلوب و پرداز کا فرق ہے۔ ایک منطقی ترتیب کا پابند ہے۔ دوسرا اس سے آزاد۔ ایک آہنگ متعین ہے۔ دوسرا نغمۂ بے پروا ایک کا تعلق جسم سے ہے۔ دوسرے کا رُوح سے۔ ایک کا معمول انسانی دماغ ہے دوسرے کا منشا انسان کا دِل۔ ایک قوموں کے عروج و زوال کی داستان سناتا ہے۔ اور اُسے تاریخ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ دوسرا انسانی زندگیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور اُسے افسانہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ایک اچھائیوں اور بُرائیوں کے نام گنتا ہے۔ دوسرا ان کے اسباب و نتائج انسانی اعمال میں ڈھونڈتا ہے۔ ایک عقل و فکر کو دعوتِ تدبّر دیتا ہے۔ اور نظرِ غائر اور چینِ جبین کا شیدائی ہے۔ دوسرا آرام و تفریح کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اور شگفتگی و سرخوشی کا متوالہ۔ ایک آفتاب ہے۔ کہ اُسکی روشنی ہے۔ مگر آنکھوں کو خیرہ بھی کرتی ہے۔ دوسرا ماہتاب کہ اُس کی ضیا پاشی طاقتِ دید کو مضمحل نہیں کرتی اِن خصوصیتوں سے متاثر ہو کر ہزار داستان نے اپنے حلقۂ عمل کو ادبِ لطیف کے لئے محدود کر دیا ہے۔ اِس میں وُہ سب کچھ ہوگا۔ جو ذوقِ سلیم کی تشنگی کو بجھائے، تھکے ہُوئے دماغوں کو آرام دے۔ پژمُردہ دلوں کو نسیمِ بہار کا مژدہ سنائے۔

این خراباتِ مغان است و درو رندان اند　　شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے سرود

ادبِ لطیف اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے ہر عالمِ نفسیات پر اپنی ضرورت موجہ طور پر ثابت کر چکا ہے۔ زندگی کی احتیاجات خواہ وہ خلقی ہوں یا معاشری و اجتماعی چار و ناچار انسان کو دُنیاوی مشاغل میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ یہ مشاغل ایک کشاکش چاہتے ہیں۔ اور انہماک، جن سے دماغ تھک جاتا ہے۔ اور دِل گھبرا اُٹھتا ہے ادبِ لطیف ان مصروفیتوں کے درمیان ایک وقفۂ راحت ہے۔

اصنافِ ادب لطیف میں افسانہ نگاری کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ وہی فن ہے جو علم البیان میں تشبیہ و تمثیل کے مراتب طے کر کے اب حکایت، افسانہ، ناول اور ڈراما کی صورت میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اصولی نقطۂ نظر سے بھی افسانہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے عشقیہ مضامین سے تو لوگوں میں عام طور پر دلچسپی [illegible] افسانہ کے سانچے میں ڈھل کر علم و حکمت، معاشرت و اخلاق کے غیر دلچسپ اور خشک

مباحث بھی کچھ ایسے ہلکے اور دلکش ہوجاتے ہیں۔ کہ تعلیمی ضابطہ آرائیوں سے محروم و ناواقف اشخاص بھی معارف کی ضروری روشنی سے روشناس ہوجاتے ہیں۔ یہ افسانہ کا ایسا نتیجہ خیز پہلو ہے۔ جو عام ابتدائی جبریہ تعلیم کو بھی میسّر نہیں۔ اس کے علاوہ جبکہ انسانی زندگی کے تمام پہلو افسانوں میں دکھلائے جاتے ہیں۔ تو قدرتی زبان کے استعمال میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور توسیع زبان کا مہتم بالشان کام خود بخود انجام پاتا رہتا ہے

چنانچہ افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ سے ہزار داستان کے مدنظر بھی قوم اور زبان کی خدمت ہندوستان ادب لطیف کا وطن ہے۔ کیونکہ یہ تخیّل کا ٹلک ہے۔ اور جذبات کی سرزمین حُسن کا ... اور عشق کی جولانگاہ نقاشی کا معدن ہے۔ اور مصوّری کا مسکن، شاعری کا جہان ہے۔ اور موسیقی کا ... پھر جائے حیرت ہے۔ کہ اس زبان میں جو ہندوستان کی متحدہ بولی ہے۔ ایک بھی ایسا رسالہ ... ادب لطیف کی دلچسپیوں کا ذخیرہ فراہم کرسکے۔ اور اس ذخیرہ کو ایک حسین وجمیل معطر و رنگین گلدستہ کی شکل ... ادب کی خدمت میں پیش کرسکے۔

اسی کمی کو محسوس کرکے میں نے ہزار داستان کو صرف افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کا ایک ... بنانے کی تدبیر کی ہے۔ مگر ایک شعر آفرین سرزمین میں ادب لطیف کی جاذبیت کو صرف انہی اصناف ... جہاں ادب لطیف کے حق میں بے انصافی تھی۔ وہیں اُردو اور اُردو کے شیدائیوں کے مذاق کی توہین ... ہزار داستان میں نظم و شعر کا التزام بھی ناگزیر تھا۔

صدیوں کے ترقّی یافتہ رنگ تغزل کو مزید اصلاح و ترقی کے ساتھ باقی رکھنا اور جدید رنگ ... کارآمد عنصر میں مشرقی شاعری کی قدیم دلاویز چاشنی کی آمیزش کرنا یقیناً ایک قومی ادب کے ارتقائی منازل کے لئے ضروری ہے۔

تاہم میرا مقصد صرف یہی نہیں ہے۔ کہ حصّہ نظم محض اشعار کا مجموعہ بن جائے۔ بلکہ میری خواہش ... شاعری کے بعض امتیازات کو نمایاں بھی کیا جائے۔ اور اسی غرض سے میں نے چند صفحات تنقید و تبصرہ ... وقف کردئے ہیں۔ جن میں تنقید کے دل شکن پہلو یعنی نقائص و معائب شماری کو ترک کرکے محض محا... اصول کار بنایا جائیگا۔

ادب لطیف کو جسقدر تعلق شاعری و موسیقی سے ہے اُسیقدر مصوّری و نقاشی سے بھی ہے۔ اوراسی لئے ہزار داستان کے صفحات ادب لطیف کے ایک ایسے جزو لاینفک سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ناظرین کی ضیافتِ نگاہ کے لئے ایسی تصاویر کا التزام بھی کیا گیا ہے۔ جو کسی خاص جذبۂ غیر متشکل کو ایک مرئی صورت میں پیش نظر کرنے کی اہل ہوں۔ یا جن کی زبان حال اُن کے معنوی اسرار ظاہر کرنے کے لئے دوسروں کو گویا کردے۔

ان سب مرقعہائے نگاہ پرور کے علاوہ ہزار داستان ان نامور اور سحر طراز شعراء کے احسانات کا اعتراف کرنے کیلئے جنھوں نے خونِ جگر کھا کھا کر انسانی فطرت کے جذبات عالی کو نادر حُسنِ صورت کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ ایک ایسا صفحۂ جمیل پیش کرتا رہیگا جو صوری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو۔ اور شائقین ادب کے ذوق شعر کو تسکین دینے کا اہل۔ تاکہ ہزار داستان کی رنگین و دلکش تصاویر کے ساتھ ساتھ یہ قطعاتِ مزیّن بھی ہندوستان کے گھروں کی زینت بن سکیں۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ مگر ہزار داستان کے لئے جو معیار میری آرزوؤں نے قائم کر رکھا ہے۔ اور جس معراجِ کمال کو میری پُرشوق نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ اس کے حصول کی تمنّا اب بھی دل کو بیقرار کر رہی ہے۔ اور اس لئے اگرچہ میری ابتدائی کوششیں آج ایک حد تک کامرانی سے ہم آغوش ہیں۔ مگر تشنگیٔ شوق کا تقاضا اور ہی کچھ ہے۔ اگر میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ اور شائقین نے ہزار داستان کی قدر افزائی کی جس کا اِسے مستحق بنانے کے لئے میں نے حتی الوسع کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اور نہ آیندہ انشاءاللہ کسی ارادی فروگذاشت کا احتمال ہے۔ تو اس قسم کے رسالے کی طباعت و صحافت کی حوصلہ شکن مشکلات اور ہزار داستان کی خطرناک ارزانیٔ قیمت کے باوجود انشاءاللہ وہ دن کبھی نہ آئیگا۔ کہ میری یہ حقیر ادبی سرگرمی شاہد ادب کی محفل ناز میں کسی طرح محجوب و منفعل ہو۔ لیکن اگر زمانے نے مساعدت نہ کی۔ اور ہزار داستان بھی نذر تغافل ہو گیا۔ تو میری معذورِ حیات آرزو ادائے فرض کی کامل مسرت اور ضمیر کے پورے اطمینان سے موسیقار کی طرح اپنے ہی سوز کی تپش میں جذب اور اپنے ہی ساز کی لے میں گم ہو جائیگی۔ اور جب کوئی آوارہ جنون پھر اس لیلائے مقصود کی تلاش میں بادیہ پیما ہوگا۔ تو اس وقت بھی میری خاکستر آرزو حیات بعد الممات کے زعم میں پکار اُٹھیگی ؎

غلید نہاے منقار ہما بر استخواں غالب — پس از عمرے بیادم داد لذّتہاے مژگاں را

اڈیٹر

شاعر اور اُس کا ساقی

تصویر کا دوسرا رُخ

شاعر میں عجیب مستیاں ہیں ۱ کچھ اور ہی مے پرستیاں ہیں
سیراب مے الست آیا ۲ دُنیا میں یہ ہو کے مست آیا
تخیّل کی سلطنت کا حاکم ۳ جذبہ کے تلاطموں میں قائم
افکارِ جہاں سے محو کاوش ۴ پروانہ کی شمع سے سفارش
سہتا ہے ستم گل و خزاں کے ۵ نغموں میں ہزار داستاں کے
انجم سے لڑا رہا ہے آنکھیں ۶ یا حور سے چار ہیں نگاہیں
رُوحوں سے خطاب کرنیوالا ۔ بیداری کو خواب کرنیوالا
دریا ہے کہیں سراب اس کو ۸ ذرہ کبھی آفتاب اس کو
تحسین نظر ہر ایک شے ہیں ۹ ڈوبا ہے وفا کے فلسفے میں
ہر سنگ میں طور دیکھتا ہے ۱۰ ہر شعلہ میں نور دیکھتا ہے
معمورِ جمال ہے زمانہ ۱۱ خود اس کا خیال ہے نشانہ
گھیرے ہوئے اسکی کارسازی ۱۲ دُنیائے حقیقی و مجازی
اُلفت کی تپش سے لذت اندوز ۱۳ پہلو میں ہے دِل کہ یکجہاں سوز
ساقی بھی ہے اِسکی جانِ عشرت ۱۴ یا مظہرِ پاک رُوحِ الفت
یا جلوہ مست حُسنِ رنگین ۱۵ تمثالِ شبابِ کیف آئین
مقصودِ حیاتِ دوستی ہے ۱۶ مضمونِ دُعائے عاشقی ہے
فقرہ فقرہ ہے بیخودی کوش ۱۷ آنکھوں آنکھوں میں کردے بیہوش
پھولوں کی شگفتگی دہن میں ۱۸ تحلیل بہار ہے بدن میں

تاثیرِ نفس بہار پرور (۱۹) اُڑتی ہے شراب پھول بنکر

(ناظم شعبۂ نظم)

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

ہزار داستان کا طغرائے امتیاز وہ شعر ہے۔ جو ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مدظلہ العالی نے نہ صرف اِس کے لئے موزوں فرمایا' بلکہ سرورق پر اپنے دست مکرمت سے تحریر کرکے ہزار داستان کے سرنامے پر نازش و فخر کی گویا ایک مُہر دوام ثبت فرمادی۔ یہ اُن جنّت نگاہ عواطف کی پہلی اور روشن جھلک ہے۔ جنہوں نے ہزار داستان کی تعمیر میں وقیع حصّہ لیا ہے!

محترمی جناب حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی نے جن کا دستِ شفا معروفِ مسیحائی رہتا ہے۔ اپنی کتابت سے سرنامے کو کفِ موسےٰ بنادیا ہے۔ یہ حروف نقوشِ خلوص بنکر میرے صفحۂ دل پر ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

سرورق کی ساری نقاشی میرے اُستاد مکرم مولوی محمد فیروزالدین صاحب (اے۔ ٹی۔ بی۔ ٹی (لنڈن) انسپکٹر آف انڈسٹریل سکولز پنجاب) کی شوخیِ تحریر کی فریادی ہے۔ موصوف نے اِس محنت و کاوش سے اِس کام کو انجام دیا ہے۔ گویا یہی کام اُن کی زندگی کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا۔

شاعر اور اُس کا ساقی جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کے حسنِ تخیل اور اُن ہی کے کمالِ مصوّری کا نتیجہ ہے۔ اِن کی شہرت تعریف سے مستغنی ہے۔ ہزار داستان کو فخر ہے کہ ایسے صاحبِ کمال کے نتائجِ طبع کا ایک بیش بہا ذخیرہ اِسکے صفحات کی آئندہ آرائش کا کفیل ہے۔ میں اِن سب حضرات موصوف الصدر کے احسانات گوناں گوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ کیونکہ ادا نہیں کرسکتا۔ تذکرہ و تکرار سے صرف قلبی و ذہنی اِنبساط مدِنظر ہے۔ اور بس میں اِس حوصلہ افزائی کے شکریہ سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ جو آنریبل مسٹر جسٹس شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے مفید مشوروں کی صورت میں ارزانی فرمائی۔ کیونکہ یہ محض اُس شفقت پر مبنی نہ تھی۔ جو موصوف کو ادبِ اُردو سے ہے۔ بلکہ اُس شفقت سے متعلق ہے جسکا میں بچپن سے خوگر ہوں!

تدوینِ رسالہ میں میرے عزیز سیّد امتیاز علی صاحب مستحقِ شکریہ ہیں جنہوں نے لیلےٰ اور شیکسپیئر کے ڈراما مڈسمر نائٹس ڈریم کے ترجموں کا اہم کام اپنے ذمہ لے لیا ہے "لیلےٰ" لارڈ لٹن کا مشہور و مقبول ناول ہے۔ اور اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ مڈسمر نائٹس ڈریم شیکسپیئر کے دورِ بہاریہ کی ایک شگفتہ یادگار ہے۔ اگر اسی نہج پر شیکسپیئر کی تمام تصنیفات کا مکمل ترجمہ ہوگیا۔ تو اُردو ادب کی ایک بڑی محرومی کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اور ہزار داستان کے ایک اہم مقصد کی تکمیل

مختصر افسانہ نگاری میں منشی پریم چند اور مسٹر سُدرشن' قبولیّتِ عام کا تمغہ حاصل کرچکے ہیں۔ اور اِن کی شہرت مزید تعریف سے مستغنی ہے۔ مقامِ مسرت ہے۔ کہ ہر دو حضرات نے بالالتزام صفحات ہزار داستان کو آراستہ کرنے کا ذمہ لے لیا ہے۔

جنابِ "پطرس" مجھے اجازت نہیں دیتے۔ کہ اُن کی غیر معمولی قابلیّت اور ممتاز شخصیّت کا اظہار کروں۔ لہذا صرف شکر گذار ہوں کہ مہربانی سے موصوف نے اپنے کرشمہ ہائے قلم کو ہزار داستان کے لئے وقف کردیا ہے۔

خندۂ تقدیر جو امریکہ کے نامور افسانہ نگار "جیک لنڈن" کے ایک مشہور افسانہ سے ماخوذ ہے۔ عزیزی سیّد محمد شاہ ایم۔ اے کی قدرتِ نگارش کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ ہزار داستان اِس خاموش ہستی کو جہانِ اُردو سے پہلی مرتبہ روشناس کرنے پر نازاں ہے۔

حصّۂ نظم کی جمعیّت و ترتیب میرے ایک ایسے عزیز دوست کی نگرانی میں ہے۔ جن کے علوئے ذوق اور مہارتِ فن پر مجھے کامل اعتماد ہے۔ اور جو اس کام میں میرے دستِ راست ہیں۔

میری اور میرے احباب کی انتہائی کوششیں دیگر اربابِ ذوق کے مشوروں سے مستغنی نہیں ہوسکتیں۔ صاحبانِ ذوق سے توقع ہے۔ کہ وہ مجھے اپنے مفید مشوروں سے محروم نہ رکھینگے۔ کہ یہ اُن کا فرض اور ہزار داستان کا حق ہے۔

بیا تا گل برافشانیم دمے در ساغر اندازیم ۔ فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

ایڈیٹر

ہیرے کی چوری

ایک سین میں ایک مکمّل ڈراما

اشخاص

یوسف جی اسمٰعیل بھائی :- بمبئی کے ایک امیر جوہری

سلیم :- ان کا ایک معتبر ملازم

شاہد حسین :- خفیہ پولیس کا افسر

ہدایات :- یوسف جی اپنے آراستہ کمرے میں بحالتِ پریشان بیٹھے ہیں۔ اس کمرے کے بائیں کونے میں ایک دروازہ ہے جو ان کی خوابگاہ میں کھلتا ہے۔ دائیں جانب اس کمرے کا بیرونی دروازہ ہے۔

یوسف جی۔ (وفورِ پریشانی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر) کس قدر تعجب ہے۔ کتنی حیرت ہے۔ کل میں نے اپنے ہاتھوں سے اس ہیرے کو تجوری میں بند کیا۔ تجوری ویسی کی ویسی بند ہے۔ چابی میرے پاس ہے۔ اور ہیرا غائب۔ (اُٹھ کر اور کمرے میں ٹہل کر) آخر یہ پولیس کس مرض کی دوا ہے [illegible] گھر کا کھوج کرنہ تلاش کرنے اور مجھ ہی سے سوالات پوچھنے کے سوا اور کچھ نہیں [illegible] اگر میں ہی بتا سکتا۔ تو ان کو یہ تکلیف کیوں دیتا۔ (کچھ [illegible] کر) آہ اگر یہ ہیرا گم ہوگیا تو . . . . .

(سلیم چائے کی کشتی ہاتھوں میں لیے [illegible] ہے)

سلیم۔ چائے حاضر ہے۔

یوسف۔ چائے! مگر سلیم اس کمرے میں [illegible] سوا اور کوئی نہیں آتا۔ پھر یا تو تم چور ہو یا میں۔

سلیم۔ (رونی صورت بنا کر) تو حضور کو مجھ پر [illegible] حضور کے نمک ہی کی مار پڑے۔ جو میں نے آنکھ اُٹھا کر بھی آپ کے مال کو [illegible] تک نہیں [illegible]

(ایک ایک کر کے ٹوپی۔ واسکٹ اور پھر جوتا اُتار کر دکھاتا ہے)

یوسف جی۔ (جوتے کو دیکھ کر) بس بھائی بس تلاشی ہو چکی۔

(سلیم پھر بسورنا شروع کرتا ہے)

ارے بھئی مَیں نے کب کہا ہے۔ کہ تم چور ہو۔

سلیم (روتے ہُوئے) ابھی ابھی آپ نے ہی تو کہا تھا کہ چور یا تم ہو یا مَیں۔

یُوسف جی۔ (چائے پیتے پیتے) تو بھئی مَیں نے کیا خطا کی تُم کو چور کہا۔ تو اپنے آپ کو کب بخشا۔ اچھا جانے دو بھائی معاف کرو۔ تم چور نہیں چور مَیں ہوں۔ مگر یہ تو ...

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

یہ کون؟ سلیم ذرا دیکھنا تو

(سلیم ٹیلیفون پر باتیں کرتا ہے)

سلیم۔ ہاں ہاں۔ تشریف رکھتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے۔

(یوسف جی سے مخاطب ہو کر)

کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ خُفیہ پولیس کے دفتر سے . . اُنہوں نے شاید یہی کہا ہے۔

یوسف جی۔ (جلدی سے چائے کا پیالہ رکھ کر) اب خواب غفلت سے جاگے۔ خیر۔ (ٹیلیفون پر) مَیں ہوں ... یوسف جی .... جی ہاں۔ جی ہاں۔ مَیں ہی یوسف جی اسمعیل بھائی ہوں۔ فرمایئے ..... جی ہاں چوری میرے ہی ہاں ہُوئی ہے۔ کون آئیگا۔ آپ؟ .... آپ کون صاحب ہیں.... شاہد حسین.... آپکی تعریف؟ ... انسپکٹر خفیہ پولیس آیئے صاحب ضرور آیئے۔ اور جلد آیئے۔ مَیں آپ ہی کے انتظار میں ہوں . دس بجے سے پہلے نہیں آسکتے؟

(قریب کی کرسی پر بیٹھ کر اور ذرا اطمینان سے گھڑی دیکھ)

ابھی نو بجے ہیں۔ اُفوہ ایک گھنٹہ باقی ہے۔ خیر مَیں اتنے میں کپڑے پہنے لیتا ہوں۔ سلیم تم یہاں ٹھہرو مَیں ذرا کپڑے بدل لوں۔

(خوابگاہ میں جاتے ہیں)

(سلیم ذرا سی دیر انتظار کرتا ہے۔ اور پھر احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر ٹیلیفون پر باتیں کرتا ہے)

دیکھو مَیں ہوں ٹالی۔ جلدی کرو۔ مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے دس بجے خفیہ پولیس کا افسر آ رہا ہے .. اُس کا نام؟ .. شاہد حسین۔ مگر پولیس نے مکان گھیر رکھا ہے۔ مَیں باہر نہیں جا سکتا۔ دس بجے.... ٹھیک دس بجے۔ خُدا کے واسطے جلدی کرو۔ مَیں کیا کروں .... بہت بہتر

(واپس آکر بڑے اطمینان سے دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یوسف جی داخل ہوتے ہیں)

یوسف جی۔ ہاں بھئی سلیم۔ تو تُم کو پُورا اطمینان ہے۔ کہ میرے اور تمہارے سوا کل سے اس کمرے میں کوئی نہیں آیا۔

سلیم۔ (پھر رونی صورت بنا کر) خُدا کا غضب ٹوٹے۔ جو مَیں نے کل سے آپ کے کمرے میں قدم بھی رکھا ہو۔

یوسف جی۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں میں نے تو یونہی ایک سوال کیا تھا۔ تم پھر رونے لگ گئے۔ جاؤ آرام کرو۔ ہاں چائے کے برتن اُٹھا لے جاؤ۔

(سلیم برتن اُٹھا کر روتا ہُوا چل دیتا ہے)

سلیم بالکل بے گناہ ہے۔ کسقدر معصوم ہے۔ میں نے اِسے ناحق رُلایا۔ کتنے برس سے میرے پاس کام کر رہا ہے۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

(سلیم داخل ہوتا ہے)

یوسف جی۔ کیوں کیا ہے۔

سلیم۔ حضور انسپکٹر شاہد حسین آپ سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔

یوسف جی۔ (گھڑی دیکھ کر) انسپکٹر شاہد حسین۔ ابھی تو سوا نو ہی بجے ہیں۔ خیر بُلا لو۔

(انسپکٹر شاہد حسین داخل ہوتے ہیں)

شاہد حسین۔ آداب عرض ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ ذرا وقت سے پہلے ہی آ گیا۔ مجھے آپکی پریشانی کا خیال تھا۔

یوسف جی۔ تسلیم۔ تسلیم۔ آپ نے بہت مہربانی کی میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

شاہد حسین۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو اِس چوری کا مفصل حال مجھے بتا دیجئے۔ تاکہ میں اپنی تحقیقات شروع کر سکوں۔

یوسف جی۔ ابھی مفصل حال کیا ہے۔ جو عرض کروں۔ میں جواہرات کی تجارت کرتا ہوں۔ کوئی آٹھ دن گذرے میں نے ایک ہیرا دس ہزار روپے پر خریدا۔ اور اپنے ... میں بہت سستا خریدا۔ کل رات تک وہ ... محفوظ تھا۔ اور آج غائب۔ بس۔

شاہد حسین۔ (سوچتے ہوئے) ہوں ہوں ... میں کل رات سے اِس وقت تک کون آیا۔

یوسف جی۔ صرف میں یا میرا ملازم۔ وہی ... آپکے آنے کی اطلاع دی۔ مگر وہ بہت معتبر ہے۔ مدت سے میرے پاس ہے۔ مجھے اُس پر کوئی شبہ نہیں۔

شاہد حسین۔ خیر۔ مگر یہ تو بتائیے۔ کہ ... ملازم ... سے کہیں باہر تو نہیں گیا۔

یوسف جی۔ بالکل نہیں۔

شاہد حسین۔ (سوچتے ہوئے) کیا میں اِس تجوری کو دیکھ سکتا ہوں۔

یوسف جی۔ بڑی خوشی سے۔ اِدھر آئیے۔ وہ میرے سونے کے کمرے میں رکھی ہے۔

(دونوں اُٹھ کر جانا چاہتے ہیں۔ کہ سلیم داخل ہوتا ہے)

سلیم۔ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ... اپنا نام انسپکٹر شاہد حسین بتاتے ہیں۔

یوسف جی۔ انسپکٹر شاہد حسین!

شاہد حسین ... [illegible]

انسپکٹر شاہد حسین۔ ہاں سیٹھ صاحب انہیں بلائیے۔ اچھا ہوا
کہ میں وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا۔
(سلیم سے) جاؤ انہیں بلالاؤ۔
(یوسف جی سے) مگر سنئیے۔ میرا نام نہ بتائیے گا۔ فقط یہی
کہہ دیجئے۔ کہ میں آپ کا ایک دوست ہوں۔
(سلیم اور انسپکٹر شاہد حسین نمبر ۲ داخل ہوتے ہیں)
شاہد حسین نمبر۲۔ تسلیمات (سلیم کو غور سے دیکھتے ہوئے
یوسف جی سے مخاطب ہوکر) سیٹھ جی اسمٰعیل بھائی آپ
ہی کا نام ہے۔ میں خفیہ پولیس۔ ۔ ۔ ۔ (شاہد حسین نمبرا کی
طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ کر) اہم اہم
یوسف جی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ میرے دوست ہیں۔
آپ فرمائیے۔
شاہد حسین نمبر۲۔ خیر کیا میں آپ کے ملازم سے دو تین
سوالات پوچھ سکتا ہوں۔
یوسف جی۔ بڑی خوشی سے۔
(پکار کر) سلیم! سلیم۔ میاں اِدھر آؤ۔
سلیم۔ (داخل ہوکر) جی سرکار۔
شاہد حسین نمبر۲۔ (سلیم کو بنظرِ غائر دیکھ کر) تم یہاں کب
سے ملازم ہو؟
سلیم۔ ایک مدت ہوگئی ہے۔
شاہد حسین نمبر۲۔ کتنے روز؟ کتنے مہینے؟ کتنے برس؟

سلیم۔ یہ تو میں نہیں جانتا صاحب۔ مگر ہو گئے ہوں گے۔
یہی کوئی دس بارہ برس۔
شاہد حسین نمبر۲۔ مگر چھ برس ہوئے تم الہ آباد میں تھے۔
سلیم (روکر) میں الہ آباد میں؟ صاحب میں نے تو الہ آباد
کی صورت بھی نہیں دیکھی۔
شاہد حسین نمبر۲۔ اب رونے دھونے سے کام نہیں چلیگا
دیکھیں تمہارا جوتا تم نے کہاں سے خریدا ہے۔
سلیم۔ یہیں سے (دائیں پاؤں کا جوتا ان کے ہاتھ میں
دے دیتا ہے۔ اور چپکے سے بائیں پاؤں کا جوتا دائیں
پاؤں پر پہن لیتا ہے)
شاہد حسین نمبر۲۔ ٹھیک (جوتا واپس دیکر) لاؤ تو دوسرا
پاؤں۔ (سلیم جوتے کو لیکر اور دائیں پاؤں میں ڈال کر پھر
اسی کو واپس دے دیتا ہے)
سلیم۔ لیجئے۔
شاہد حسین نمبر۲۔ خوب دونوں دائیں پاؤں۔ (اسے اپنے
ہاتھ پر رکھ کر) ذرا دیکھیں دوسرا پاؤں۔ وہ جراب تمہارے
بائیں پاؤں میں ہے۔
سلیم۔ (بحالتِ مجبوری دوسرا جوتا دے کر) لیجئے۔
شاہد حسین نمبر۲۔ (جوتے کی ایڑی کو ٹھوک بجا کر باہر
کی طرف کھینچتا ہے۔ اس میں سے ہیرا نکال کر خوشی اور
کامیابی کے اظہار سے) لیجئے سیٹھ صاحب یہ ہے آپ کا

ہیرا۔ اب میں آپ کے اس معتبر ملازم کو ذرا بڑے گھر کی ہوا کھلانے کے لئے تکلیف دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

شاہد حسین نمبر ۱۔ (ایک پستول کی نالی شاہد حسین نمبر ۲ کی طرف کرکے) ایسی جلدی کیا ہے؟

شاہد حسین نمبر ۲۔ آپ کا اس حرکت سے مطلب!

شاہد حسین نمبر ۱۔ صرف یہی کہ میں آپ کی چال سمجھ گیا۔ (یوسف جی سے) سیٹھ صاحب یہ شخص بھی آپ کے ملازم کا رازدار ہے۔ اور چور ہے۔ جو ہیرا اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ صرف موم کا بنا ہوا نقلی ہیرا ہے۔ اصلی ہیرا اس وقت اس کی جیب میں ہے۔ (شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہوکر) ہاں ذرا اپنے ہاتھ تو اٹھائیے۔ (وہ ہاتھ اٹھاتا ہے) سیٹھ صاحب اب آپ اس کی جیب سے اپنا ہیرا نکال لیجئے۔

(باہر کے دروازے پر کوئی شخص آواز دیتا ہے)

یوسف جی۔ یہ کون۔

شاہد حسین نمبر ۱۔ ٹھہرئیے۔ یہ بھی شاید انہی کا کوئی ساتھی ہے۔ ان دونوں کو آپ اپنی خوابگاہ میں بند کر دیجئے۔

(سلیم اور شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہوکر) چلئے تھوڑی دیر کے لئے اس کمرے میں آرام فرمائیے۔

(خوابگاہ میں داخل کرکے دروازہ بند کر دیتا ہے)

(یوسف جی سے) اب تھوڑی دیر کے لئے [illegible] یوسف صاحب

مجھے یوسف جی انہیں بھائی بننے کی [illegible] دیجئے آپ میرے وکیل ہیں۔ اور کسی قانونی مشورہ [illegible] لئے اس وقت میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔

(بیرونی دروازہ کھولتا ہے)

آئیے آئیے۔ جناب کا اسم شریف۔

ملاقاتی۔ میرا نام انسپکٹر شاہد حسین ہے۔

(یوسف جی نام سن کر چونک پڑتے ہیں)

آپ وکیل صاحب ذرا مسودہ تیار [illegible]

(شاہد حسین نمبر ۳ سے مخاطب ہوکر)

آئیے اس کمرے میں تشریف لائیے [illegible] تجویز [illegible] بھی ہے۔

(کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی [illegible] کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انسپکٹر شاہد حسین [illegible] آتا ہے)

سب کے سب گرفتار ہوگئے۔ آج کا دن [illegible] چوروں کا ایسا خطرناک جتھا اور ایک ہی موقع [illegible] صرف میری خوش قسمتی ہے۔ آئندہ سے سیٹھ صاحب اپنے ہیروں کو سنبھال کر رکھا کیجئے۔

(شاہد حسین نمبر ۲ اور سلیم چپ چاپ خوابگاہ کا د[illegible] پستول ہاتھ میں لئے داخل ہوتے ہیں)

چوروں کا کچھ اعتبار نہیں۔ [illegible] اس و[illegible]

[illegible]

آپ کی تجوری کی تاک میں ہوں۔ مثلاً اس وقت آپ کو کیا معلوم ہے۔ کہ آپ اس شہر کے تین ہوشیار اور چالاک چوروں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

(یوسف جی گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپکو گھرا ہوا پاتے ہیں)

یوسف جی (بہت پریشانی سے) آپکا ان باتوں سے مطلب؟

شاہد حسین نمبر ا۔ یہی کہ ذرا ہم کو اجازت دیجئے۔ کہ آپ کو اس کرسی کے ساتھ مضبوط باندھ دیں۔ تاکہ آپ کم از کم تھوڑی دیر کے لئے آرام تو کر سکیں (ایک رسّی سے یوسف جی کو کرسی کیساتھ باندھ دیتا ہے) لیجئے سیٹھ صاحب خُدا حافظ۔ اب جب آپ پھر کسی عجیب و غریب ہیرے کو بہت ہی سستے داموں پر خریدینگے تو ہم آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرینگے۔ آداب عرض۔

(پستول جیب میں ڈالکر دروازے تک جاتے ہیں۔ اتنے میں دروازہ کُھلتا ہے۔ اور ایک شخص پستول کی نالی سامنے کئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

کون تُم کون؟

آنیوالا (بڑے اطمینان سے) خفیہ پولیس کا انسپکٹر شاہد حسین۔

تینوں (بہت گھبرا کر) بغیر اطلاع اس طرح اندر آنیسے تمہارا مطلب

انسپکٹر شاہد حسین۔ یہی کہ میں تُم تینوں سے زیادہ ہوشیار ہوں اور وہ شخص جسکو تم کمرے میں بند کر آئے ہو فقط میرا سارجنٹ تھا۔ اور اب میں ذرا تُم سے بے تکلف ہونیکی اجازت چاہتا ہوں ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے۔ دیکھئے۔ اب مُنہ بنانے سے کیا فایدہ شاباش ایسے کیا کہنا !!! (تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے)

یوسف جی (بہت حیرت اور مسرت سے) یعنی اصلی انسپکٹر شاہد حسین !!!

ایڈیٹر

سلمائے سہا

گرچہ ترا خیال ہی جان کا اِک سوال ہے
اِس دِل ہرزہ کار کو آرزوئے وصال ہے

طرزِ جنون نئی نکال اے مری شورشِ طلب
دشت و جبل سے دُور رہ، یہ رہِ پائمال ہے

یہ لبِ شکوہ ہا بدل، یہ دِلِ صد فغاں بلب
آپ اگر سمجھ سکیں، عرض زبانِ حال ہے

خواب و خیال بھی نہ تھیں آج کی تلخ کامیاں
ہائے وہ دِن کہاں گئے خواب بھی اب خیال ہے

اے کہ ترا وجود ہے، رازِ حیاتِ کائنات
مہر سے بے خبر کجا، ذرہ کا بھی خیال ہے

عجزِ بصر تجلّیِ ذات کا ایک آئینہ
شرحِ صفات ہے تری، یہ جو زبان لال ہے

عقل کا اعترافِ نقص، اوج و کمالِ معرفت
کُنہ سے تیری بے خبر دفترِ قیل و قال ہے

دستِ طلب ہُوا ہے شل، دامنِ مدعا کہاں
سلمٰی یہ سعیِ نارسا از رہِ امتثال ہے

خندۂ تقدیر

بہت رات گذر چکی تھی۔ کارقنیز پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ سرمستی سے اُس کی نگاہ کھڑکھڑاتے ہوئے کواڑوں پر پڑی۔ پھر وہ بے خودی کے انداز میں چھت کے شہتیر کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر تک وہ جنوبی ہوا کی وحشیانہ شورانگیزی کو سُنتا رہا۔ جس کے چنگھاڑتے ہوئے جبڑوں کی گرفت میں گویا مکان تھرّا رہا تھا۔ اتنے میں دہکتی ہوئی آگ کے سامنے اُس نے گلاس کو اُٹھایا اور اس کا تبسمِ انبساط ارغوانی شراب میں چھلک گیا۔

عکسِ تبسم کو دیکھ کر وہ بولا "کیا ہی خوبصورت ہے۔ اِس کی چاشنی پر ہزار شیر بینیاں نثار۔ یہ نازنینوں کی شراب ہے۔ اور خاکستر پوش راہبوں کے لائق!"

مَیں نے ناگزیر فخر کے انداز میں جو مجھے اپنی تاک انگور سے لدی ہوئی پہاڑیوں پر ہے۔ کہا "وہی تاکستان جس میں سے تم کل گذرے تھے۔ اس کا یہ بہترین ثمر ہے۔"

[illegible] نا بے مدعا نہ تھا جب مَیں ہنسا اور اس کی [illegible] دے ایں [illegible]

کا بہترین رنگ طبیعت ظاہر نہ ہوتا تھا۔ وہ خود پرستے جو تھا۔ اور یہ کہو۔ کہ خود پرستی اِس کی زندگی تھی یہ خیال کی [illegible] وہ سنجیدہ بن جاتا۔ تو بلند آہنگی اس کے سر نے جا بدیا [illegible] نابود ہو جاتی۔ اور وہ پھیکا۔ بے مزہ انسان رہتا تھا۔ [illegible] اور لوگوں کی طرح نہیں۔ حاشا۔ لیکن جب کارقنیز کا عاشقا[illegible] آفرینی کے بہترین انداز سے موازنہ کیا جائے، تو ......

...... کوئی یہ نہ سمجھے۔ کہ میرا پیارا دوست کارقنیز شرابی تھا۔ ہرگز نہیں ایسی غلطی وہ شاذ ہی کرتا تھا۔ وہ خود شناس تھا۔ اِسے فوراً معلوم ہو جاتا۔ کہ اب مَیں کافی پی چکا ہوں اور اسے تسکین حاصل ہو جاتی۔ وہی تسکین جو عالمِ سنجیدگی کا خاصہ ہے۔

اپنی طبیعت پر دانشورانہ قابو پانے کا اسے [illegible] ملکہ تھا۔ مگر وہ ہسپانوی نژاد تھا [illegible] اقدر سرشار ہے۔ جو بھی نمایاں تھا۔ اِس کا رنگ ذرا تاریک [illegible] لدی ہوئی تھا۔ اِس کے خط و خال میں بربریت کی بد[illegible] سے انعطا[illegible] بھاری اور خمدار بھوویں [illegible] ایک دو[illegible]

میں نے قطع کلام کیا۔ اور وہ کامیاب ہوئے۔

اور خوب کامیاب ہوئے۔"

درد بھری نگاہ سے کارقنیر۔ نے میری طرف دیکھا۔ اور اس کی آواز کوسِ رحلت کی ہم آہنگ تھی۔ "وہ ہار گئے ... کی شکست عظیم الشان تھی۔ ان کی ناکامی بےمثال"

میں نے بیدلی سے جرأت کی اور کہا "لیکن دنیا والوں کا قیاس تو اس کے برعکس ہے۔"

"دنیا تو محض قیاس ہی کرتی ہے۔ عام لوگ ... بظاہر بیں ہوتے ہیں لیکن تمہارے ذہن میں کبھی یہ گمان بھی ... ہے۔ کہ وہ کیوں نقاب پوش راہبہ بن گئی؟"

"کیونکہ اسے فسکے سے محبت نہ تھی۔ اور جب وہ ... گیا . . . . . .

کارقنیر کی طنز آمیز نگاہ نے میرے منہ سے پوری بات نہ نکلنے دی۔ وہ بولا "کیا خوب جواب ہے۔ دنیا والوں نے اس معاملہ کو خوب سمجھا۔ تمہاری طرح وہ بھی زندگی سے ... نکلی۔ مگر اس نے شکست کھائی۔ لیکن جب اس نے درماندگی کا سفید نشان بلند کیا۔ تو اس کا دل عشق ناتمام ... گداز حسرتوں سے مزارِ آرزو بن چکا تھا۔ . . . .

"میں تمہیں اسکی ساری داستان سناؤنگا تمہیں اس پر یقین کرنا چاہئے۔ انہوں نے میری کے لاینحل معمہ پر ... سکوت کیا۔ کیونکہ انہیں محبت سے ... دلوں میں اُس کی انتہا درجہ کی وقعت تھی۔ اور وہ اُسے اپنے دلوں میں ابتدائی گرمجوشی اور بےتابی کے ساتھ سرسبز رکھنے کے بےحد آرزومند تھے۔ اس کی آمد کا انہوں نے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ مگر اس کے وداع ہونے کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ ان کے نزدیک محبت ایک آرزو ہے۔ ایک پُرلطف درد ہے۔ جو ہمیشہ طلبگارِ آسائش ہے۔ مگر حصولِ تمنا اس کے لئے پیامِ موت ہے۔ احیائے محبت ایثار محبت میں ہے۔ اور اس کا انجام قبولیت سمجھے۔ وہ کہتے تھے۔ زندگی کا راز یہ ہے۔ کہ حصولِ تمنا سے نقشِ تمنا محو نہ ہو جائے۔ کھانا اور پھر بھوکے بھی رہنا۔ اس شعبدہ بازی کا انسان اہل نہیں۔ خوانِ یغما پر جی بھر کر کھا لینا۔ اور یہ تمنا کرنا۔ کہ بھوک کی وہی شدت رہے۔ جیسے قحط سالی میں وہ اکثر اس گتھی کو سلجھانے کے لئے بحث کرتے۔ اور انکی آنکھیں اشتیاقِ محبت کی دلاویزی سے لبریز ہوتیں۔ جوشِ محبت میں ان کا ارغوانی خون رخساروں کو گلگوں بنا دیتا۔ نغمہ ان کی آواز میں ترنم کرتا تھا۔ کبھی تو ان کے گلے میں ایک تڑپ بن کر رہ جاتا۔ اور کبھی ناقابلِ بیان نزاکت سے ادا ہوتا۔

. . . . . یہ سب کچھ مجھے کیونکر معلوم ہوا۔ کچھ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور کچھ ایڈل کی ڈائری میں پڑھا۔ ایک جگہ لکھا تھا "وہ نغمۂ آوارہ۔ وہ شعلہ پوش بانسری بجانے والا۔ جیسے تھے ہو۔ تاکہ ان ... میں یا جذبۂ محبت

کی برق صفت چمک میں ایک ساعت سے زیادہ کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اکثر دلباختہ پرستاروں کو اپنے جلوہ سے مسرور کرتا ہے۔ اس کی زبان پر ایسا راگ نہیں ہوتا جو عام فہم ہو۔ یا جشنِ عام کی طرح طرب انگیز ہو لیکن وہ کیف میں بے خود ہوتا ہے۔ اور تمناؤں کی بے صدا فصاحت سے لبریز۔ اسے خانہ زاد بننے سے عار ہے اور اس پر قابو پانا محال، غرضکہ ان کے دل افراطِ محبت سے لبریز تھے۔ اور اس کی تیز دھار میں مداومت پیدا کرنے کے دل و جان سے متمنی۔ . . . .

ہاں وہ دونوں خود شناس تھے۔ یہ نہ سمجھنا کہ محبت کے آستانہ پر وہ محض قیاس دوڑانے والی بے مایہ ہستیاں تھیں۔ وہ پہلے بھی محبت سے آشنا تھے۔ لیکن وصل نے انقطاعِ آرزو کے اہم انجام سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔ مگر وہ سرد دل نہ ہوئے۔ ان میں حیات تازہ کی جدت تھی۔ ان کا خون شفق کی طرح گلگوں تھا جس کی تپش انہیں بیتاب رکھتی تھی۔ وہ جذبات پرست تھے اور تمنائے نشاط ان کی رگ رگ میں تھی۔ انکی علو خیالی میں جذبات کی رنگینی تھی۔ مگر جذبات پر انتہائے اختیار ہوتے ہوئے وہ انحطاطِ شوق سے مامون تھے۔ . . . . .

. . . . وہ اگرچہ نشاط آفرینی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن محض تمنائے نشاط ہی ان کے حصہ میں تھی، خانہ خراب ہو اس تصور کا۔ فلسفیانہ توہمات کے وہ شیدا بن گئے۔ کاشیر کی نازنین ماہین تمہیں یاد ہے؟ اُس نے عمر بھر میں ایک ہی بوسہ کی لذت پائی۔ اس لئے نہیں [illegible] اس کی لذت اس کے لئے مفقود ہو گئی۔ [illegible] سے نفقدانِ انبساط کا خوف اس کا جزو [illegible] یہ وہی 'سیری' کا خوف ہے۔ تقدیر کے خلاف [illegible] ہوئی۔ مگر قمار زندگی کے قدیم اصول کے [illegible] کوئی شرط نہیں ٹھیرائی تھی۔ یہ قوانین مطبوع [illegible] تمناؤں کے داؤ پر مر مٹنے والے قمار خانہ عشق ہی [illegible] اصول کو سیکھتے ہیں۔ . . . .

. . . ہاں ان کے فلسفیانہ توہمات اور [illegible] کا حاصل یہ ہوتا۔ کیوں۔ ایک مرتبہ بھی ہم بوسہ لیں۔ ایک بار اس سے بہرہ اندوز ہونا اگر ہوشمندی ہے۔ تو ضبط [illegible] عین دانائی۔ احیائے محبت یوں ہی ممکن ہے [illegible] مشتاقانِ محبت کے دل آرامگاہِ عشق بن جائیں گے۔ عشق کا [illegible] ہمیشہ درِ دل پر دستک دیا کریگا۔ . . . .

. . . یہ ناپاک خیال شاید ان کی نسبی تقویم کا نتیجہ تھا۔ نسبی عیوب بھی عجب گل کھلاتے ہیں۔ ان کا منتہائے خیال ہسپانوی دل و دماغ کا پرتو تھا۔ اسے کسی [illegible] سرد مہر نازنین سے شبیہ دینا بجا ہوگا۔ [illegible] سے کیونکر کہہ سکتا ہوں۔ صرف اتنا [illegible]

مبالغہ آمیز تمنا سے نشاط پر ان کی شادمانی قربان ہوگئی۔ وہ فسکے کہتا تھا تمہیں اپنے آغوش شوق میں لے لوں۔ اور دل سے پیوست کرلوں۔ مگر پیوست بھی نہیں۔ تمہاری آرزو میں جیوں۔ خونفشانی ہجر سے کشت زار آرزوئے وصل کو سینچتا رہوں۔ وہ کیا کہتی۔ شوق وصل ایک امید ہے جو ہمیشہ تروتازہ اور نو بنو ہو۔ جس کا ابتدائی نکھار کبھی زائل نہ ہو۔"

میں ان کے روحانی احساسات کو قلمبند کرنے کا اہل نہیں۔ میرا طرز بیان ان کے فلسفۂ محبت کے لئے باعث ننگ ہے۔ میں اپنی تنگ بین آنکھوں سے نورافشاں دلوں کے عجائب خانۂ محبت کو مبہوت ہوکر دیکھ رہا ہوں۔

ایک حد تک ان کے قیاسات بھی صحیح تھے۔ تصرف اور سیری موت کے دو آثار ہیں۔ کیا ان کی محبت کے شایاں تھا۔ کہ ایک مرتبہ بوسہ لیں اور ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائیں۔ یا مزاولت ان کی بے مثال تمناؤں کو پائمال کردے۔ مگر وہ دانا تھے۔ ہمیشہ کے لئے کیوں جدا ہوتے۔ محبت کی رفیع ترین بلندی پر نشیمن بنانا ان کا مقصود تھا۔ انہوں نے انگلستان میں شادی کی۔ میں ان کے راز سے بیگانہ رہا۔ ان کی گرمجوشی سرد نہ ہوئی۔ شعلۂ عشق اور روشن ہوتا رہا جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اس کی چمک دمک بڑھتی رہی۔ ہر شخص متعجب تھا۔ ایک زمانہ ان پر رشک کھاتا۔ عورتیں ان کے لاولد ہونے پر ترس کھاتی تھیں۔"

ان کے راز سے بیگانہ۔ میں غور کرتا اور حیران رہ جاتا۔ ان کی محبت کی ناپائداری کا تصور مجھے پس پردۂ خیال ایک بار کھٹکا۔ پھر میں نے غور سے دیکھا۔ تو میں شرمندہ اور ان کی محبت پائدار تھی۔ آخر ان کا راز کیا ہے؟ محبت سے وہ کیونکر توام ہوگئے؟ یہ غول وحشی کیسے ان کا رام ہوگیا۔ میرا تفحص ان کے متعلق بڑھتا گیا۔ وہ دیوانۂ عشق تھے۔ اور ان کا جشن محبت ابدی عشق و محبت کی دلاویزی سے ان کی زندگی معمور تھی۔ اور اسکی شوکت دوبالا۔ وہ بیمار محبت نہ تھے۔ انتہا درجہ کے جذبات پسند اور خود شناس ہوکر وہ تندرست اور صحیح الدماغ تھے۔ بقائے آرزو کے راز کو سربستہ پاکر انہوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

ان کی محبت کے ابدی معجزہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں غور کرتا۔ اور سر دھنتا تھا کہ ایک روز....."

یہاں کارفنبر کی آواز یکایک رک گئی۔ ذرا دیر کے بعد اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ "تمہاری نگاہ سے وہ مشہور نظم "انتظار محبت" گذری ہے؟" میں نے اظہار نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے اِس نظم سے سراغ ملا۔ایک مرتبہ اِن کے دریچہ والی نشستگاہ کے قریب بڑے پیانو کے نزدیک ... تمہیں یاد ہوگا۔ اس کی آواز کیا نازک اور پُرمسرت تھی۔ وہ بطور استہزا مجھے چھیڑتی۔ مَیں اِن کی ملاقات کا نہیں۔ ان کی موسیقی کا شیدائی تھا۔ اور فسکے جب گاتا تو مَیں بقائے رُوح کا قائل ہوجاتا۔ اپنے مربیانہ انداز میں قضا کے جلوداروں کو میں کبھی خاطر میں نہ لاتا۔ اِن کے محبّت افزا نغموں کی تازگی دستبرد ایام سے محفوظ تھی۔ اِن کی محبّت کی پختگی اور اشتیاق کی فراوانی نوجوان عاشقوں کے لئے خواب وخیال۔ اِن کی محبت پر خُدا بھی تحسین کرتا ہوگا۔ فسکے اگر شعلہ آتش تھا تو ایتھل مجسم لطافت۔ اِن کی آواز۔ اِن کی نگاہ غرضکہ اِن کی خامشی میں بھی محبّت کے گنج شائگاں ہوتے محبّت انہیں ایک دوسرے میں جذب کر رہی تھی۔ ایک شمع عشق تھا۔ تو دوسرا پروانہ۔ لیکن آتش شوق دونوں کو ہمیشہ پُر گداز رکھتی۔"

"اصل مطلب سے میں بھٹک گیا ہوں۔ ایک روز میں نے دریچہ والی نشستگاہ میں ایک بیاض اشعار دیکھی۔ اسے مَیں نے اُٹھایا۔ تو از خود کھل گئی اور شاقانِ محبّت کا راز افشا ہوگیا۔ کھُلے ہوئے صفحہ پر وہی نظم "انتظارِ محبت" تھی۔ صفحہ کثرتِ مطالعہ سے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اور متجسس اُنگلیوں کے آثار بے تابی [illegible] تھے۔ درمیان میں اُنگلی رکھکر مَیں نے کتاب [illegible] کر دیا۔ اور بہت دیر تک خاموش بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اِن اشعار نے میرے سامنے ایک خیال [illegible] کر دیا۔ جس کی جھلک مجھ پر بجلی کی طرح پڑی اور مجھے سوختہ سامان بنا گئی۔ آہ! وہ محبّت پر تصرف پالینا چاہتے تھے۔ یہ آزاد ہستی کیونکر پا بہ زنجیر ہستی تھی اِس کا قیام تجدید حیات کے بغیر ناممکن تھا۔

بار بار اشعار کو پڑھنے سے مَیں بے [illegible] ہوگیا۔ پھر مَیں نے ایک مجنونانہ قہقہہ لگایا۔ [illegible] خیالِ متشکل یا پیکرِ خیال میں اِن کی بے لو[illegible] صاف صاف نظر آنے لگیں۔ کیا وہ نادان تھے اُنہوں نے شعلہ جانسوز سے دِل لگی کی۔ اور خواب ہستی میں تیغ براں کو رفیقِ بستر بنایا۔ اُنہوں نے تقدیر [illegible] فریب کیا۔ اور رُوحِ حیات کو دونوں ہاتھوں [illegible] چاہا۔ بساطِ ہستی پر وہ ایک نئی چال کے موجد تھے اور امید کامرانی پر چل رہے تھے۔ مَیں چلایا [illegible] ہوجاؤ۔ تقدیر کا زبردست پنجہ تمہیں اپنی گرفت [illegible] لے رہا ہے۔ اور تمہاری چال ہی تمہاری [illegible] دیگی۔ کامرانی کی امید دِل سے نکال دو۔

مَیں نے اُن سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ چُپ چاپ ر[illegible]

سنبھل جائینگے۔ اور جو مسرت و شادمانی ان کی قسمت ہو چکی ہے۔ اس پر قانع ہو کر افراط لا حاصل کے لئے ہاتھ نہ پھیلائینگے۔ زمانہ گذرتا گیا۔ اور مَیں منتظر رہا۔ انکی محبّت انحطاط کی دستبرد سے مامون رہی۔ وہ بحرِ محبّت کو ہم آغوش ہو کر عبور کرتے رہے۔ اور کبھی اس کے شفاف پانی کو مکدر نہ کیا۔ نفس کشی کی سنگلاخ پر اُنہوں نے محبّت کے سیلِ رواں کو اور تیزی سے بہایا۔ اور خوب تیزی سے ظاہری کامیابی کے منظر نے مجھے شک میں ڈالا۔ کہ تقدیر پر کیا غفلت طاری ہوگئی۔ کیا کارکنانِ قضا صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اس مرد اور عورت نے کیا سحرکاری کی۔ جس سے جسدِ خاکی شرمندہ اور حیاتِ عنصری بے مایہ ثابت ہوئی۔ وہ محبّت کی آتشِ جانسوز سے مشغول لعب بھی رہے اور رستگار بھی۔ وہ خود قضا کے دست و بازو بن گئے۔ اور امتیاز حق و باطل کرتے ہوئے دونوں پر عامل۔ اس عجائب روزگار سے میری بصیرت خیرہ نہ ہو جاتی۔ تو مَیں اس فاش غلطی کا مرتکب نہ ہوتا۔ مَیں نادانی کے جوش میں اپنی دانائی پر نازاں رہا۔ اور تقدیر کی کوتاہی پر ہنسا کیا۔ بالیدگیٔ فہم کے زعم میں پھر مَیں غلطی کا مرتکب ہوا۔ وہ دستِ قضا نہ تھے۔ وہ محض انسان تھے۔ نرم مٹی سے اِن کا کالبدِ خاکی بنا تھا۔ اور آہ و شیون اِن کا

کام۔ وہ تمنّاؤں سے زخمی تھے۔ اور کمزوریوں سے داغدار۔

سلسلۂ گفتگو قطع کر کے ایک نیا سگرٹ سلگانے کے لئے کارقنیر رُک گیا۔ اور اُس نے ایک دلخراش قہقہہ لگایا جو طوفان کے شور و غل سے بلند ہو کر ابلیس کے قہقہہ کی طرح سُنائی دیا۔

طلبِ عفو کی خاطر کارقنیر نے کہا۔ مَیں بدکردار انسان ہوں۔ مگر جس خاک سے وہ بنے تھے اس کی ماہیت سے بیگانہ تھے۔ لیکن اِن کی بے مثال علو ہمتی کا مَیں قائل ہوں۔ ایسا قمارِ عشق دُنیا نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ دیکھے گی۔ عشاق کا انتہائی انبساط اِن کے روکش نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے محبت کو بوس و کنار سے آلودہ نہ کیا۔ بلکہ ضبط و پرہیز سے اِسے زندہ رکھا۔ یہانتک کہ ضبط کی پیہم کشاکش نے انہیں بے خود بنا دیا۔ امتداد ماہ و سال سے یہ کیف اور بڑھتا گیا۔ جانگداز محبّت کی سینہ فگار کاوشوں اور حسرتوں نے اِن کے دلِ عشق و عاشقی کے گنجہائے گرانمایہ بنا دئے۔

ایک روز کارکنانِ قضا خواب غفلت سے جاگے۔ اور اِن کی دیوانہ وار کوششوں پر مُسکرائے۔ پھر ایک روز فلک نے ایتھل کی محبّت بھری آنکھوں کی طرف دیکھا تو کچھ غائب سا تھا۔ عشقِ رعنا وہاں سے کوچ کر گیا تھا۔ رات کی خاموشی میں وہ اِن کے بسترِ ہجر سے اُڑ گیا۔

وہی آنکھیں جو چشمۂ نور تھیں۔ اب مزارِ آرزو بن گئیں۔ عشق بے تاب نے خیرباد بھی نہ کہی اور چلدیا۔ وہ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہے۔ کہ محبت کا غیر محسوس انجام آپہنچا۔ وہ فسانۂ عشق مٹ گیا۔ عشق کی گرمیاں سرد ہوگئیں۔ نہ وہ بے تابی رہی۔ نہ وہ بے قراری۔ وہ راگ خاموش ہوگیا۔ وہ رنگ اڑگیا۔ زندگی ایک خشک خارزار رہ گئی۔ جس میں تازگی عنقا تھی۔ اور شادابی خواب وخیال اور ان کا جینا موت سے بدتر جب فسکے نے اینجل کی محبت بھری آنکھوں میں مزارِ آرزو دیکھا۔ تو اس کا نازک دِل تاب تصادم نہ لاکر یکایک حرکت کرنے سے رُک گیا۔ یہ دستِ غیب کی شفقت تھی۔ موت ہی میں اس کی نجات تھی۔

تم کہتے تھے۔ کہ وہ کامیاب رہے۔ ان کی کامیابی تمہاری کامیابی کی مثال ہے" یہ کہکر اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ آگ کی روشنی میں وہ مجسم شیطان نظر آرہا تھا۔

مَیں نے غصّہ میں جھنجھلا کر پوچھا۔ "اور تم اپنے فہمِ رسا کے زعم میں کامیاب بنے بیٹھے ہو"

اس نے آہستہ سے سرہلایا۔ اور کہا۔ "کامیابی تو ایک خیال ہے۔ کبھی کبھی اس کا گمان ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ خندۂ تقدیر کے سوا اور کچھ نہیں"!

محمد شاہ

عزیز

وُہ رُخ سے یوں نقاب اُٹھانے؟ محال تھا
جذبۂ غضب کا دعوئے تابِ جمال تھا

کیوں پُوچھتے ہیں آپ یہ کس کا غبار ہے
کیا اُس گلی میں اور کوئی پائمال تھا

تنہائیِ فراق کا کس سے گلہ کروں
اَب درد بھی نہیں ہے جو بالاتصال تھا

تاثیرِ عرضِ حالِ الم ہمنفس نہ پُوچھ
وُہ سُن کے ہنس رہے تھے، مجھے انفعال تھا

مایوسیوں میں خوب گذرتی ہے اب کہاں
وہ اضطرابِ شوق کہ جینا وبال تھا

کیا طعنِ زیست، میرے نہ مرنے کو دیکھتے
اِس پر، کہ مجھ کو زہر بھی کھانا حلال تھا

ہیں تلخ کامیاں بھی "باندازۂ طلب"
ناکامِ دید ہوں، کہ جنونِ وصال تھا

سُنتے تو تھے عزیز کی دیوانگی کا حال
اِس مرگِ ناگہاں کا مگر کب خیال تھا

سُہا

کسقدر ستمگر ہیں، اور جفا نہیں کرتے — غمزہ بھی تغافل ہیں، وہ روا نہیں کرتے

رہ گئے ہم آخر کو، سادگی امیدوں کی! — اسقدر بھی اے ہمت، حوصلہ نہیں کرتے

شرحِ ماجرائے دل کیجئے کہاں جا کر — اہلِ بزم تو کچھ بھی اعتنا نہیں کرتے

کوئی تم کو کیا جانے، اور ہاں بظاہر تم — ناسزا نہیں کہتے، ناروا نہیں کرتے

عشق میں عزیزوں کی چارہ سازیاں معلوم — اب دوا نہیں ہوتی۔ اب دعا نہیں کرتے

مَیں غریب کیا کہتا تم کو آرزو دشمن — ورنہ تم جو کرتے ہو، آشنا نہیں کرتے

کیا اُنہیں سے کہدو گے مدعا سہا اپنا

وہ جو مسکراتے ہیں اور سنا نہیں کرتے

اظہر

میرے دل میں ہے وُہی جو کچھ دلِ ہمدم میں ہے — یعنی لطفِ باہمی، بس اُلفتِ باہم میں ہے

لطف اوروں کے لئے نظارۂ شبنم میں ہے — یہ بھی اک پہلو خوشی کا اشکہائے غم میں ہے

اب زمیں پر بھی قدم رکھتا نہیں اُف رے شباب — وُہ ستمگر آج کل اک اور ہی عالم میں ہے

بے مروّت بیوفا کس طرح سے کہدوں اُسے — دیکھتا ہوں وہ ستمگر غیر کے ماتم میں ہے

جس کو سب کہتے ہیں دل گنجِ گرانمایہ ہے وُہ — خود شناسی ہو تو، تُم دیکھو کہ کیا کچھ ہم میں ہے

انتہا اُس کی مسرّت، انتہا تیری الم — اے خوشی کیا جانے تُو کیا لطف میرے غم میں ہے

موت کہتے ہیں جسے وہ کیا ہے بس صبر و سکون — زندگی کا راز پنہاں شورشِ پیہم میں ہے

دل لگی ہے چھیڑ ہے، گو وصل کی صورت نہ ہو

واہ کیا لطفِ مسلسل، شکوۂ پیہم میں ہے

تیرتھ یاترا

(۱)

شانتی کے کئی لڑکے پیدا ہوئے لیکن سب کے سب ایام طفلی ہی میں مر گئے۔ آخری لڑکا ہیمراج اُس کی آرزوؤں کا مرکز تھا۔ اُس کا مُنہ دیکھ کر وہ پہلے بیٹوں کی موت کا غم بھول جاتی تھی۔ ہرچند کہ ہیمراج کی شکل و صورت عام دیہاتی بچوں کے مانند تھی۔ تاہم شانتی اُسے سب سے خوبصورت سمجھتی تھی۔ حبِ مادری نے آنکھوں کو دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ شانتی کو ہیم کا اسقدر خیال تھا۔ کہ اُسے ہر دم سینہ سے لگائے رہتی تھی۔ گویا وہ ایک چراغ تھا۔ جسے بُجھانے کے لئے بادِ سموم کے تباہی آور جھونکے پے درپے حملے کر رہے تھے۔ اور وہ اُسے چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ تاکہ کہیں لوگوں کی نظرِ بد سے اُسے گزند نہ پُہنچ جائے۔ دیہاتیوں کے بال بچّے کھیتوں میں کھیلتے پھرتے تھے لیکن شانتی ہیم کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی تھی۔ اگر کبھی نظر بچا کر نکل جاتا۔ تو دیوانہ وار اُس کی تلاش میں مصروف ہو جاتی۔ گاؤں کی عورتیں کہتیں۔ "آخر ہمارے بھی تو بچّے ہیں۔ تو اسقدر دیوانی کیوں بنی رہتی ہے" شانتی یہ سُنکر آنکھوں میں آنسو بھر لاتی اور بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیتی "کیا کہوں؟ میرا دل ڈرتا رہتا ہے۔" روتے وقت اُسے مرے ہوئے بچّے یاد آجاتے تھے۔

لیکن اتنی احتیاطوں کے باوجود ہیمراج نظرِ بد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ صبح کا وقت تھا۔ شانتی گائے کا دودھ دوہ آئی تھی۔ کہ ہیمراج بیدار ہُوا۔ اور مُنہ بنا کر بولا۔ "ماں!" آواز میں لجاجت تھی۔ شانتی کے ہاتھ سے برتن گر گیا۔ دوڑتی ہوئی اُس کے پاس پُہنچی۔ اور پیار سے بولی "ہیم! کیوں؟ کیا ہے؟"

ہیم کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ رُک رُک کر بولا۔ "سر میں درد ہوتا ہے۔"

بات معمولی تھی۔ لیکن مامتا کی ماری ماں کا دل سہم گیا۔ یہی دن تھے، یہی موسم۔ جب اُس کا پہلا لڑکا مرا تھا وہ بھی اسی طرح بیمار ہُوا تھا۔ اُس وقت بھی شانتی نے معالجہ میں دن رات ایک کر دیا تھا لیکن جو ہونا ہوتا ہے اُسے کون روک سکتا ہے۔ بادِ خزاں کے جھونکوں نے

اُس کی آرزوؤں کا لہلہاتا ہُوا چمن برباد کر دیا۔ شانتی اُس صدمہ جانکاہ سے نیم مُردہ ہو گئی تھی۔ وہی واقعات اِس وقت اُس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ زخمِ دل ہرے ہو گئے۔ کیا اب پھر وہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شانتی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جانے لگی۔ اُس کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے کوئی طاقت اُس کی گود سے ننھے ہیم کو چھیننے پر مُصر ہے۔ گاؤں میں حکیم درگاداس کا دم غنیمت تھا۔ لوگ اُسے فرشتۂ رحمت سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں شفا تھی۔ دواؤں میں تاثیر۔ گرد و نواح میں اُن کی قابلیّت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شانتی دوڑی ہُوئی اُن کے پاس پہنچی۔ اضطراب نے پاؤں میں پر لگا دیئے تھے۔ حکیم صاحب بیٹھے ایک پُرانا اخبار پڑھ رہے تھے۔ شانتی کو دیکھ کر اُنھوں نے اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور آنکھوں سے چشمہ اُتار کر بولے "کیوں؟ بیٹی! کیا ہے"

حکیم صاحب اُس گاؤں کے رہنے والے نہ تھے۔ ساتھ ہی عمر بھی کافی تھی۔ اِس لئے گاؤں کی بہو بیٹیاں اُن سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ شانتی نے پریشانی کے لب و لہجہ میں جواب دیا۔ "ہیم بیمار ہے"

حکیم صاحب نے قدرے متفکر ہو کر پوچھا "کب سے"

"آج ہی سے۔ کہتا ہے۔ سر میں درد ہے"

"بخار تو نہیں ہے"

"معلوم تو نہیں ہوتا۔ مگر شاید ہو۔ آپ چلکر دیکھ لیتے۔ تو اطمینان ہو جاتا"

حکیم صاحب کی مُراد پُوری ہُوئی۔ اُنھوں نے جلدی سے کپڑے پہنے۔ اور شانتی کے ساتھ روانہ ہُوئے۔ ہیم بخار میں بے ہوش پڑا تھا۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا۔ کوئی ہرج نہیں۔ دوائی دیتا ہوں بخار اُتر جائیگا"

شانتی کے ڈوبتے ہُوئے دِل کو سہارا مل گیا۔ اُس نے دوپٹے کے آنچل سے اٹھنی کھولی۔ اور حکیم صاحب کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حکیم صاحب نے زبان سے نہیں نہیں کہا۔ مگر ہاتھوں سے جھوٹ کی تائید نہ ہوئی۔

(۲)

کئی دن گذر گئے، ہیم کا بخار کم نہ ہُوا۔ حکیم صاحب نے کئی دوائیں تبدیل کیں۔ لیکن سب بے اثر ثابت ہوئیں۔ شانتی کا اضطراب بڑھنے لگا۔ اُسے نہ کھانے کا خیال تھا نہ پینے کا۔ گائے اُس نے بڑے شوق سے خریدی تھی۔ لیکن اب اُدھر بھی توجہ نہ تھی۔ اس کے چارے وغیرہ کا کام ایک پڑوسی کے سپرد کر دیا گیا۔ چھت پر گھاس اُگ آئی۔ صحن میں مٹی اُڑنے لگی۔ کسی اور موقعہ پر یہ باتیں شانتی کے دل کو زیر و زبر کر دینے کے لئے کافی تھیں

لیکن اِس وقت اُسے اِن باتوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ ساری ساری رات ہیم کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ ہر روز امید اُس کے کانوں میں کہتی۔ آج بخار اُتر جائیگا لیکن بخار نہ اُترتا۔

دسویں دن حکیم سے پوچھا۔ "بخار اُترتا کیوں نہیں؟"

حکیم صاحب نے ایک خاص انداز سے جو محض حکیموں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شانتی کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "میعادی بخار ہے! اپنی میعاد پوری کر کے اُتریگا۔"

"مگر کب تک؟"

"اکیسویں روز اُتر جائیگا۔ اِس سے پہلے نہ اُتریگا۔"

"آج گیارہ روز ہو گئے ہیں۔"

"تو دس دن اور باقی ہیں۔"

شانتی کے دل میں شبہ پیدا ہُوا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "کوئی خطرہ تو نہیں۔"

حکیم صاحب نے چند لمحہ سکوت کیا۔ اور پھر کہا۔ "دیکھو بخار خراب قسم کا ہے۔ اِس لئے ہو سکے تو ہیم کے باپ کو بھی بُلوا لو۔"

شانتی ڈر گئی۔ اُسے حکیم صاحب کی باتوں سے یقین ہو چلا تھا۔ کہ ہیم ایک آدھ دن میں تندرست ہو جائیگا میعادی بخار کا ذکر سنکر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اِس وقت تک اُس نے اپنے خاوند کو بُلانے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ مگر اب اُس کے حوصلے پست ہو گئے۔ اُس کا خاوند رام لال سچدیو ملتان میں ملازم تھا۔ اُسے کارڈ لکھا گیا۔ وہ چوتھے دن پہنچ گیا۔ ہیم نے باپ کی آمد پر بہت کچھ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن مُنہ سے کچھ بول نہ سکا۔ نقاہت نے قوتِ گفتار سلب کر لی تھی۔ علاج پوری احتیاط سے ہونے لگا۔ یہانتک کہ دس دن اور گذر گئے۔ اب آخری دن سر پر تھا۔ ہیم کا بدن ابھی تک آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ کیا بُخار یکایک اُترے گا؟

حکیم صاحب نے نبض دیکھکر کہا۔ آج رات زیادہ احتیاط چاہیئے۔ بُخار کا یکایک اُترنا خطرے سے خالی نہیں۔

(۳)

شانتی اور رام لال دونوں سناٹے میں آگئے۔ اور بیٹے کی طرف پُرمحبت نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اُن کے چہرے حسرت کی تصویر بن گئے۔ رام لال دوائیں لئے ہوئے اُس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ مگر شانتی کا دل پارے کی مانند بے قرار تھا۔ اُس نے شام کے وقت تھال میں گھی کے دیئے جلائے اور مندر کی طرف روانہ ہوئی۔ اِس وقت اُسے اُمید اپنے زندگی بخش تصورات کے ساتھ رقص کرتی ہوئی دِکھائی دی۔ شانتی اِک جوش کی حالت میں مندر پہنچی۔ اور دیوی کے سامنے

سر بسجود ہو کر دیر تک روتی رہی۔ جب تھک کر اُس نے سر اُٹھایا۔ تو اُس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے طوفان کے بعد سمندر ساکن ہو جاتا ہے۔ کوئی غیبی آواز اُس کے کان میں کہہ رہی تھی۔ کہ تم نے اشک باری سے دیوی کے سنگین دل کو رام کر لیا ہے۔ مگر اُس نے اتنے پر ہی قناعت نہیں کی۔ جہر مادری نے وسوسوں کو زیادہ ہولناک بنا دیا تھا۔ شانتی نے دیوی کی آرتی کی پھول چڑھائے۔ مندر کے گرد طواف کیا۔ اور لجاجت کے ساتھ لرزتی ہوئی آواز میں منت مانی۔ کہ نسیم اچھا ہو جائیگا تو تیرتھ کرونگی۔

شانتی کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ نسیم خطرے سے محفوظ ہے۔ واپس لوٹی۔ تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اس وقت اس کے دل میں شادمانی کی لہریں آرہی تھیں۔ گھر پہنچی تو شوہر نے کہا۔ "مبارک ہو۔ تمہاری محنتیں بارور ہونے کو ہیں"۔

شانتی کے چہرے پر مسرت تھی۔ لبوں پر تبسم۔ وہ خوشی کے جوش میں بولی۔ "نسیم کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے تیرتھ یاترا کی منت مانی ہے"۔

رام لال نے تیرتھ یاترا کے اخراجات کا اندازہ کیا تو دل بیٹھ گیا۔ لیکن بیٹے کی محبت نے اس خیال کو زیادہ دیر قائم نہ رہنے دیا۔ وہ کہنے لگا۔ "بہت اچھا کیا" روپیہ کا کیا ہے۔ آتا ہے، چلا جاتا ہے۔ پرمیشور نے ایک لال دیا ہے۔ وہ سلامت رہے"۔

شانتی نے خاوند کو سُلا دیا اور خود ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ اِس وقت اُس کے دل پر جانی سرور چھایا ہوا تھا۔ صبح کو نسیم کا بخار اُتر چکا تھا ... شانتی کے چہرے سے بشاشت ٹپک رہی تھی۔

حکیم صاحب نے آکر دیکھا۔ تو چہرے پر رونق سی آگئی۔ ایک خاص انداز سے بولے "اب کوئی اندیشہ نہیں"۔ لالہ رام لال نے نسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا سے کیا ہو گیا ہے"؟

حکیم صاحب نے شانتی کی طرف نگاہِ تحسین سے دیکھا۔ اور رام لال سے مخاطب ہو کر بولے۔ "یہ سب اِس کی محنتوں کا نتیجہ ہے"۔

رام لال بولا۔ "دیوی ماتا کی مہربانی ہے۔ یا آپ کی دواؤں کی تاثیر"۔

پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہُوا۔ "مَیں تمہیں دوسری ساوتری سمجھتا ہوں۔ اُس نے مرے ہوئے شوہر کو زندہ کرا لیا تھا۔ تم نے مرتے ہوئے بیٹے کو موت کے مُنہ سے چھین لیا ہے۔ اگر تم دن رات ایک نہ کر دیتیں تو نسیم کا بچنا ناممکن تھا"۔

چند دن کے بعد رام لال ملازمت پر واپس چلا گیا۔

(۴)

تین ماہ کے بعد شانتی تیر تھ یاترا کے لئے تیار ہُوئی۔ اب اُس کے چہرے پر پھر وہی مسرت تھی آنکھوں میں پھر وہی رونق۔ ہیم صحن میں اس طرح چہکتا پھرتا تھا جس طرح چمنِ دلفزا میں بُلبل۔ شانتی اُسے دیکھتی، تو پھُولی نہ سماتی تھی۔ روانگی سے ایک رات پہلے اُس کے آنگن میں سارا گاؤں جمع تھا۔ جھانجیں اور ڈھولک بج رہی تھیں۔ جن کے شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں کچوریاں تلی جا رہی تھیں، کہیں حلوا تیار ہو رہا تھا۔ شانتی ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آجا رہی تھی۔ گویا اُس کے ہاں جشن شادی تھا۔ ایک طرف دو چار بے فکرے سادھو بیٹھے چرس کا دم لگا رہے تھے۔ اور گاؤں کی ہوا کو صاف کر رہے تھے۔ اُن کی طرف گاؤں کے لوگ اِس طرح دیکھتے تھے۔ جس طرح زمیندار تحصیلدار کی طرف دیکھتے ہیں نگاہوں میں جذبۂ احترام کی بجائے جذبۂ خوف کا عنصر زیادہ تھا۔ شانتی سے کوئی میدہ مانگتا تھا، کوئی گھی، کوئی اور وقت ہوتا۔ تو شانتی گھبرا جاتی۔ لیکن اس وقت اِس کو کوئی فکر نہ تھی۔ سوچتی تھی، کیسی خوش قسمتی ہے۔ جو یہ دِن دیکھنا نصیب ہُوا۔

لیکن سارا گاؤں خوش ہو، یہ بات نہ تھی۔ اِن خوش و خرم عورتوں کے مجمع میں ایک بوڑھی عورت بیحد رنجیدہ بھی تھی۔ وہ شانتی کی پڑوسن براہمنی ہردئی تھی۔ انتہائے رنج کے باعث اس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اگر شہر ہوتا۔ تو وہ اِس رت جگے میں ہرگز شامل نہ ہوتی۔ لیکن گاؤں کا معاملہ تھا۔ وہاں اِس حرکت سے اُنگلیاں اُٹھنے لگتیں۔

اسی طرح رات کے چار بج گئے۔ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے۔ شانتی نے سب کو رُخصت کیا۔ اور تیاریوں میں مصروف ہوئی۔ ایک ٹین کے ٹرنک میں ضروری کپڑے رکھے۔ ایک بستر تیار کیا۔ گلے میں کلاوہ پہنا۔ پیشانی پر ٹیکا لگایا۔ گائے پڑوسن کے سپرد کی اور اُسے بار بار کہا۔ کہ اِس کا پُورا پُورا خیال رکھنا۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن میرا دل گائے میں رہیگا۔ معاً کسی کے سسکی بھرنے کی آواز سُنائی دی۔ شانتی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ اِس وقت سارا گاؤں خوابِ غفلت میں غافل پڑا تھا۔ شانتی کو تعجب ہُوا۔ کہ یہ سسکی بھرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ وہ آنگن میں کھڑی ہو گئی اور ہمہ تن گوش ہو کر سُننے لگی۔ سسکی کی آواز پھر سُنائی دی۔

شانتی چھت پر چڑھ گئی۔ اور پڑوسن کے صحن کی طرف جھک کر بآوازِ بلند بولی "ماں ہردو!"

چند لمحہ تک خاموشی کا عالم طاری رہا۔ اس کے بعد ہرو نے اپنی چارپائی پر حرکت کی۔ اور جواب دیا۔ "کون؟ شانتی"

اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

شانتی تیزی سے نیچے اُتر گئی۔ اور براہمنی کے پاس پہنچکر بولی "ماں! کیا بات ہے؟"

ہرو درحقیقت رو رہی تھی۔ مگر اپنا رنج شانتی پر ظاہر کرتے ہوئے۔ اُس کی نسوانی غیرت کو صدمہ پہنچا تھا۔ اِس لئے بظاہر مطمئن لہجہ میں جواب دیا "کچھ نہیں"

"رو کیوں رہی ہو؟"

ہرو کے رُکے ہوئے آنسو اُمنڈنے لگے۔ اِس غم نصیب دل کو ہمدردی بہانہ ہو گئی۔ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔

شانتی نے پھر پوچھا "ماں! کیا بات ہے مجھ سے کہو۔"

ہرو نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ اِس وقت حقیقت حال بتلاؤں یا نہ بتلاؤں۔ صبح کی روشنی ظاہر ہو چلی تھی۔ شانتی روانگی کے لئے بیتاب تھی لیکن ہرو کو کیا رنج ہے۔ یہ دریافت کئے بغیر روانہ ہو جانا اُسے گوارا نہ تھا۔ اُس نے تیسری دفعہ پھر پوچھا "ماں! بتاؤ بھی تمہیں کیا تکلیف ہے"

ہرو نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ کیا تم اُسے رفع کر دو گی"

"اگر ہو سکا تو کر دونگی"

"یہ ناممکن ہے"

"مگر کہہ دینے میں کیا حرج ہے"

ہرو کچھ دیر خاموش رہی۔ اور پھر آہستہ سے بولی۔

"بیٹی کا غم کھائے جاتا ہے"

"وہ کیوں؟ اُس کے بیاہ کا خرچ اُٹھانا تو تمہارے جیٹھ نے منظور کر لیا ہے"

"ایسی قسمت ہوتی تو رونا کاہے کا تھا"

"شانتی نے بیچین ہو کر پوچھا" کیا یہ غلط ہے"؟

"بالکل غلط بھی نہیں ہے۔ اُس نے دو سو روپے کا زیور بنوا دیا ہے۔ لیکن برات کے لئے کوئی انتظام نہیں۔ اب حیران ہوں۔ کہ کیا کروں۔ اور کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں؟ میری تو نیند بھی حرام ہو گئی ہے"

شانتی نے قدرے توقف کر کے جواب دیا "کیا گاؤں کے لوگ ملکر ایک بیوہ براہمنی کی بیٹی کا بیاہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم اسقدر فکر کیوں کر رہی ہو؟"

ہرو کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ وہ غریب تھی۔ لیکن خودداری کی دولت سے اس کا دل مالا مال تھا۔ شانتی کی تجویز سے اُسے سخت صدمہ پہنچا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹی! یہ بے عزتی برداشت نہ ہو گی"

"تو کیا کرو گی؟ لڑکی کو کنوارا رکھنا منظور ہے؟"

"اگر بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ تو میں کیا کر سکتی ہوں کہیں نکل جاؤنگی"

شانتی براہمنی کی خانہ ویرانی کے خیال سے لرز گئی۔ اُسے یقین ہوگیا۔ کہ اگر یہ ہُوا۔ تو ایشور کا غضب گاؤں بھر کو جلا کر راکھ کر دیگا۔ شانتی پر ایک عالم طاری ہوگیا۔ وہی عالم جس کے زیر اثر آدمی بیخود(؟) ہو جاتا ہے۔ اور اُسے آگے پیچھے کا خیال نہیں رہتا وہی حالت جس میں خاک نشین گنہگار عرش کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور دوسروں کی خاطر آگ کے شعلوں میں کود پڑتے ہیں۔ شانتی نے جوش میں آکر کہا۔ فکر نہ کرو۔ تمہاری مشکل آسان ہو جائیگی"

ہرو نے وہ کچھ سُنا، جس کی اُسے توقع نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شکر گذاری کے آنسو بہ نکلے۔

شانتی تیرتھوں پر جانے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی۔ سوچتی تھی، ہردوار۔ متھرا۔ برندابن۔ بنارس کے عالیشان مندروں کو دیکھکر طبیعت شگفتہ ہو جائیگی۔ لیکن جو خوشی اِسے اِس وقت حاصل ہوئی۔ وہ اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ دوڑتی ہُوئی اپنے گھر گئی۔ اور بکس سے دو سو روپے نکالکر ہرو کے سامنے رکھ دیئے۔ یہ روپے جمع کرتے وقت وہ خوش ہوئی تھی۔ دیتے وقت اس سے بھی زیادہ خوش ہوئی۔

(۵)

شانتی کے تیرتھ یاترا کا خیال ملتوی کر دینے پر گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ لوگ چھپ کر کہتے کہ شانتی نے بہت بُرا کیا ہے۔ دیوی کا غصّہ اُسے تباہ کر دیگا۔ عورتیں طنزیہ انداز میں کہتیں "کس حوصلہ سے رتجگا کیا تھا۔ اب گھر میں بیٹھ گئی۔ اگر نہیں جانا تھا، تو ظاہرداری کی کیا ضرورت تھی" بعض کہتیں "دیوی دیوتاؤں کے ساتھ یہ مذاق اچھا نہیں۔ لے دے کے ایک بچّہ ہے۔ اُسکی خیر منائے" جو بوڑھی تھیں وہ مالا کے منکے ہلاتے ہوئے بولیں "کلجگ کا زمانہ ہے۔ جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ ایسا آج تک نہ سُنا تھا"

لیکن حقیقت حال کی کسی کو خبر نہ تھی۔

آہستہ آہستہ یہ باتیں شانتی کے کانوں تک جا پہنچیں۔ اوّل اوّل اُس نے پروا نہ کی۔ مگر جب یہی تذکرہ ہر شخص کے لبوں پر پایا تو اس کی طبیعت بھی ڈانواںڈول ہوئی۔ کبھی کہتی "میں نے بُرا کیا کیا ہے۔ ایک غریب بیوہ براہمنی کی بیٹی کے بیاہ میں امداد دینا کیا دیوی دیوتاؤں کو ناراض کر دیگا؟ ...... اور میں نے تیرتھ یاترا کا خیال کوئی ترک تو کیا نہیں ہے۔ کچھ دن ٹھیر کر چلی جاؤنگی۔ خاوند کو لکھ ہی دیا ہے۔ یقیناً وہ

روپے کا بندوبست جلد ہی کر دینگے۔ اِس پر دیوتا خفا کیوں ہونے لگے ؟ لیکن دوسرا خیال آتا۔ مَیں نے واقعی غلطی کی۔ دیوی دیوتا کا حق کسی انسان کو دینا گناہ نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اِس کا کلیجہ دہل جاتا۔ دُنیا بُرائیوں پر پچھتاتی ہے۔ شانتی نیکی کرکے پچھتا رہی تھی۔ دن کا آرام جاتا رہا۔ رات کی نیند رُخصت ہُوئی۔ اُسے وہم ہو گیا۔ کہ اب ہیم کی خیریت نہیں ہے۔ اُسے کھیلتے دیکھتی۔ تو جگر پر کٹاریں چل جاتی تھیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ گاؤں میں چہل پہل دکھائی دینے لگی۔ نو عمر لڑکیوں کے ہاتھ میں حنہ رچی ہُوئی تھی۔ ہیرو کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اُسکی چھت پر رات کے بارہ بجے تک ڈھولک بجتی رہتی۔ اور لڑکیوں کے دیہاتی گیتوں سے سارا گاؤں گونجتا رہتا۔ ایک دن وہ تھا۔ جب شانتی خوش تھی۔ اور ہیرو غمگین۔ آج ہیرو کے صحن میں خوشی کھیلتی تھی۔ مگر شانتی کے گھر پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات نے واقعات کو تبدیل کر دیا تھا۔

رات کا وقت تھا مندر میں گھنٹے بج رہے تھے شانتی نے آرتی کا تھال اُٹھایا۔ اور پوجا کے لئے روانہ ہُوئی۔ مگر دروازے پر پہنچ کر قدم رُک گئے۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا۔ کہ دیوی ماتا اُسے سرزنش کرنے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ شانتی کا کلیجہ کانپنے لگا۔ وہ ہمت ہار کر دروازے پر بیٹھ گئی۔ اور رونے لگی جس طرح ایک مجرم عدالت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے گھبرا جاتا ہے۔

یکایک اُس نے کسی کی پرارتھنا کی آواز سُنی۔ شانتی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اِس دُعا کا تعلق ضرور میری ذات سے ہے۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھی۔ اور سُننے لگی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "دیوی ماتا اُس نے میری عزت بچائی ہے۔ تو اُس کا کلیجہ ٹھنڈا رکھ۔ اُس کے پروار کو ہر دُکھ سنکٹ سے بچا۔ اُس کا سُہاگ ہمیشہ بنا رہے"

یہ براہمنی ہیرو تھی۔ شانتی کے رگ و پے میں مسرت کی لہریں اُٹھیں۔ اُس کے توہمات دُھوئیں کے بادل کی مانند غائب ہو گئے۔ وہ روتے ہُوئے آگے بڑھی اور بوڑھی براہمنی کے پیروں سے لپٹ گئی۔

رات کو خواب میں وہ پھر دیوی کے سامنے کھڑی آرتی کرنے میں مصروف تھی۔ اِس وقت اُسے دین دُنیا کی خبر نہ تھی۔ یکایک دیوی نے سنگھاسن سے اُتر کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور کہا۔ تو کیوں ڈرتی ہے۔ تُو نے جو کچھ کیا ہے وہ ہزار تیرتھ یاترا سے بھی بڑھکر ہے"

شانتی کی آنکھ کھُل گئی ہیم اُس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ اور خواب میں مُسکرا رہا تھا۔

سُدرشن

لیلیٰ

یا

محاصرۂ غرناطہ

مصنّفہ۔ لارڈ لٹن .... مترجمہ سیّد امتیاز علی تاجؔ

فصل اوّل

ساحر اور سپہ گر

۱۴۹۱ء میں گرمیوں کا موسم تھا۔ اور شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازیبلا کی افواج نے شہر غرناطہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ رات زیادہ نہ گذری تھی۔ اور چاندنی اندلس کی شفاف فضا میں سے چھن چھن کر ہسپانی غنیم کے اِس عظیم الشان خیمہ و خرگاہ پر جو شور و غوغا سے لبریز تھا۔ چپ چاپ برس رہی تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی کوہ سیرا نوادا کی چوٹیوں کو جو برف کا نقرئی تاج پہنے کھڑی تھیں۔ جُھک جُھک کر چوم رہی تھی۔ اور اِن کے دامن میں پھیلے ہوئے میدان کے پُر فضا سبزے کی طراوت و تازگی نے جس پر انسان کی بربادی اپنا اثر نہ ڈال سکی تھی۔ اِس عالیشان کیمپ کے مقابل میں اِک شانِ تضاد پیدا کر رکھی تھی۔

غرناطہ کے بازاروں میں ابھی تک کہیں کہیں بےفکروں کی ٹولیاں نظر آتی تھیں۔ اِن میں سے بعض تو ایسے تھے۔ جو شہر کے محاصرے اور آنے والی لڑائی سے غافل ہو کر نہایت اطمینان و آسودگی سے موری بربط کے تار ہائے مرتعش سے سامعہ نوازی کر رہے تھے۔ یا کسی داستان گو کی شیوہ بیانیوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہے تھے۔ اور بعض ایسی انہماک آمیز حرکات اور پُر جوش اشارات سے گفتگو کر رہے تھے۔ جنہیں شرقی متانت و سنجیدگی ہر موقع و محل پر روا نہیں رکھتی۔ جو مقامات ایسے خوش فکروں کے جمگھٹوں

کے لئے مخصوص تھے یہاں تو یہ رونق تھی۔ باقی شہر پر بھیانک ویرانی برس رہی تھی۔

اس وقت ایک شخص بازار میں تن تنہا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے قدم بوس چغے میں ڈال رکھے تھے۔ اس کے استغراق کا یہ عالم تھا۔ کہ گرد و پیش کے تمام مناظر و واقعات اس کے لئے کالعدم تھے۔ لیکن جو لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایسے منہمک نہ تھے۔ کہ کوئی شخص پاس سے گذر جائے۔ اور وہ بے خبر رہیں۔ چنانچہ ان ہی میں سے ایک شخص نے اس کو دیکھ کر کہا۔ "اللہ اکبر! یہ تو المامن ساحر ہے"

دوسرے نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "اسی نے ابو عبداللہ کی دلیری و جوانمردی کو اپنے سحر و افسوں سے ناکارہ کر دیا۔ اگر میرا بس چلے۔ تو ایک دفعہ تو اس کی خوب ہی گت بناؤں"

تیسرا جھجک کر کہنے لگا "لیکن کہتے ہیں۔ کہ اس نے دعوے کیا ہے۔ کہ انسان جب لڑ لڑ کر عاجز ہو جائینگے تو جنّات کی افواج غرناطہ کی امداد کے لئے آئینگی"

چوتھا نہایت متانت کے ساتھ دانشمندانہ انداز سے اس طرح بولا۔ گویا اسے غیب کا علم ہے "اللہ اکبر۔ تقدیر کا لکھا اٹل ہے"

المامن کی نسبت لوگوں کے خیالات کچھ ہی ہوں وہ اس سے مرعوب ہوں یا متنفر۔ اس سے سہمے رہتے ہوں۔ یا اس سے امیدیں لگائے بیٹھے ہوں۔ بہرحال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جدھر سے وہ گذرتا تھا۔ لوگ اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور دیکھنے والوں پر سکوت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ کوچۂ زکاتین سے جو بڑے بازار کو قطع کرتا تھا۔ گذرتا ہوا یہ مشہور ساحر اس فصیل کے سامنے پہنچ گیا۔ جو محل شاہی اور حصار الحمرا کے گرد کھنچی ہوئی تھی۔

محل۔ کے دروازے پر پہرہ دار نے اسے جھک کر سلام کیا۔ المامن بے باکانہ محل کے اندر داخل ہوا۔ اور لمحہ بھر کے بعد خاموش اور گنجان درختوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ درختوں کے درمیان جا بجا عربی فوارے ہیں سے پانی چھلک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ان میں پارے کی دھاریں چاندنی میں اچھل اچھل کر نیچے گر رہی تھیں۔ درختوں کے اوپر عظیم الشان قلعہ بندیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ داہنی طرف وہ شجرفی برج کھڑے تھے جن کی اصل و اساس کے سربستہ راز کے انکشاف میں قدیم تاریخ کے اوراق قاصر ہیں۔ المامن تھم گیا۔ اور اس تماشاتے رنگ و بو پر نظر ڈال کر کہنے لگا "کیا باغ ارم اس سے زیادہ دلاویز ہوگا؟ کیا ایسے لطیف مقام کو ہسپانویوں کے ناپاک قدم پامال کرینگے؟ کیا مضائقہ ہے

ایک مذہب دوسرے مذہب کا دشمن ہُوا کرتا ہے۔ایک قوم دوسری قوم سے اُلجھتی چلی آئی ہے۔لیکن اب وہ زمانہ آرہا ہے۔کہ تاریخ اپنے آپ کو دُھرائیگی۔ مذہب دیرینہ اور قوم پارینہ پھر اقبالمند ہوگی۔اور ہماری طاقت و قوت کا ڈنکا پھر بجایا جائیگا"۔

اِن خیالات نے ساحر کو خاموشی کے ناپیدا کنار سمندر میں ڈبو دیا۔ اور وہ دیر تک اِن ستاروں کو غور سے دیکھتا رہا۔جن کی محفل کی رونق تاریکیِ شب کے ہر قدم کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔جن کا نور ہلتے ہُوئے پانی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ اور چپ چاپ پتوں کے کناروں پر مسکرا رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف یوں ٹکٹکی لگائے ہُوئے تھا۔ اور اس کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ ایک موری قوم کا نوجوان اِس کے پاس پہنچ گیا۔ اور اسے خبر بھی نہ ہُوئی۔

نوجوان کے اسلحہ چمک رہے تھے۔ اُس کے سفید برف سے عمامے پر ٹکے ہُوئے بیش بہا زمرد جگمگا رہے تھے یہ نوجوان اپنے پست قامت اور دُبلے پتلے ہم قوموں میں دراز قامت تھا۔ اور گو اپنی قوم میں قوی ہیکل شمار کیا جاتا ہو۔مگر ایسا نہ تھا۔کہ بلادِ ہسپانیہ کے نامور سپاہیوں کی برابری کر سکتا ہو۔اِس کی شخصیت میں ایک ایسی صولت و تمکنت مضمر تھی۔کہ بڑے بڑے مغرور شہسواروں کے مجمع پر بھی اِس کا رعب چھا جاتا تھا۔ چلتے وقت اس کے قدم اِس شانِ بے نیازی سے پڑتے تھے۔گویا زمین کی تحقیر کر رہا ہے۔اِس کے بلند سر اور ہرن کی سی گردن سے وہ ما فوق البیان شان و شوکت عیاں تھی۔کہ عالی نسبی شرافت اور حاکمانہ فطرت کا مجسمہ اِس سے بہتر تصوّر نہیں ہو سکتا۔ یہ نوجوان الامن کے قریب آکر اس سے چند قدم کے فاصلہ پر دفعتاً رُک گیا۔کچھ دیر تک اِسے خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ اور آخر کار جب زبان کھولی۔تو نہایت سرد مہری سے طنز کے لہجہ میں کہنے لگا" تاریک اسرار کے باطل دعویدار! کیا تو اقوام و افراد کی تقدیر کو جسے رسولِ خدا نے سپہ سالاروں کے دماغ اور سپہ گردوں کی قوت سے منسوب کیا تھا۔ تاروں میں دیکھ رہا ہے"؟

الامن نے آہستہ سے مڑ کر اِس شخص کو دیکھا۔جس نے اِس کے سلسلۂ خیال کو یوں توڑ دیا تھا۔ اور اُسے پہچان کر جوابدیا۔" شہزادے! مَیں غور کر رہا تھا۔کہ اِس عالمِ کون و فساد میں کتنے ہی انقلابات ایسے ہُوئے۔جو کُرۂ زمین کو اِس کے مرکز تک ہلا گئے لیکن اِن تاروں کی نگاہیں اب تک خاموشی کے ساتھ سب کو گھورتی رہیں۔ نہ کچھ ہمدردی ہی کی۔اور نہ کچھ تبدیلی ہی کر سکیں"!

مور نے المامن کے الفاظ کو دھرا کر کہا۔ "نہ کچھ تبدیلی ہی کرسکیں - اور پھر بھی تیرا عقیدہ ہے - کہ زمین پر ان کے مختلف اثرات پڑتے ہیں"۔

المامن نے مُسکرا کر کہا۔ "یہ فرمانا تو مجھ پر بُہتان لگانا ہے - آپ اپنے نیاز مند کو منجموں کے برخود غلط طبقے میں کیوں داخل کئے دیتے ہیں؟

"مَیں نجوم کو ہاروت ماروت دو فرشتوں کے علم کا ایک شعبہ سمجھتا ہوں"۔

"ممکن ہے۔ یہ درست ہو - اور گو مَیں بابل قدیم کی فصیل کے نیچے آدھی آدھی رات تک بھٹکتا پھرا ہوں - تاہم اس علم سے قطعی ناآشنا ہوں"۔

مور نے متعجب ہو کر جواب دیا۔ "تو تیری شہرت نے ہمیں دھوکا ہی دیا؟"

المامن نے نہایت سکون کے ساتھ چلتے ہُوئے کہا۔ "شہرت کبھی صداقت کی دعویدار نہیں ہوتی - اچھا شہزادے - خُدا حافظ - مَیں سلطان کے پاس جا رہا ہوں"۔

"ٹھیر - مَیں ابھی اس کے حضور سے آیا ہوں - اور اُس کے دل میں ان خیالات کو برانگیختہ کر آیا ہوں - جو سلطان غرناطہ کے شایان شان ہیں - اور مَیں نہیں چاہتا - کہ تجھ سا آدمی جو تیغ و تبر سے قطعاً بیگانہ ہے ان حیات افروز خیالات میں جا کر مخل ہو"۔

المامن نے جواب دیا۔ "عالی نسب موسےٰ - یہ اندیشہ نہ کر - کہ جو روح تو ابو عبداللہ کے سینہ میں پھونک آیا ہے - اس کا اثر میری گفتگو سے زائل ہو جائے گا - افسوس اگر میرے مشورے پر کان دھرے جاتے تو آج دلاوران غرناطہ میں موسےٰ کا اتنا تذکرہ نہ ہوتا - جتنے سلطان کے گیت گائے جاتے لیکن تقدیر نے یا خُدا نے ایک زوال پذیر خاندان کے تخت پر ایک ایسے شخص کو بٹھا دیا ہے - جو بہادر ہے - مگر بیدست و پا ہے - دانشمند ہے لیکن تخیل پرست - جب تم اسکی سرشت سے واقف ہو - تو پھر مجھ پر بدگمانی کرنا بے انصافی ہے"۔

موسےٰ دیر تک المامن کے چہرے کو غور کی نظروں سے دیکھتا رہا - اور پھر اپنا ہاتھ آہستہ سے ساحر کے بازو پر رکھکر کہنے لگا۔ "اے اجنبی - اگر تُو نے ہمیں دھوکا دیا - تو یہ سمجھ رکھنا - کہ یہ قوی بازو جو بے شمار دشمنوں کے خود پارہ پارہ کر چکا ہے - ایک غدار کی دستار کو سلامت نہ چھوڑیگا"۔

المامن نے بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔ "مغرور شہزادے - تو بھی یہ سمجھ رکھ - کہ مَیں اپنی نیّت کے معاملہ میں صرف خدائے پاک کے حضور میں جواب دہ ہوں اور انسان کے مقابلے میں اپنے افعال کی حمایت کر سکتا ہوں"

یہ کہکر ساحر نے اپنی لمبی اور لٹکتی ہوئی عبا کو اپنے گرد لپیٹا - اور سرسبز جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ باقی باقی

ساون رین کا سپنا

ایک ڈراما

مصنفہ:- ولیم شیکسپیئر

مترجمہ: سید امتیاز علی تاج

ارا کینِ ڈراما

تھیسیوس	رئیسِ یونان
ایجیوس	ہرمیا کا باپ
لسنڈر	ہرمیا کو چاہتے ہیں
ڈیمتریوس	ہرمیا کو چاہتے ہیں
فلستراط	مہتمم نشاط
قنس	بڑھئی
اسنوج	نجّار
بوطوم	جلاہا
فلوٹ	دھونکنی ساز
اسنوٹ	دُھنا
اسٹرونلنج	درزی
ہیپولیتا	ایمیزینی ملکہ۔ تھیسیوس کی منگیتر
ہرمیا	ایجیوس کی بیٹی۔ لسندر کو چاہتی ہے
ہلینا	ڈیمتریوس کو چاہتی ہے۔
اوبران	پریوں کا بادشاہ
طیطانیا	پریوں کی ملکہ
پوک	ایک شوخ پریزاد
مٹرکلی	پریاں
مکڑی	پریاں
پنکھی	پریاں
سرسوں	پریاں

پریوں کے بادشاہ اور ملکہ کے اور خدام

تھیسیوس اور ہیپولیتا کے خدام

مقام- ایتھنا اور اس کے نواح میں ایک جنگل

فصل اوّل

منظر اول - اثینا - ثیسیوس کا محل

(ثیسیوس۔ہیپولیتا۔فلستراط۔ اور خدام داخل ہوتے ہیں)

ثیسیوس حسین ہیپولیتا۔ہمارے عقد کی ساعت اب چلی آرہی ہے۔شادمانی کے چار روز گذرنے کے بعد نیا چاند نمودار ہوگا۔لیکن آہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پُرانا چاند بہت سُستی سے گھٹ رہا ہے۔میرے ارمانوں کو یہ اس طرح ترسا رہا ہے۔جیسے کوئی سوتیلی ماں کسی نوجوان کے حق وراثت سے تھکا دے۔

ہیپولیتا۔ چار روز بہت جلد رات میں ڈوب جائینگے۔ چار راتیں وقت کو خواب میں اُڑا ڈالیں گی۔اور پھر نیا چاند ایک نقرئی کمان کی طرح جو آسمان پر نئی نئی جھکائی گئی ہو۔ہماری ریتوں کی رات کو دیکھیگا۔

ثیسیوس۔فلستراط جا۔اثینی نوجوانوں کو خوشیاں منانے کے لئے تیار کر۔مسرت کی لطیف و نازک رُوح کو بیدار کر۔ملال سپرد خاک کر دیا جائے۔ہمارے جشن میں افسردہ دل کا کچھ کام نہیں۔

(فلستراط جاتا ہے)

ہیپولیتا۔میں نے اپنی شمشیر سے تجھ کو چاہا۔اور دُکھ پہنچانے کے بعد تیری محبّت کو جیتا۔لیکن میں تجھ سے شادی ایک اور انداز میں۔عیش و عشرت کے ہنگاموں میں شان و شوکت اور فتح و نصرت کے ساتھ کرونگا۔

(ایجیوس۔ہرمیا۔ڈیمتریوس اور لسندر داخل ہوتے ہیں)

ایجیوس۔ثیسیوس۔نوّاب نامور خوش و خرم رہے۔

ثیسیوس۔تمہاری دُعاؤں کا شکریہ۔اچھے ایجیوس تم کیسے آئے؟

ایجیوس۔غم و غُصّہ کی پریشانی میں مَیں آرہا ہوں میں اپنی اولاد۔اپنی بیٹی ہرمیا کے شکوے آپ کے حضور میں لایا ہوں۔ڈیمتریوس سامنے آ۔ عالیجاہ ہرمیا سے شادی کرنے میں اُس شخص کو میری رضامندی حاصل ہے لسندر آگے بڑھ۔اور جہاں پناہ۔اِس شخص نے میری بیٹی پر کوئی افسوں پڑھ کر پھُونکدیا ہے۔ تُونے۔لسندر ہاں تونے میری بیٹی کو غزلیں لکھ لکھ کر بھیجیں ہیں۔تونے اِس سے تحائف محبّت کا تبادلہ کیا ہے۔چاندنی راتوں میں تو اُس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر اپنی جھُوٹی محبّت کے گیت مصنوعی سوز و درد سے گاتا رہا ہے۔اور اپنے گیسو۔ انگوٹھیاں۔مٹھائیاں۔گلدستے۔تحفے اور پیغامبر بھیج بھیج کر جوالھڑ جوانی کو بری طرح متاثر کر جاتے ہیں۔شرارت

سے اُس کے دل پر قبضہ کر بیٹھا ہے۔ تو نے عیاری سے
میری بیٹی کا دل چُرا لیا ہے۔ اور اس کی جانب سے
جس اطاعت و فرمانبرداری کا مَیں حقدار تھا۔ تو نے اُسے
سرکشی و سنگدلی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور جہاں پناہ
اگر یہاں آپ کے حضور میں یہ ڈیمٹریس سے شادی
کرنے پر رضامند نہ ہو۔ تو مَیں اتھینا کا قدیم قانون
استعمال میں لانے کا حق مانگتا ہوں۔ چونکہ یہ میری ہے
مَیں جس کو چاہوں۔ اُسے دے ڈالوں۔ بس یا یہ اِس
شریف شخص کی ہو رہے۔ یا ہمارے قانون کے مطابق
جس کا نفاذ اِس موقع پر ہوتا ہے۔ اپنی موت کو پہنچے۔
تھیسیوس۔ ہرمیا۔ تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ حسین ہرمیا
سمجھ سے کام لو۔ باپ تمہارے لئے بمنزلہ خدا ہونا
چاہئے۔ تمہارا حسن اِس کا شرمندۂ احسان ہے۔ تم
ایک موم کی گڑیا کی طرح جس پر اِس کے نقش موجود ہیں اِس
کے بس میں ہو۔ وہ چاہے اسے قائم رکھے۔ چاہے
مسخ کر ڈالے۔ ڈیمٹریس شریف زادہ ہے۔

ہرمیا۔ لسنڈر بھی ایسا ہی ہے۔

تھیسیوس۔ اپنی جگہ وہ بھی ہے لیکن تمہارے باپ کی
رضامندی کو مدّنظر رکھتے ہوئے دوسرا نوجوان زیادہ مستحق ہے

ہرمیا۔ کاش میرے ابّا میری آنکھوں سے دیکھ سکتے۔

تھیسیوس۔ نہیں بلکہ تمہاری آنکھوں کو اس کے نقطۂ نظر
سے دیکھنا چاہئے۔

ہرمیا۔ جہاں پناہ مَیں معافی کی التجا کرتی ہوں۔ نہ جانے
کس طاقت نے مجھے دلیر بنا دیا ہے نہیں معلوم حضور کے
روبرو اپنے خیالات کا اظہار میری شرم و حیا کو کتنا شاق
گذرے۔ لیکن جہاں پناہ اگر مَیں ڈیمٹریس سے منسوب
ہونے سے انکار کر دوں۔ تو جس بُرے سے بُرے انجام
کو مَیں پہنچونگی۔ میری التجا ہے۔ مجھے بتا دیا جائے

تھیسیوس۔ سزائے موت یا ہمیشہ کے لئے انسانوں
کی صحبت ترک کرنے کا عہد۔ اِس لئے حسین ہرمیا۔
اگر تُم اپنے باپ کے انتخاب پر سر تسلیم خم نہیں کرتیں۔
تو اپنی اُمنگوں اور حوصلوں کو ٹٹولو۔ اپنی جوانی کو سمجھو۔
اور اپنی فطرت کے تقاضوں کو دیکھو بھالو۔ کہ تم عبائے زاہدی
پہننا برداشت بھی کر سکتی ہو۔ اور خانقاہ کی تیرہ و تاریک
قید میں تمام عمر بانجھ رہ کر سرد مہر و بے ثمر چاند کے حضور
میں دھیمے دھیمے گیت گا کر زندگی گزار سکتی ہو۔ مبارک
ہیں۔ وُہ جو ایسے کٹھن سفر کے لئے اپنی فطرت پر قدرت
حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن مسرتِ دُنیوی کے لحاظ سے
وہ شگفتہ پھول جس کی رُوح کھینچ لی جائے۔ ان دوشیزہ
کلیوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ جو تنہائی کی
سعادت میں کھلیں۔ بڑھیں۔ اور شاخ پر مرجھا کر رہ جائیں۔

ہرمیا۔ جہاں پناہ اسی طرح مَیں بڑھونگی۔ جیونگی۔ اور

مر جاؤنگی لیکن اپنی عصمت و عفت اِس شخص کے اختیار میں نہ دُونگی جِس کی قدرت کا ناخوشگوار جوا اُٹھانے سے میری رُوح انکار کرتی ہے۔

ثیسیوس۔ کچھ عرصہ غور کرو۔ اور نیا چاند نمودار ہونے تک جِس روز مجھ میں اور میری محبوب میں اُلفتِ جاودانی کے بندھن بندھ جائینگے۔ اپنے باپ کی حکم عدولی کے جرم میں موت کے لئے تیار ہوجاؤ۔ یا اسکی خواہش کے مطابق ڈیمٹریوس سے شادی کرلو۔ اور یا دائنا کے مندر میں ریاضت و تجرد دوام کا عہد راسخ کرو۔

ڈیمٹریوس۔ پیاری ہرمیا۔ رحم کرو۔ اور لسندر تُو اپنے باطل دعوے میرے زبردست حقوق کے مقابلے میں چھوڑ دے۔

لسندر۔ ڈیمٹریوس۔ تم اِسکے باپ کے منظورِ نظر ہو۔ ہرمیا کی محبّت میرے لئے رہنے دو۔ اور تم اِس کے باپ سے شادی کرلو۔

ایجیوس۔ ذلیل لسندر۔ ہاں وہ میرا منظورِ نظر ہے۔ اور جو کچھ میرا ہے۔ میری محبّت اِسے تفویض کردیگی۔ یہ میری ہے۔ اور مَیں اِس کے متعلق اپنے تمام حقوق ڈیمٹریوس کو سونپتا ہوں۔

لسندر۔ جہاں پناہ حسب و نسب اور مقدور میں مَیں ڈیمٹریوس سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ میری محبت اِس کی نسبت بہت زیادہ ہے میرا نصیبہ ڈیمٹریوس سے بڑھکر نہیں تو اُسکے مقابلے میں ہر طرح سے قابل وقعت ہے اور اِن تمام دعووں سے بڑھکر یہ بات ہے۔ کہ مَیں حسین ہرمیا کا منظورِ نظر ہوں۔ تو پھر مَیں اپنے حقوق سے کیوں دست بردار ہوجاؤں۔ مَیں ڈیمٹریوس کے مُنہ در مُنہ کہتا ہوں۔ کہ یہ ندار کی بیٹی ہلینا سے محبّت کرتا رہا ہے۔ اور اس کا دِل بھی لے بیٹھا ہے۔ اور وہ حسین خاتون اِس پر جان چھڑکتی ہے۔ اسکو دیوانہ وار چاہتی ہے۔ پرستارانہ اِس متلون اِس دھوکہ باز شخص پر عاشق ہے۔

ثیسیوس۔ ہاں مَیں اِس سے پیشتر بھی یہ سب کچھ سُن چکا ہوں۔ اور اِس کے متعلق ڈیمٹریوس سے گفتگو کرنے کا ارادہ بھی کر رہا تھا۔ لیکن ذاتی معاملات کی کثرت میں یہ بات میرے ذہن سے اُتر گئی۔ لیکن ڈیمٹریوس آؤ۔ اور ایجیوس تم بھی آؤ۔ تم میرے ساتھ چلو۔ مَیں تنہائی میں تم دونوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔ حسین ہرمیا۔ باقی تم اپنے خیالات کو اپنے باپ کی مرضی کے مطابق بنانے پر تیار ہوجاؤ۔ نہیں تو اثینا کا قانون جِس کی قوت کو زائل کرنا ہمارے بس میں بھی نہیں۔ تم کو موت یا مجرد زندگی کے عہد پر مجبور کر دیگا۔ میری ہیپولیتا۔ میری جان تم سُناؤ؟ ڈیمٹریوس اور ایجیوس

چلو۔ میں تم سے اپنی شادی کے متعلق کام لینا اور چند ایسی باتوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا بہت کچھ تم سے تعلق ہے۔

ایجیوس۔ ہم اسے اپنا فرض سمجھ کر فخر سے آپکے ساتھ ہیں۔

(لسندر اور ہرمیا کے سوا سب چلے جاتے ہیں)

لسندر۔ کیوں میری پیاری۔ تمہارے رخسار زرد کیوں ہو رہے ہیں۔ یکلخت یہ پھول کیوں کملا گئے؟

ہرمیا۔ شاید بارش کی کمی سے۔ جس کا طوفان میں اپنی آنکھوں سے بہا سکتی ہوں۔

لسندر۔ افسوس۔ جہاں کہیں میں نے پڑھا یا داستانوں اور واقعات میں سنا یہی دیکھا کہ عشق حقیقی کی راہ مصیبتوں سے پٹی ہوتی ہے۔ کہیں تو حسب ونسب میں فرق ہوتا ہے۔

ہرمیا۔ اعلےٰ کو ادنےٰ کا غلام بنادے۔ تو محبت مصیبت ہے۔

لسندر۔ کہیں عمروں میں اختلاف۔

ہرمیا۔ پیری جوانی پر جان دے۔ تو محبت قیامت ہے۔

لسندر۔ کہیں عزیزوں کا انتخاب آڑے آتا ہے۔

ہرمیا۔ دوسرے کی نظر محبت کو منتخب کرے۔ تو محبت جہنم ہے۔

لسندر۔ اور اگر کہیں انتخاب بھی ہر طرح مناسب ہو جائے تو لڑائی بھڑائی۔ موت یا بیماری محبت کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہے اور اسکو آواز سا عارضی۔ سایہ کی طرح تیز پا خواب کی مانند مختصر اور اندھیری رات میں چشمک برق سا ناپائدار بنا دیتی ہے۔ کہ جوش میں زمین اور آسمان کو نظروں کے سامنے کھول کر توڑ رکھ دیا۔ لیکن کوئی ابھی اتنا بھی نہیں کہنے پایا۔ کہ دیکھنا۔ جو تاریکی کا منہ اسے نگل جاتا ہے۔ تمام حسین چیزیں یوں ہی پلک جھپکنے میں برباد ہو جاتی ہیں۔

ہرمیا۔ اگر سچے چاہنے والوں میں ہمیشہ بجوگ پڑتا رہا ہے۔ تو پھر تو اسے قسمت کا لکھا سمجھنا چاہیئے۔ آؤ ہم ان آزمائشوں پر صبر کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ ہمیشہ سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ اور اس کا اور محبت کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسے خواب وخیال۔ آہیں۔ تمنائیں اور آنسو محبت کرنے والوں کا حصہ ہیں۔

لسندر۔ یہ رائے قابل قدر ہے۔ لیکن ہرمیا میری ایک بات سنو۔ میری ایک بیوہ پھوپی ہیں۔ دولت کی ان کے ہاں ریل پیل ہے۔ اور اولاد کوئی نہیں۔ ان کا گھر اثینا سے اکیس میل دور ہوگا۔ مجھے وہ اپنا بیٹا سمجھتی ہیں۔ پیاری ہرمیا۔ وہاں میں تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ اور اس جگہ اثینا کا سخت قانون بھی ہم پر گرفت نہیں کر سکتا۔ اب اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ تو کل رات چوری چھپے اپنے باپ کے گھر سے نکل آؤ۔ اور شہر سے تین میل باہر جو جنگل ہے۔ جہاں ایک مرتبہ

تُم ہلینا کے ہمراہ جشنِ بہار منانے گئی تھیں۔ اور مَیں تُم
سے ملا تھا۔ وہاں مَیں تمہارا انتظار کرونگا۔

ہرمیا۔ میرے اچھے لسنڈر۔ مجھے عشق کے دیوتا کی مضبوط
کمان کی قسم۔ اس کے بہترین زرّین تیروں کی قسم۔ زہرہ
کی رتھ کی معصوم قمریوں کی قسم۔ اِس سب کی قسم جو رُوحوں
کو ملاتا اور محبتوں کو کامراں بناتا ہے۔ اور اُس آگ کی
قسم جس نے ملکہ قرطجنہ کو اِس وقت پھُونک ڈالا تھا۔
جب دغاباز ترویان کا جہاز رُخصت ہوتے ہُوئے
دکھائی دے رہا تھا۔ اِن تمام قسموں کی قسم جو مردوں نے
توڑیں۔ اور جو گنتی میں عورتوں کے وعدوں سے بہت
زیادہ ہیں۔ جو جگہ تُم نے مقرر کی ہے۔ مَیں کل ضرور
وہاں پہنچ جاؤں گی۔

لسنڈر۔ دیکھنا۔ بھُول نہ جانا۔ وُہ دیکھو ہلینا آرہی ہے۔

(ہلینا داخل ہوتی ہے)

ہرمیا۔ حسین ہلینا۔ خُدا خیر کرے۔ کہاں چلیں؟

ہلینا۔ تم مجھے حسین کہتی ہو۔ اپنے لفظ پھیر لو۔ ڈیمیٹریوس
تمہارے حُسن پر مرتا ہے۔ ہائے رے تمہارے حُسن
کی خوش قسمتی۔ تمہاری آنکھیں راہنما تارے ہیں تمہاری
زبان کی آواز اُس کوئل کے گیتوں سے زیادہ میٹھی ہے۔
جو گوالوں کے کان میں اُس وقت پہنچتی ہے جب فصلیں
سرسبز ہوجاتی ہیں۔ اور کلیاں پھُوٹنی شروع ہوتی ہیں
بیماریاں متعدی ہُوا کرتی ہیں۔ کاش حُسن کا بھی
یہی عالم ہوتا۔ تو حسین ہرمیا رخصت ہونے سے پیشتر
تمہارا حُسن مَیں لے لیتی۔ میرے کان تمہاری آواز اُڑا لیتے
میری آنکھیں تمہاری نظریں۔ اور میری زبان تمہاری
زبان کا رس نکال لیتی۔ اگر دُنیا میری ہوتی۔ تو ڈیمیٹریوس
کو چھوڑ کر باقی سب میں تُم جیسا بننے کی خاطر دے ڈالتی
ہائے مجھے سکھادو۔ تُم کن نظروں سے دیکھتی ہو۔ ڈیمیٹریوس
کے دِل کے مدوجزر پر کس طرح حکومت کرتی ہو۔

ہرمیا۔ مَیں اِس سے چیں بہ جبیں رہتی ہوں لیکن پھر
بھی وہ مجھے چاہتا ہے۔

ہلینا۔ اے کاش تمہاری چینِ جبین اپنا ہُنر میرے
تبسّم کو سکھا دے۔

ہرمیا۔ مَیں اُسے کوستی ہوں لیکن پھر بھی وہ مجھ سے
محبّت کرتا ہے۔

ہلینا۔ اے کاش میری دُعائیں ایسی محبّت پیدا کرسکیں

ہرمیا۔ جتنا مَیں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ اتنا ہی وُہ
مجھ سے محبّت کرتا ہے۔

ہلینا۔ جتنا مَیں اس سے محبّت کرتی ہوں۔ اتنا ہی وہ
مجھ سے نفرت کرتا ہے۔

ہرمیا۔ ہلینا اس کی اِس حماقت میں میرا کچھ قصور نہیں ہے

ہلینا۔ تمہارا نہیں۔ تمہارے حُسن کا قصور ہے اے کاش

یہی قصور میرا ہوتا۔

ہرمیا - خاطر جمع رکھو - اب وہ مجھے دیکھنے بھی نہ پائیگا - مَیں اور لسنڈر کل اس شہر سے بھاگ جائیں گے لسنڈر کو دیکھنے سے پہلے اثینا مجھے فردوس معلوم ہوتا تھا - لیکن میرے پیارے میں کیا کچھ حسن ہیں - کہ اُس نے جنّت کو میرے لئے جہنّم بنا دیا ہے -

لسنڈر - ہلینا تم کو ہم اپنا راز بتائے دیتے ہیں - کل رات جب فیبی چاند کی دیوی اپنا درخشاں چہرہ پانی کے آئینہ میں دیکھے گی - اور گھاس کے پتّوں کو آبی موتیوں سے آراستہ کردیگی - وہ وقت کہ چاہنے والوں کی فراری کی پردہ پوشی کر سکتا ہے - ہم نے اثینا کے دروازوں سے چھپ کر نکل بھاگنے کو ٹھیرایا ہے -

ہرمیا - اور جنگل میں جہاں مَیں اور تم اکثر زرد گلاب کے پھولوں کے تختوں پر لیٹا کرتے تھے - اور اپنے دِل کی پیاری پیاری باتیں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے - وہاں مَیں اور میرا لسنڈر ملیں گے - اور اثینا پر نگاہ واپسیں ڈال کر نئے دوستوں اور نئی صحبتوں کی تلاش میں چل کھڑے ہونگے - پیاری سہیلی خدا حافظ - ہمارے لئے دُعا کرنا - تیرے ڈیمیٹریس کو تیرا بنانے میں تیرا نصیبہ یاوری کرے - لسنڈر - وعدے کو یاد رکھنا - کل آدھی رات تک اپنی نظریں ہمیں عاشقوں کی غذا سے محروم رکھنی ہونگی -

لسنڈر - میری ہرمیا میں آؤنگا -

(ہرمیا جاتی ہے)

ہلینا خدا حافظ - جیسے تم ڈیمیٹریس پر مرتی ہو - وہ بھی تم پر مرے -

(لسنڈر جاتا ہے)

ہلینا - بعض لوگ دوسروں کی نسبت کتنے زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں - دُنیا بھر میں مَیں اس کے برابر حسین سمجھی جاتی ہوں - لیکن پھر اس سے کیا ہوتا ہے ڈیمیٹریس کا یہ خیال نہیں - وُہ اُس بات کو معلوم نہیں کرنا چاہتا جو اُس کے سوا سب کو معلوم ہے - لیکن جیسے وہ ہرمیا کی آنکھوں پر فدا ہونے میں غلطی کر رہا ہے - ویسے ہی مَیں اِس کی صفات سے اُلفت کرنے میں غلطی پر ہوں - محبّت ذلیل وادنٰے اور بد وضع چیزوں کو حسین و شاندار بنا دیتی ہے - محبّت آنکھوں سے نہیں - دِل سے دیکھتی ہے - اور اسی لئے عشق کا پردار دیوتا کیوپڈ اندھا ظاہر کیا جاتا ہے - نہ محبّت کے دل کی رائے اور مذاق ہی درست ہوتا ہے - پر اور نابینائی سے مُراد لاپروائی اور تیزی ہے - اور چونکہ محبّت کے دیوتا کی نظر انتخاب اکثر دھوکا کھا جاتی ہے - اِس لئے وہ بچّہ کہلاتا ہے - شوخ لڑکے کھیلتے وقت آپس میں جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں - اسی طرح پر لڑکا

محبت کا دیوتا ہر کہیں جھوٹے حلف اُٹھاتا ہے۔ ہرمیا کو ابھی نہ دیکھا تھا۔ تو ڈیمٹریس اولوں کی بوچھاڑ کی طرح قسموں کا تار باندھ دیا کرتا تھا۔ کہ مَیں صرف تمہارا ہوں۔ لیکن جب اُس اولے کو ہرمیا کے حُسن کی حرارت پہنچی۔ تو وہ گھل گیا۔ اور قسموں کی بوچھاڑیں بہ گئیں مَیں جاکر حسین ہرمیا کی فراری کی خبر اسے بتاتی ہوں۔ پھر وہ کل رات جنگل میں اس کا تعاقب کرے گا۔ اور اس اِطلاع کے لئے اگر وہ شکرگذار ہُوا۔ تو گو یہ شکریے بہت مہنگے پڑیں گے لیکن اس طریق سے اِس کو وہاں دیکھ ہی آنے میں میرے دِل دردمند کی بہت کچھ تسکین ہو جائے گی۔

باقی باقی

محوی

صیّاد مرے حال سے بیگانہ نہیں ہے — محتاجِ اثر اب میرا افسانہ نہیں ہے

اللہ رے اِس دَور کی افسردگیِ شوق — میخانہ ہے کیفیتِ میخانہ نہیں ہے

اُف ہمتِ دِل توڑ دی یہ کہہ کے کسی نے — دلچسپ تیرے عشق کا افسانہ نہیں ہے

اِک میکدۂ حُسن ہے اِک کیف کی دُنیا — ساقی یہ تری نرگسِ مستانہ نہیں ہے

ہیں اور جنوں خیز یہ گھر کے در و دیوار — اِس شہر میں یارب کوئی ویرانہ نہیں ہے

کیا دُور ہوا افسردگیِ خاطرِ مے نوش — جس بزم میں کچھ ذوقِ حریفانہ نہیں ہے

اللہ، نگہبان ترا جامۂ ہستی — اب ہوش میں میرا دِل دیوانہ نہیں ہے

تصویر ہے افسردگیِ بزمِ چمن کی — پامال نہ کر سبزۂ بیگانہ نہیں ہے

محوی نہ سُنی پھر کوئی آواز جنوں خیز
اب نجد میں کیا کوئی بھی دیوانہ نہیں ہے

سیّد محمود مرحوم ایک شاعر کی حیثیت میں

ابھی اتنا زمانہ نہیں گذرا۔ کہ لوگ سیّد مرحوم کی اہم شخصیت کو بھول جائیں۔ کیونکہ اُن کے فضائل و کمالات ایسے نہ تھے جن کے آثار اسقدر جلد محو ہو سکیں۔ آج ہم اُن کی یاد کو اُس عظمت کے حوالہ سے تازہ نہیں کرتے جو انہوں نے سر سیّد مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی۔ نہ اُن کی اس عدیم المثال قانون دانی کا تذکرہ مدِ نظر ہے جس کے رہبرانہ نقوش سرکارِ انگریزی کے دارالانصاف میں، غیر فانی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور نہ اُن محیر العقول عجائبات کا اعادہ مطلوب ہے۔ جن کو ایک عالم نے اُن کی ذات سے منسوب کر رکھا ہے۔ بلکہ آج ہم اُن کی جامعیت و ہمہ گیری کے اعتراف کے ساتھ اُن کے ایسے مخصوص پر دازِ طبیعت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ جو عام طور پر ظاہر نہیں ہُوئی اور جس کے لئے ادبِ اُردو انکا زیرِ احسان ہے عرصہ سے ہندوستان جدید کے قلوب میں اُردو شاعری کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کچھ عجیب طرح سے پرورش پا کر متمکن ہو رہے ہیں۔ اور اب مستقل طور پر ایسے ایسے طبقات نظر آتے ہیں۔ جو شعر کو دُنیا کی تمام چیزوں سے بڑھکر ناقابلِ اعتنا شے سمجھتے ہیں۔

لیکن جن لوگوں میں ذوقِ شعر اس حد تک مفقود ہو گیا ہے اُن کے حق میں "علم الادب" کی رُوحانی و جذباتی عدالت یہ ہدایت آمیز فیصلہ ناگوار تصوّر کریگی۔ کہ اِس نیرنگ آباد عالم میں اُن کے اذہانِ سادہ و خُشک کی چنداں وقعت نہیں۔ اور کاش کہ کارکنانِ قضا و قدر اُن کی غیر دلچسپ ہستیوں کو ارسطو کے اِس خیالی نظام جمہوریت میں منتقل کر دیتے۔ جہاں شاعر کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی گئی!

اُردو شاعری کے ساتھ اِس ناروا سلوک کا ذمہ وار کہا جاتا ہے، کہ انگریزی دان طبقہ ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انگریزی دان طبقہ نے شاعری کی تربیت و بقا میں کسی طرح کسی دوسرے طبقے سے کم حِصّہ نہیں لیا۔

مسٹر جسٹس سیّد محمود مرحوم کا وجود انگریزی تعلیم کا بہترین نمونہ کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ انکو اس باب میں اولیّت اور جامعیّت، دونوں فوقیتیں حاصل تھیں، لیکن اِس وقت ہم اُن کو جس حیثیت میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ ایک شاعر ہی کی حیثیت ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رفعتِ دماغ ودل جب ایک خاص سطح پر پہنچتی ہے۔ تو قدرتی طور پر شاعری کا فطری ظہور ہوجاتا ہے۔ پھر نہ انگریزی تعلیم مانع ہوتی ہے اور نہ مدعیانہ روشن خیالی۔

سید محمود مرحوم جیسا کہ سب جانتے ہیں مغربی علوم کے فاضل تھے۔ علومِ مشرقیہ میں بھی اُن کو خاص اور قابلِ ذکر دستگاہ حاصل تھی۔ اُن کے کتب خانہ کی اکثر اُن عربی کتابوں پر، جو منتہیانہ مطالعہ کے لئے سرمایۂ فضل کہی جاسکتی ہیں۔ خود مرحوم کے طبعزاد اور معرکۃ الآرا حواشی دیکھنے میں آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وُہ بہر نوع ایک وسیع، مصنّفانہ نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کی نظر کی اِسی وسعت، اور ہمہ گیری کی اِسی استعداد نے اُن کو میدانِ نظم وشعر میں بھی گرم سیر کردیا۔ اور اِس میں شک نہیں کہ وقت و موقع کے اعتبار سے اُن کے یہ چند اشعار بے حد تعریف کے سزاوار ہیں!

"ہزار داستان" کے اِسی نمبر میں "لیلیٰ" آپ کے پیشِ نظر ہے، یہ لارڈ لٹن کے مشہور و مقبول ناول کا ترجمہ ہے۔ اِس کے چند ابتدائی ابواب کا ترجمہ، غالباً ۹۶ء میں سیّد محمود مرحوم نے بھی فرمایا تھا۔ جو ناتمام رہ گیا۔ یہ ناتمام ترجمہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوچکا ہے۔ سیّد محمود مرحوم نے اسی ناول کی دو نظموں کا نظم ہی میں ترجمہ کیا تھا، جس سے اُن کی شاعرانہ اہلیت کا ثبوت ملتا ہے۔

ابو عبداللہ والیٔ قرطبہ کی محبوبہ امینہ گاتی ہے:-

امینہ کا گیت

اے نغمۂ نرم و خوش ادا، چل
اے نقرئ موج جانفزا، چل
اے بادِ صبا تو اپنے ہمراہ
گلبرگِ سرود و نغمہ لے جا
یہ کشتیٔ نازک و معطر
لے جا تُو اِسے بجانِ دلبر
لے جا تو اِسے نسیم لے جا
ہم پر ہے کھلی بہارِ الحاں
جوں شاخ و درخت باغِ رضواں
جن پر کہ ہیں گھونگرو لٹکتے
اور ہلکی ہوا سے ہیں وہ بجتے
ہم پھرتی ہیں جبکہ رقص کرتی
نغمہ کی ہیں کلیاں ہم سے جھڑتی
جنّت ہے وہیں جہاں ہے جانا
اے میٹھی صدا، جسے ہوں سُنتی
اے کاش کہ تجھ سی مَیں بھی ہوتی
اور تیری طرح مَیں اُس کو بھاتی

تو دل ہی میں اُس کے بیٹھ جاتی
جب ہوتے خیال تازہ اُس کے
مَیں دِل ہی میں رہتی اُسکے بسکے
اس طرح تمام ہوں تو بہتر

جو لوگ ترجمہ کی دقّتوں سے واقف ہیں۔ وُہی اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ اجنبی زبان کے اجنبی خیال کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت کیسی دماغی مشکلیں اور اُلجھنیں پیش آتی ہیں۔ خصوصاً نظم کا ترجمہ اور وہ بھی نظم میں، بڑی ہی کاوش کا کام ہے۔

اِس ساری نظم میں دو ہی تین مقامات ایسے ہیں جن پر ایک اہل زبان شاعر کا ذوق فن متردد ہو سکتا ہے۔ ورنہ پوری اصل نظم نہایت خوش اسلوبی اور سادگیِ بیان سے ترجمہ ہو کر نظم ہُوئی ہے۔ زبان میں صفائی ہے، بحر میں ترنم و موسیقیت ہے۔ الفاظ میں شاعرانہ سنجیدگی ہے۔ اور اغلاق کا کہیں شائبہ تک نہیں قوافی کا اہتمام بھی پایا جاتا ہے۔ اور جہاں فروگذاشت نظر آتی ہے۔ اُس کی وجہ اصل نظم کی آزادانہ روش ہے۔

نظم کی ابتدا میں نغمہ کے واسطے لفظ "چل" ذرا بے ربط سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر بے معنی نہیں۔ "نقرئی موج جانفزا" کا مفہوم نہایت بلیغ ہے۔

"تموج" نغمہ کی حقیقت ہے۔ اسی حقیقت پر اعتبار کر کے "موج جانفزا" سے نغمہ کا استعارہ کر لیا گیا ہے موج کو آب و بحر سے جو علاقہ ہے۔ ظاہر ہے۔ اور نقرئی موج' یا تو آبِ شفاف کی موج کو کہہ سکتے ہیں یا اس موج کو جو پر تو مہر و ماہ سے منوّر ہو گئی ہو۔ نغمہ آبِ شفاف کی روانی یا موج نور کی درخشانی سے بیگانہ نہیں۔

چوتھے مصرع میں' گلبرگ سرودِ و نغمہ کی لفظی و معنوی خصوصیتیں جسقدر اعلےٰ ہیں۔ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ نظم کے چوتھے بند میں "نغمہ کی ہیں کلیاں ہم سے جھڑتی" نہایت شاداب اور پُر از انداز اسلوب بیان ہے۔ اور پانچواں بند تو ایک عجیب جذبہ کو عجیب ترین انداز سے ظاہر کر رہا ہے' کیا خوب ہے۔ "اے وہ صدا' جس کو مَیں سُن رہی ہوں' کاش مَیں بھی تیری ہی طرح' ایک نغمہ' ایک لے' ایک ترنم ہوتی' تاکہ جس طرح اب تیری دلکشی میرے دِل میں اُتری جاتی ہے۔ مَیں' نغمہ ہو کر اُس بیوفا کے دل میں گھر کر لیتی' کیونکہ نغمہ تو اُس پر بھی اثر کرتا ہے لیکن میری آہ و شیون کی اُس کے یہاں کوئی شنوائی نہیں ہوتی!

دوسری نظم سالار ساگر موسلے کے مُنہ سے ادا ہوتی ہے جس وقت وُہ اپنی محبوبہ لیلیٰ اسکہ مکان کے قریب اسکے انتظار میں گاتا ہے۔

موسیٰ کا مخاطب

اے جان کی روشنی اب جلدی سے ہو خراماں
ہجولیوں کو اپنی گردوں پہ کر پریشاں
وہ پیاری پیاری انکھیاں مشتاق انکی ہے جاں
شب بھی بغیر اُن کے ہے غم۔ وہ وجیہہ ہاں
ہے آیتِ مقدس خنجر پہ مبہم کندہ
صفحہ پہ دِل کے لیکن ہے نام تیرا لکھا
ہیں نور دین و ایماں دونوں کے لفظ یکساں
دونوں کا سچ برابر دونوں ہیں پاک یکساں
ہیں دونوں گو کہ یکساں گو پاک ہوں برابر
سچا ہے دِل زیادہ تلوار سے بھی بڑھ کر
اے جاں کی روشنی آ، ہو مجھ پہ جلوہ فرما
شب کے ستارے تجھ پر کرتے ہیں رشک کیا کیا
وہ شوخ چشم شہلا، ہے جان جس پہ شیدا
انجم کو تاب کیا ہے ہوں اس سے ہم اشارا

"آیتِ مقدس" سے "سچا ہے دل زیادہ تلوار سے بھی بڑھکر" تک، جو قطعہ ہے، بہت پُر جوش اور حقیقت آشکار ہے۔ مگر قطعہ کے اسی آخری مصرعہ میں "بڑھکر" اور "زیادہ" بوقت واحد، مترادف الفاظ کا بے محل استعمال ہے۔

ترکیب و بندش میں جو فارسی اور پُرانی اُردو کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اِس ذوق کو نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے۔ جو مرحوم کو فارسی اور پُرانی اُردو کی شیریں اور پُر معنی تراکیب سے تھا۔ سُنا گیا ہے کہ مرحوم اکثر ایک ایسے رنگ کیف میں جو اُن کو ہی زیب دیتا تھا۔ اور ایک ایسے جوش میں جسکے وہی متحمل ہو سکتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ کہ حافظ۔ غالب اور میر کو صرف محمود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ کہکر وہ اِنکے معجزاتِ شعری کو پڑھتے جھومتے اور اپنے کیف کو تشریح مطالب میں منتقل کر کے سُننے والونکو سرشار کر دیتے۔

ایڈیٹر

محبت

عشق میں وصل وجُدائی سے نہیں کچھ گفتگو (میر) قربِ وبُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیئے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا (غالب) اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
محبت میں مزا ہے چھیڑ کا لیکن مزے کی ہو (داغ) ہزاروں لطف اِک اِک شکوۂ باطل میں ملتے ہیں
شاید اسی کا نام محبت ہو شیفتہ (شیفتہ) اِک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پُوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آخر کُتّوں کا فایدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دُودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے۔ دُودھ دیتی ہے۔ مینگنیاں بھی۔ یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے۔ کہ کُتّا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اِسی کا نام ہے۔ کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لئے باری باری صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کُتّے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی۔ تو اُنہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دیدیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کُتّے نے مطلع عرض کر دیا۔ پھر تو جناب ایک کہنہ مشق اُستاد کو جو غُصّہ آیا۔ ایک حلوائی کے چُولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پُوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اِس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کُتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہُوا کہ کچھ نہ پُوچھئے۔ کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وُہ ہنگامہ گرم ہُوا۔ کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر۔ آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سُنتا۔ اب اِن سے کوئی پُوچھے۔ کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا۔ تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کُتّے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہُوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے۔ اِس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اِس کے علاوہ اور ایک بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہُوا۔ خُدا کی قسم ان کے کتوں میں وُہ باقاعدگی دیکھی ہے۔ کہ عش عش کرتے لوٹ آتے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہُوئے۔ کُتّے نے برآمدے

ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کردی۔ اور پھر مُنہ بند کر کے کھڑا ہوگیا۔ ہم آگے بڑھے تو اُس نے بھی چار قدم آگے بڑھکر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کردی۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کُتّے ہیں۔ کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگاتے جاتے ہیں۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں۔ نہ وقت پہچانتے ہیں۔ بس گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے۔ کہ تان سین اِسی مُلک ہی میں تو پیدا ہُوا تھا۔

اِس میں شک نہیں۔ کہ ہمارے تعلقات کُتّوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیاگرہ سے مُنہ موڑا ہو۔ شاید آپ اِس کو تعلّی سمجھیں۔ لیکن خُدا شاہد ہے۔ کہ آج تک کبھی کسی کُتّے پر ہاتھ اُٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی۔ کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیئے۔ کہ دافعِ بلیّات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کُتّے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر کچھ اسقدر غلبہ پا جاتی ہے۔ کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں۔ تو یقیناً یہی سمجھیں گے۔ کہ ہم بُزدل ہیں۔ شاید آپ اِس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں۔ کہ ہمارا گلا خشک ہُوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں۔ تو کھرج کی سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائیگی۔ اِس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہُوا ہے۔ کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آرہے ہیں۔ اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔ اِس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہوگئے۔ تو کوئی یہی سمجھیگا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مُڑے۔ تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصوّر ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اُسے بھی کُتّا دیکھا۔ ایک تو کُتّا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کُتّا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہوگئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طبّ کا مسئلہ ہے۔ کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے۔ تو

کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر بعد میں سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لئے آج تک کُتّے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کُتّے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا تاریخی مصرعہ دُعائیہ ہوتا۔ "کہ اس کُتّے کی مٹی سے بھی کُتّا گھاس پیدا ہو"۔ لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جبتک اس دُنیا میں کُتّے موجود ہیں۔ اور بھونکنے پر مُصر ہیں۔ سمجھ لیجئے۔ کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کُتّوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے۔ اور پھر بچوں۔ بُوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کُتّا کبھی کبھی اپنے رُعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے۔ تو ہم بھی چارو ناچار کہہ دیں۔ کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہئے۔) لیکن یہ کمبخت دوروزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز اتنا سا پھیپھڑا۔ اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں۔ کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آکر گویا اُسے روک ہی تو لینگے اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو۔ تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا؟

کتّوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دُکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پُورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کر دے۔ تو آپ ہی کہیئے۔ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ اُن کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگے حرکات و سکنات (حرکات اُن کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے۔ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی۔ تو کیا تیر مار لیگا۔ بہر صورت کتّوں کی یہ پہلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے۔ کہ جناب عالی۔ سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کُتّوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ماپنے میں گزار دی ہیں لیکن پُوری مجلس

کاہیں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔

(قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے۔ کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کُتا کمرے میں موجود ہو۔ تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دلشکنی مطلوب نہیں)

خُدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کُتّے اس کلیے سے مستثنےٰ نہیں۔ آپ نے خُدا ترس کُتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے۔ تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ اُٹھانے نہیں دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سُرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی۔ تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے۔ کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کُتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِّ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خُدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ اُنہوں نے غیض و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچّا فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں"۔ بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کہ بیشمار کُتّے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کُھلتی ہے۔ تو پاؤں چارپائی کی ادوائن میں پھنسے ہوتے ہیں۔ اگر خُدا مجھے کچھ عرصے کیلئے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرماتے۔ تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کُتّے علاج کے لئے کسولی پہنچ جائیں۔ خُدا جانے کس کا شعر ہے۔ اغلباً داغ کا ہے۔

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں ۔ آوازِ سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے۔ جو ایشیا کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کُتّے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کُتا کب بھونکنا بند کر دے۔ اور کاٹنا شروع کر دے؟

"پطرس"

۷۸۶

ہزار داستان

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جلد-۱ | اشاعت بابتہ ماہِ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء | نمبر۲

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ جن کی نگاہ حسن پرور نے ہزار داستان میں بہت سی خوبیاں دیکھ لیں اور میری حقیر محنتوں کی داد دیکر میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں خدا سے دعا مانگتا ہوں۔ کہ وہ مجھے اور ہزار داستان کو ان قدر دان اور ذرہ نواز احباب کی نوازشوں کا اس سے زیادہ مستحق بنائے۔

اگرچہ ہزار داستان کی موجودہ اشاعت مدت اجرا کو مدنظر رکھ کر کسی طرح قابل شکایت نہیں۔ تاہم میں یہ لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ ان تمام مصارف کی تلافی جو ہزار داستان کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ صرف توسیع اشاعت ہی کر سکتی ہے۔ اور اس کے لئے میں اپنے احباب کرام سے جتنی امیدیں رکھوں کم ہیں۔

خندۂ تقدیر (ایک انگریزی افسانہ کا ترجمہ جو گذشتہ اشاعت میں شائع ہوا ہے) کے متعلق میں ناظرین کرام کی توجہ بعض ضروری امور کی طرف منعطف نہیں کر سکا۔ یہ ایک فروگذاشت تھی جس کی تلافی اب کی جاتی ہے۔ اس افسانہ میں مصنف نے شاعرانہ تخئیل اور بلیغ استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کام لیا ہے۔ بعض استعارے اردو زبان کے لئے اجنبی اور غیر مانوس ہیں۔ میں غیر زبان کی تشبیہوں اور استعاروں میں تصرف جائز تصور نہیں کرتا۔ کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں۔ جن میں غیر زبانوں کا رنگ انشا جھلکتا ہے۔ اور بیرونی ادبیات میں سے اچھی تشبیہیں اور اچھے استعارے ہی اس قابل ہو سکتے ہیں۔ جن کو اپنی زبان میں بغرض توسیع منتقل کیا جائے۔ یہ چیزیں قواعد زبان اور محاورہ سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا علاقہ بلاغت بیان سے ہے۔ امید ہے کہ اس قسم کے مضامین میں ان امور کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائیگا۔ تاکہ کسی غیر زبان کے مصنف کے الفاظ و خیالات صرف مطالب کے لحاظ سے ہی نہیں۔ بلکہ اپنی لفظی حیثیت سے بھی منتقل ہو سکیں۔ اور اس جد و جہد کا اندازہ بھی ہو سکے۔ جو دوسرے ممالک کے کامیاب مصنفین نئے خیالات کو نئے انداز میں ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ تراجم زبان اور محاورے کے اعتبار سے قابل تقلید نہیں اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں بحیثیت مجموعی ندرت بیان و ترکیب کا مطالعہ ہر ادیب کے لئے فایدہ بخش ہو سکتا ہے۔

"لیلےٰ" اور "ساون رین کا سپنا" بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں

بہت سے شائقین ادب نے میرے ایک سین کے ڈرامے کو پسند فرمایا ہے۔ اور خواہش ظاہر کی ہے۔ کہ ہر اشاعت میں کم از کم اسی طرز کا۔ ایک مختصر اور مکمل ڈرامہ شائع ہوا کرے۔ میں اس ذرہ نوازی کے لئے ممنون ہوں۔ اور انشاءاللہ کوشش کرونگا۔ کہ مختلف موضوعات کے متعلق ایک مختصر ڈراما ہر اشاعت میں پیش نظر کر سکوں۔ حقیقت میں یہ طریقہ اس وقت یوروپ میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ کہ اب وہاں ڈرامے کی طوالت اور حالات متعلقہ کی وسعت ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے۔ البتہ اختصار کے ساتھ تنوع پیدا کرنا لازمی ہے اور یہی مشکل کام ہے۔

اسی اشاعت میں مرزا پھویا ایک خاص زندگی کا مرقع ہے۔ سوانح نگاری کا یہ طریقہ ایک زمانے میں یوروپ میں بہت پسندیدہ تھا۔ اور اسی قسم کی مرقع نویسی کی بدولت وہ مفید نتائج مترتب ہوئے۔ جو اس کے احیا اور تقلید کے لئے کافی دلیل ہو سکتے ہیں۔ خدا کرے یہ فن بہت سے جدت طراز ادیبوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہو۔

"ساشب کی معشوقہ" اپنی دلچسپ خصوصیتوں کے ساتھ اس بات کی کسقدر بدیہی مثال ہے کہ اوہام پرستی کی تہ میں بھی حقیقت میں واقعات ہی مخفی ہوا کرتے ہیں۔ اور شخصی اور قومی اعتقادات کی تاریخ کا مطالعہ کچھ کم دلکش نہیں ہے۔

ساون رین کے سپنے میں بوطم کی گفتگو ارادتاً غلط اور لایعنی زبان میں لکھی گئی ہے جو شیکسپیئر کی اصلی عبارت کے مفہوم اور بوطم کے متعلق اس کی کیفیت تخئیل پر مبنی ہے۔ ناظرین اس کو مترجم کے علم و مذاق پر محمول نہ فرمائیں۔

انگلیس ایک کامیاب ظرافت نگار کا نتیجہ فکر ہے۔ اور اس میں مذاق سلیم کا محرک تصور میں بھی سنجیدگی کو ہاتھ سے دینا روا نہیں رکھتا۔ یہ تو صرف ایک تمہید ہے۔ انگلیس [illegible] ہے۔

ایڈیٹر

تخلیقِ موسیقی

زمانہ میں کسی پہلو نہ تھا آغازِ موسیقی — صداؤں میں ترنم زا نہ تھی آوازِ موسیقی
ابھی ہر ساز تھا نا آشنائے رازِ موسیقی — کہیں ہنگامۂ محفل نہ تھی پردازِ موسیقی

مگر تھا جستجو میں عمر بھر سے پیرِ فرزانہ
ظہورِ نغمہ کے ارماں نے کر رکھا تھا دیوانہ

بہت ہی ایک دن کچھ جوش پر اس کی طبیعت تھی — سرِ سازِ طرب اک کوششِ پیہم کی شدّت تھی
نگاہِ شوقِ بیحد جان و تن سے بے مُروّت تھی — ہُوئی جب اتنی محویّت تو بالآخر یہ نوبت تھی

اِدھر تو ساز ٹوٹا اور اُدھر تارِ نفس ٹوٹا
ہُوا پابندِ نغمہ، رُوح کا اس کی قفس ٹوٹا

پھر اس کی رُوح آوازِ شکستِ تار میں مل کر — رواں کرنے لگی ہر ذرّہ میں موجِ طپش آور
نوا میں بھر دیا جادوئے سوزِ دل جسے سُن کر — اُٹھا جاتا ہے جی اس ہستیِ موہوم سے یکسر

عجب انجام ہے اس کا عجب آغاز ہے اس کا
حقیقت جان بے تابی ہے مسکن ساز ہے اس کا

نقاب پوش

(ایک سین میں ایک مکمّل ڈرامہ)

اشخاص

شاہد حسین ...... سراغرسان انسپکٹر خفیہ پولیس
صفدر .... شاہد حسین کا نائب
سدیا .... شاہد حسین کا ملازم
ڈاکٹر ضمیر
نقاب پوش ...... ؟

منظر۔ شاہد حسین کے گھر میں دفتر کا کمرہ

ہدایات:۔ رات کے گیارہ بجے ہیں کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور شاہد حسین داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ضمیر اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

شاہد حسین (ڈاکٹر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے) تو آپ جب اس بیمار کو دیکھ کر آئے تو یہ خط آپ کو اپنی میز پر ملا۔

ضمیر۔ (بڑی سنجیدگی سے) جی ہاں۔

شاہد حسین (خط کو پڑھتے ہوئے) "جس بیمار کو آپ ابھی ابھی دیکھ کر آرہے ہیں۔ اس کے خط و خال چلئے قد وضع قطع سے اگر آپ نے کسی شخص کو مطلع کیا تو آپ کی جان کی خیر نہیں۔"

شاہد حسین۔ (ڈاکٹر کو بنظر غائر دیکھتے ہوئے) آپ کو اس بیمار کو دیکھنے کے لئے بلانے کون آیا تھا۔

ضمیر۔ ایک نوجوان شخص جس کی وضع قطع اور گفتگو شریفانہ تھی۔

شاہد حسین۔ آپ کو وہ شخص کہاں لے گیا آپ نے وہاں جاکر کیا دیکھا۔

ڈاکٹر۔ وہ شخص مجھے ایک بند گاڑی پر جو دروازہ پر کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ سوار کر کے لے گیا۔ ایک تاریک کوچے کے موڑ پر گاڑی ٹھیرا دی گئی۔ اور مجھے پیدل چلنے کے لئے کہا گیا بہت سے تنگ و تاریک کوچوں میں سے ہوتے ہوئے ہم ایک مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مکان بہت وسیع تھا مگر تاریک۔ مَیں نے ایک کمرے میں بیمار کو ایک امیرانہ بستر

پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ اس کے سر پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس کا جسم شدت بخار سے تپ رہا تھا۔

شاہد حسین (سوچتے ہوئے) پھر

ڈاکٹر۔ وہ شخص صرف اشاروں ہی سے بات کرتا تھا جب میں نسخہ لکھ چکا۔ تو وہی شخص جو مجھے لایا تھا۔ مجھے ساتھ لیکر واپس ہوا مگر ایکے وہ راستہ نہ تھا۔ کیونکہ میں نے دروازہ سے نکلتے ہی گاڑی کو منتظر پایا۔ تاریکی میں سوائے کسی باغ کے گنجان درختوں کے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔

شاہد حسین (سوچتے ہوئے) ہوں ہوں پھر وہ شخص کہاں گیا۔

ڈاکٹر۔ مجھے مکان تک پہنچا کر اور فیس دیکر اسی گاڑی میں واپس ہو گیا

شاہد حسین۔ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

ڈاکٹر۔ (کتے کی طرف اشارہ کرکے) یہ کتا جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے

شاہد حسین (فوراً کچھ سوچکر) بہت بہتر آپ اس کتے کو آج شب بھر کے لئے میرے پاس چھوڑ جائیے میں کل صبح کسی وقت خود آپ سے مِل لونگا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (ہاتھ ملا کر رخصت ہوتے ہوئے) خدا حافظ۔ مگر اب یہ راز بتا دینے کے بعد میری جان خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔

شاہد حسین۔ آپ فکر نہ کریں میں سب انتظام کر لونگا۔

ڈاکٹر چلا جاتا ہے۔ شاہد حسین دروازہ بند کر کے کتے کو ایک کمرے میں بند کر دیتا ہے۔ اور خود میز کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے کچھ عرصے کے لئے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر کچھ سوچتا ہے۔ اور پھر اپنی ڈائری کچھ لکھنے کے لئے کھولتا ہے۔ اس میں اسے ایک خط ملتا ہے۔ جسے جلدی سے کھول کر پڑھتا ہے)

شاہد حسین۔ میری ڈائری میں یہ خط کس نے رکھا۔ کب رکھا کیسے رکھا؟ (غصّہ سے) کتنی دلیری ہے۔ شیر کی کچھار میں آکر شیر کو چھیڑنا۔ اور صاف بچ کر نکل جانا۔ یہاں کون آیا۔ ڈاکٹر ضمیر مگر اس نے تو میز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہاں تو پھر میرے آنے سے پہلے اس کمرے میں کوئی داخل ہوا۔ (تنگ آکر) مگر کس طرح . . . . سدیا . . . .

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاہد حسین فوراً ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تصویر کو ہٹاتا ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک دراز کو کھینچ کر ٹیلیفون کا آلہ نکالتا ہے)

کون؟ تھانہ۔ کیا۔؟ کس وقت حملہ کیا۔ چھ اور سات کے درمیان۔ پھر . . . جن ملزموں کو آج صبح میں نے گرفتار کیا تھا؟ اُن کو چھڑانے کے لئے . . . . ایک آدمی کے سر پر ایک سپاہی کی بندوق کے کُندے سے سخت چوٹ لگی۔ ہوں ہوں۔ پھر کیا ہوا۔ موٹر پر سوار ہو کر بھاگ گئے۔ سپاہی کیا کر رہے تھے۔ اب ان کو تلاش کر رہے ہیں؟ . . . . اچھا . . . . آتا ہوں۔ صفدر کو فوراً بھیجد میرے مکان پر . . . .

(پھر اسی طرح احتیاط سے ٹیلیفون کو تصویر کے پیچھے

رکھ کر اور دروازہ کھول کر آواز دیتا ہے) سدیا . . . . .

او سدیا . . . .

سدیا (دوسرے کمرے سے) کون ہے . . . .

شاہد حسین۔ کمبخت اِدھر آؤ۔

سدیا۔ حاضر ہُوا . . حضور۔ (سدیا آنکھیں ملتا ہُوا آتا ہے)

شاہد حسین۔ آؤ یہاں آؤ۔ (لیمپ کی طرف پشت کر کے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ سدیا سامنے کھڑا ہے)

شاہد حسین۔ تُم کیا کر رہے تھے۔

سدیا (پھر آنکھوں کو مل کر) جی . سو رہا تھا۔

شاہد حسین (اس کی آنکھوں کو دیکھ کر) جھوٹ مت بولو۔ تُم جاگ رہے تھے۔ تُم آج اس وقت تک کیوں نہیں سوئے بتاؤ۔

سدیا (گھبرا کر) جی قسم لے لیجئے۔ مَیں تو سو رہا تھا۔ ورنہ آپکی پہلی آواز پر ہی جواب نہ دے دیتا۔

شاہد حسین (ہنسکر) تمہارے جھُوٹ کا ایک اور ثبوت ہے۔ گویا تم نے پہلی آواز بھی سُنی تھی۔

سدیا (اور گھبرا کر) جی . . جی . . . . میں۔

شاہد حسین (زور سے) بتاؤ۔ میرے جانے کے بعد میرا کمرہ آج تم نے صاف کیا تھا۔

سدیا۔ (فوراً) جی ہاں مَیں نے خود صاف کیا تھا۔

شاہد حسین۔ تمہارے ساتھ اس وقت کون تھا۔

سدیا۔ میرے ساتھ کون ہوتا۔ یہاں اور ہے ہی کون۔

شاہد حسین (سدیا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر) ادھر آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ تم نے آج سونے سے پہلے اسکٹ بھی نہیں اُتاری

سدیا۔ جی بس یونہی پڑ رہا۔

شاہد حسین (ہاتھ بڑھا کر اور سدیا کی جیب سے تاش کے پتے نکالکر انہیں دیکھتے ہُوئے) بتاؤ تُم اس وقت تاش کس سے کھیل رہے تھے (اُس کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالکر) ہاں تو یہ کہو کہ آج بہت سی بازیاں جیتیں۔ تین روپے ۹ آنے شاباش بولو۔ تمہارے پاس اس وقت کون تھا۔

(سدیا خاموشی اور شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہے)

تُم باتوں سے نہیں مانو گے ؟

سدیا۔ جی شام کو دو تین دوست مل گئے تھے۔ اُنہیں کیساتھ کھیل رہا تھا۔

شاہد حسین۔ کون دوست۔

سدیا۔ یہی محلے میں رہتے ہیں۔

شاہد حسین۔ کون کون۔

سدیا۔ جی ڈپٹی صاحب کا ملازم ولایت اور چونگی کا چپراسی نذیر

شاہد حسین (پتّوں کو گنتے ہوئے) اور کون

سدیا۔ جی اور کوئی نہیں۔

شاہد حسین۔ پھر جھُوٹ بولا۔ بتاؤ تیسرا آدمی کون تھا۔ تمہارے پاس تیرہ پتّے ہیں یقیناً تم چار آدمی تاش کھیل رہے تھے۔

سدیا (مجبور سا ہو کر) جی اس شخص کو مَیں نہیں جانتا۔ شام کو

آیا تھا۔ ہمارے پاس تاش پیسے بھی تھا۔ بازی لگانے کے لئے پیسے بھی اسی نے دیئے۔

شاہد حسین (سوچتے ہوئے) ہوں ہوں جب تم کمرہ صاف کرنے کے لئے آئے تھے تو وہ کہاں تھا۔

سدیا۔ ہم سب کے سب آئے تھے میں کمرہ صاف کرتا رہا۔ اور پھر ہم باہر چلے گئے۔ اور تاش کھیلنے لگے۔

شاہد حسین (پھر اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے) جاؤ دیکھو وہ شخص اب بھی تمہارے کمرے میں ہے کہ نہیں پھر وہ وہاں نہیں ہوگا اچھا جاؤ۔ دیکھ تو آؤ۔ (پھر کرسی پر بیٹھ کر خط پڑھتا ہے)

"ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دو۔ ورنہ یاد رکھو۔ وہ ہاتھ جو یہاں تک پہنچ سکتا ہے اُسکے لئے تمہاری شاہ رگ تک پہنچنا مشکل نہیں"۔

ہوں۔ شاہد حسین ایسی دھمکیوں سے کبھی نہیں ڈرا۔

(سامنے کی کھڑکی کے پیچھے سے آواز آتی ہے)

آواز۔ مگر اب اسے ڈرنا ہی پڑیگا۔

(شاہد حسین فوراً میز کے دراز سے پستول نکالکر اس کی نالی کا رخ کھڑکی کی طرف کرتا ہے۔ اُسے ایک شخص باہر کی طرف کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا نظر آتا ہے)

شاہد حسین (زور سے) بس یہیں کھڑے رہو۔ ورنہ تمہاری لاش یہیں پڑی ہوئی نظر آئیگی۔

شخص (بہت زور سے) ہا ہا ہا ہا

(شاہد حسین فائر کرتا ہے۔ مگر پستول خالی ہے۔)

شاہد حسین۔ اُف۔

شخص (پستول کی نالی شاہد حسین کی طرف کرکے) اب کس کی لاش تڑپتی ہوئی نظر آئیگی میری یا تمہاری۔

(فوراً دروازہ کھلتا ہے۔ اور صفدر پستول ہاتھ میں لئے اور اسکی نالی اس شخص کی طرف کرکے کہتا ہے)

صفدر۔ تمہاری۔ پستول پھینکدو۔ ورنہ

(اتنے میں ایک اور نامعلوم شخص صفدر کی پشت پر پستول کی نالی کئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

نامعلوم شخص نمبر ۲۔ پستول پھینکدو۔ ورنہ۔

نمبر ۱۔ شاباش۔ (کھڑکی سے کود کر اندر آجاتا ہے۔ اور شاہد حسین کے قریب آکر بیٹھ جاتا ہے۔ صفدر مجبوراً بے بس ہے)

نامعلوم نمبر ۱۔ ہاں تو جناب انسپکٹر صاحب آپ ایسی دھمکیوں سے نہیں ڈرتے۔ سُنئے ابتک آپکو گٹھ کٹوں اُٹھائی گیروں اور اسی قسم کے کچے چوروں سے سابقہ پڑا ہے۔ اب ہوش میں آجایئے آپکا مقابلہ اس شہر کے سب سے بہادر سب سے خطرناک سب سے ہوشیار چوروں سے ہے۔ ہم آپکی جان نہ لینگے ہمیں مقابلہ میں لطف آتا ہے اب ذرا تکلیف فرمایئے اور ٹیلیفون پر حکم دیجئے۔ کہ ہمارے تینوں ساتھیوں کو جنہیں آپ نے آج صبح پکڑا ہے چھوڑ دیا جائے۔

شاہد حسین۔ اور اگر میں انکار کردوں تو۔

نمبر ۱۔ تو جس طرح وہ سرکاری حوالات میں قید ہیں۔ آپ تھوڑی دیر میں میرے تہ خانہ میں بند ہونگے۔

شاہد حسین (کچھ سوچکر) خیر آج صبح بازی میں نے جیتی تھی

اب کے پانسہ آپ کے ہاتھ لگا۔

(اٹھ کر ٹیلیفون کے پاس جانا چاہتا ہے)

نمبر ۱۔ آپ تکلیف نہ کیجئے مجھے تھانہ کا نمبر اور افسر کا نام بتایئے میں خود گفتگو کرونگا۔ (مسکرا کر) دیکھئے ٹیلیفون کی باتوں کے متعلق کسی دوسرے شخص کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔

شاہد حسین (پھر کچھ سوچکر اور ظاہری مجبوری سے) تو آپ خود ہی ٹیلیفون پر بات کر لیجئے۔ (سامنے دیوار پر لگے ہوئے ٹیلیفون کی طرف اشارہ کر کے) وہ ٹیلیفون موجود ہے نمبر ۱۸۲۹ / ۷ آپ پوچھ لیجئے پہرہ پر کون ہے۔

نامعلوم نمبر ۱۔ بہت خوب۔

(ٹیلیفون کا دستہ ہاتھ میں لیتا ہے)

(شاہد حسین میز کے تختے کے نیچے سے ایک بجلی کے بٹن کو دبا دیتا ہے۔ اور ایک آنکھ سے صفدر کو اشارہ کرتا ہے) شخص نامعلوم نمبر ۱ جونہی ٹیلیفون کے ڈائل پر انگلی رکھتا ہے بجلی کی کھلی ہوئی رو کی گرفت میں پکڑا جاتا ہے۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلتی ہے۔ شخص نامعلوم نمبر ۲ گھبرا کر اسکی طرف دیکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے صفدر سے غافل ہوتا ہے صفدر اِس موقع سے فایدہ اٹھا کر فوراً اس کے پستول پر مکہ مارتا ہے۔ پستول گر پڑتا ہے۔ وہ آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔

شاہد حسین فوراً مدد کو پہنچکر اُسے گرا دیتا ہے)

شاہد حسین (صفدر سے) میری میز کے دراز سے ہتھکڑی نکالو اور اس کے ہاتھوں میں ڈال دو۔

صفدر۔ بہت بہتر۔

(صفدر ہتھکڑی نکالکر نمبر ۲ کے ہاتھوں میں ڈال دیتا ہے)

شاہد حسین۔ لو اب تم اسے سنبھالو میں اپنے دوسرے ناخواندہ مہمان کی تواضع کرتا ہوں۔

(دوسری ہتھکڑی لیکر نمبر ۱ کے ہاتھوں میں ڈال دیتا ہے اور اس کی زنجیر صفدر کے ہاتھ میں دیکر پھر میز کا بٹن دبا دیتا ہے۔ بجلی کے بند ہو جانے سے نمبر ۱ بجلی کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے)

صفدر لاؤ ایک زنجیر مجھے دیدو۔ (زنجیر لیکر) چلو جلدی چلو میں بھی تمہارے ساتھ تھانے کو چلونگا۔ (باہر کا دروازہ کھول لیتے ہیں۔ مگر دروازہ کھلتے ہی ایک نقاب پوش شخص پستول کی نالی سامنے کئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

نقاب پوش۔ (ایک مہیب آواز میں) ان کو چھوڑ دو۔

(شاہد حسین اور صفدر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر نقاب پوش کے دونوں ہاتھوں میں دو پستول دیکھکر رک جاتے ہیں)

نقاب پوش۔ جلدی بہت جلدی۔ ہتھکڑی کی چابی نکالو۔ اور ان کو آزاد کر دو۔

(شاہد حسین بامر مجبوری دونوں ہتھکڑیاں کھول دیتا ہے)

نقاب پوش۔ (نمبر ۱ و نمبر ۲ سے) ہا ہا ہا ہا۔ اب ان دونوں بہادر سراغرسانوں کو عزت سے کرسیوں پر بٹھا کر باندھ دو۔

نقاب پوش (نمبر ۱ کو ایک پستول دیکر) لو ان کا خیال رکھو۔ میں ایک ضروری کام کر لوں (دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو ہٹا کر دراز میں سے ٹیلیفون کا آلہ نکالتا ہے اور تھانہ کے افسر سے بات کرتا ہے)

"میں شاہد حسین ہوں۔ جن چوروں کے متعلق ابھی ابھی تم نے مجھے اطلاع دی تھی۔ اُن کو حوالات میں رکھنا خطرناک ہے مجھے اطلاع ملی ہے۔ کہ اُن کے ساتھی اُن کو چھڑانے کیلئے رات کو پھر حملہ کرینگے۔ اس لئے تم ان کو وہاں سے نکال کر باغ کے راستے میرے مکان پر لے آؤ۔ باقی کارروائی صبح ہو گی مجھے جلدی کرو۔ دو سپاہی کافی نہیں"

(پھر ٹیلیفون کو اسی طرح رکھ دیتا ہے)

انسپکٹر صاحب اگر آپ ہمارا کام خود ہی کر دیتے۔ تو ہمیں یہ تکلیف نہ کرنی پڑتی۔ اب ہم جاتے ہیں۔ خدا حافظ۔ اب کل صبح تک اسی طرح آرام فرمایئے۔ ہاں اپنے ملازم پر خفا نہ ہو جیئے۔ وہ بیچارہ کلوروفارم کے اثر سے باورچی خانہ میں بیہوش پڑا ہے۔ اور اس وقت آپ کے کام نہیں آسکتا۔ اچھا اب پھر کسی دن ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔

(دروازہ کھول کر تینوں چلے جاتے ہیں)

شاہد حسین۔ (اسی طرح بے بسی کی حالت میں سوچتے ہوئے) یہ نقاب پوش کون تھا۔ یہ آواز میں نے کہیں سنی ہے کیا ڈاکٹر ضمیر؟ وہی قد، وہی آواز؟ اُف کس قدر دھوکا ہوا انگلاس کا گتا۔ خیر دیکھا جائیگا . . . . . .

ایڈیٹر

مرزا پھویا

(ایک مطالعہ)

مرزا پھویا کے آبا و اجداد چودھویں صدی عیسوی میں کاظمین سے نقل و حرکت کرتے ہوئے کابل کی مضافات میں آباد ہوئے۔ اور شیر گڑھ میں مستقل اقامت اختیار کی۔ یہاں تین پشت تک حکمت کے بل پر عزّت و آبرو سے بسر کرتے رہے۔ دو دو پیسے کے نسخے لکھ کر مستقل آمدنی کی سبیل کی۔ اور باپ دادا کے فرسودہ قلمی اوراق کو حرزِ جان بناتے رہے۔ اور گرد و پیش کے دیہات میں رئیسوں میں شمار ہونے لگے۔ احمد شاہ دُرّانی کے حملوں نے شیر گڑھ کے مرزاؤں کے دِل میں بھی گدگدی کی اور بنی بنائی آبرو کی دُکّان اور بڑھتے ہوئے کام کو چھوڑ درّانی کے تلنگوں کے ساتھ پایۂ تخت دہلی کا رُخ کیا۔ حکمت کا نسخہ ایسا ہاتھ آیا تھا۔ کہ ہندوستان کی راج گردی میں جب کہ بنے بناتے خاندان بگڑ رہے تھے۔ اور اس خانوادے کے آدمی جہاں جاتے لوگ ہاتھوں چھاؤں لیتے تھے اور سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ ہندوستان میں نو آباد ہونے کے باعث ان لوگوں نے بہ سعیِ بلیغ اپنا نسلی امتیاز قائم رکھا۔ اور پشت ہا پشت تک دہلی، الور، آگرہ میں بسنے کے باوجود اُنھوں نے رشتے ناطے میں اپنے کُفو کے خیال کو قدامت پسندی کی شان کے ساتھ قائم رکھا۔ لیکن ہندوستان میں آکر معاش کی خاطر سرگرداں ہونا پڑا۔ خاندان کے سب سے بڑے بیٹے کو تو دقیانوسی کتابوں کی حفاظت اور حکمت کا اثاثہ ورثے میں ملتا رہا۔ لیکن باقی اولاد فوجی ملازمت اور درباری پیشکاری میں اُلجھ کر اپنی خصوصیّات کھو بیٹھی۔ چونکہ ان کے تمام رشتے اپنے خاندان میں ہی ہوتے رہے۔ اور ماموں پھوپھیوں۔ چچا خالاؤں کی اولاد آپس ہی میں عقد و پیوند کے سلسلے میں منسلک ہوتی گئی۔ اِس لئے مردانگی کے جوہر تو قدرتی قانون کے ماتحت ماند پڑتے گئے۔ البتہ نسلی کمزوریاں آپس کے رشتوں سے زیادہ نمایاں ہوتی گئیں ۱۲۰۳ھ کے چڑھتے ہی محرم کی تیسری تاریخ کو مرزا پھویا عفی عنہ پشت ہا پشت کی آپس کی رشتہ داری کا زبون اثر لئے ہوئے پیدا ہوئے۔ اسی تاریخ کو شہیدِ اعظم کا مدینہ سے کوفہ کی جانب ایفاءِ عہد میں سر دینے کے لئے عزمِ سفر ہوا تھا۔ اور خاندانِ رسالت کے درخشاں گوہر ایک ہفتے کے

اندر دشت کرب و بلا میں تہ خاک ہو گئے تھے پس مرزا پھویا کی ولادت پر نغمۂ شادی ہنگامۂ محرم میں ایسا غائب ہوا۔ کہ کسی کو مرزا کے والد سے محض کلمۂ تہنیت کہنے کا بھی حوصلہ نہ ہوا۔

ننھے مرزا غالباً اپنے ماں باپ کے پہلے بچے تھے۔ محرم کی پیدائش ہونے کے باعث سب کے دل میں وہم تھا۔ کہ اللہ میاں بچے کو دنیاوی صدموں سے محفوظ رکھے۔ مرزا پھویا کی پھوپھی نے دل کا شبہ دور کرنے کے لئے بچہ کی سلامتی حیات کی خاطر حضرت عباس کا علم چڑھایا۔ خالہ اماں نے ہر سال محرم میں مرزا کو شہدائے کربلا کا سقہ بنانے کی منت مانی۔ دادی اماں نے بیوی فاطمہؓ کی صحنک کر کے محلہ کی بیبیوں کو محفل عزا میں مدعو کیا۔ اور مرزا پھویا کے لئے علموں کے سایہ میں دعا مانگی گئی۔ مرزا کے ماموں عشرہ کے روز مرزا کو ذوالجناح کے نیچے سے گذارنے کے لئے امام باڑے میں لے گئے بارے لوگوں کے ڈرانے سے کہ چلتے کے اندر بچے کو ذوالجناح کے پاس لے جانا سوئے ادبی ہے۔ مرزا پھویا جلوس میں شریک نہ کئے گئے۔

چھ سال تک مرزا کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ گھر میں بھی ذرا مرزا کا ماتھا گرم ہوتا۔ کہ ایک تعویذ چاندی میں مڑھ کر مرزا کے گلے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ننھے مرزا کو ڈاکٹر حکیم کی تیز ادویات کا حریف نہ سمجھ کر ہر مرض میں ٹونے ٹوٹکے پر اکتفا کی جاتی تھی۔ مرزا کی نسبت سال بھر کی عمر میں ہی اُن کی خالہ کی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ لیکن باقاعدہ منگنی کی رسم چھٹے سال ادا کی گئی۔ اور ایک ساتھ ہی بچارے مرزا کی بسم اللہ بھی کر دی گئی۔ (مرزا کے چچا جو لاہور میں ڈاکٹری پڑھتے تھے مصر ہوتے کہ مرزا کی ختنہ بھی ابھی ہو جائے۔ لیکن اس خبر کے سنتے ہی مخدراتِ عصمت نے ڈولیوں کی ڈبل کمپنی میں آراستہ ہو کر صمصام مرزا پر ایسی یلغار کی۔ کہ بچارے اگلا پچھلا ڈاکٹری علم سب بھول گئے۔ وہیں ایک زنانہ کونسل بیٹھی جس میں فیصلہ ہوا۔ کہ "ہرگاہ کہ مرزا پھویا سلمہ اللہ تعالےٰ ابھی کم سن ہیں۔ اور ختنہ کی جراحت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے نویں سال سے پیشتر اس مسئلہ کو ہرگز ہرگز معرض بحث میں نہ لایا جائے۔")

مرزا پھویا کو اب تک تو گھر کی مستورات نے ہاتھوں چھاؤں رکھا تھا۔ اب جو مکتب میں داخل کرنے کی نوبت آئی۔ تو ایک ملازم کی تلاش ہوئی۔ جو مرزا کے ساتھ ہی پہلی جماعت میں داخل کر دیا جائے۔ اور ہر وقت مرزا کے ساتھ رہے۔ قصہ کوتاہ اس اہتمام کے ساتھ مرزا پھویا مکتب میں داخل ہوئے۔ ایک روز مرزا ماسٹر جی کے سوال کے جواب میں صمٌ بکمٌ کھڑے رہے۔ تو انہیں بھی غصہ آیا۔ انہوں نے

ذرا مرزا کے کان سہلاتے۔ گھر میں پرچہ گزرا کہ آج مُوئے اُستاد نے مار مار کر ننھّے مرزا کے دُشمنوں بیریوں کو ادھ مُوا کر دیا"۔ دوسرے روز سے مرزا کا مکتب میں جانا بند ہُوا اور گھر پر مُلّاجی سے پڑھنے کا انتظام کیا گیا۔

دو سال تو یوں غارت ہوئے تیسرے سال مرزا دوسری جماعت میں پھر داخل کئے گئے۔ اور مدرسہ کے ماسٹر کو پرائیویٹ طور پر گھر پر پڑھانے کے لئے ملازم رکھا گیا۔ تاکہ پہلے اُستاد مرزا کو پھر مدرسہ سے علیحدہ نہ کر دے۔ مرزا تیسری جماعت میں ہوتے۔ اور ختنہ کے لئے نیک ساعت سُبھ گھڑی تجویز ہوئی۔ اور سکول سے پھر ایک ماہ کی چھٹی لی گئی۔

مرزا چوتھی جماعت میں تھے۔ کہ شہر میں طاعون پھیلا مرزا کو فوراً اماں کے ساتھ ہندوستان کی سرحد سے پار پارہ چنار بھیج دیا گیا۔ واپسی پر بغیر امتحان دئے ہیڈ ماسٹر کی عنایت سے مرزا کو پانچویں جماعت میں باریاب کیا لیکن موذی وبا طاعون کی ایسی آئی۔ کہ ہر سال مرزا کو اسکول سے اُٹھا کر دریائے اٹک کے پرلے کنارے جانا پڑتا۔ مرزا بدن کے نحیف لیکن دماغ کے ذکی تھے۔ مگر مرزا باوجود ہر سال دو دو مہینے کے رخنے کے ہر جماعت میں کام چلاتے رہے۔ حتےٰ کہ انٹرنس کے امتحان کی نوبت آئی۔ اور گھر میں مرزا کی خالہ اور باجی نے قرآن خوانی اور دُعاؤں پر زور دیا۔ مرزا نے جوں توں کرکے انٹرنس کیا۔ اور انہیں کالج میں بھیجنے کی تیاری ہُوئی۔ مرزا کے ماموں تو مصر تھے۔ کہ انہیں کوئل[1] بھیجا جاتے۔ لیکن مستورات کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ ننھّے مرزا پردیس میں بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دئے جائیں۔ جہاں نہ کوئی خویش نہ ہمدرد طرح طرح کے لونڈے۔ قسم قسم کی تکلیفیں انٹرنس تک پڑھا۔ بہت پڑھا۔ اللہ کمانا نصیب کرے۔ سات پشتوں میں کسی نے انگریزی اسکول کا مُنہ نہ دیکھا تھا۔ انٹرنس تک کی تعلیم کیا تھوڑی تھی۔ مرزا خاندانی آدمی تھے۔ غدر میں دادا نانا نے بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ ایجرٹن صاحب اور منٹگمری صاحب کے سرٹیفکیٹ حاصل کئے تھے۔ اگر حضور لاٹ صاحب کی بارگاہ میں درخواست کی جائے۔ تو ڈپٹی کلکٹری ملنی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مرزا کے دادا بنارس میں کوتوال رہے تھے۔ تھانیداری میں نام تو فوراً منظور ہو سکتا تھا۔ مگر مرزا پھوپھی پولیس کی نوکری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد مرزا کو دہلی کالج میں داخل کرانے کی ٹھہری۔ کیونکہ وہاں مرزا کے ماموں سررشتہ دار تھے۔ اسی لئے خیال ہُوا۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کی زحمت سے مرزا محفوظ رہیں گے۔

مرزا کالج میں داخل ہوتے۔ یکبارگی تعلیم کی

[1] علیگڑھ کا پُرانا نام۔

کتابوں میں مرزا کی ہمت سے زیادہ بیشی ہوگئی۔ مرزا روز صبح اٹھ کر ایک درجن کارڈ تو اپنے عزیزوں کو لکھا کرتے تھے۔ اور نصف درجن خطوط شاعرانہ مذاق کے ساتھ اپنے سکول کے دوستوں کو لکھتے تھے۔ جس کے آخر میں جلد جواب بھیجنے کی تاکید ہوتی تھی۔ اس کے بعد دو چار کتابیں اُٹھا کر کالج چلے جاتے تھے۔ رات کے وقت مرزا نے کبھی لیمپ کی روشنی میں مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور گھر والے بھی یہ نہ چاہتے تھے۔ کہ لیمپ کی مدھم روشنی میں مرزا اپنی آنکھوں کو خراب کریں۔ ان کی خطوط نویسی ہی گھر والوں کے نزدیک کالج کے مطالعہ میں شمار ہوتی تھی۔ اور وہ ہر روز کالج کی مصروفیت کا رونا رو کر اپنے عزیزوں کی ہمدردی حاصل کیا کرتے تھے۔ ابھی کالج میں داخل ہوتے دو مہینے ہی گزرے تھے۔ کہ مرزا کو موسمی بخار نے آدبایا۔ اور مرزا کی بیماری نے وہ طول کھینچا۔ کہ کالج سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اکثر مستورات کا تو خیال تھا۔ کہ انٹرنس چونکہ مرزا نے کم سنی میں پاس کرلیا ہے۔ اس لئے نظرِ بد کا اثر ہوا ہے۔ کوئی کہتا مرزا کو ان کی ممانی دشمنی سے ایسے گھر میں سُلاتی رہی ہے۔ جہاں عبدالرحمٰن جن کا گزر ہے۔ مرزا کو آسیب ہوگیا ہے۔ کوئی کہتا مڈل تک کی تعلیم کیا تھوڑی تھی۔ مرزا کے والد بھی تو گھر پر پڑھکر ہی نائب تحصیلداری کے امیدوار ہو گئے تھے۔ ننھے مرزا بچارے کو انٹرنس کرانا کون ضرور تھا۔ غرضکہ مرزا کے والدین نے اپنے کئے پر پشیمان ہوکر دل میں عہد کیا۔ کہ اب ننھے مرزا کو کالج کی ہوا نہ لگنے دینگے۔

مگر مرزا کو کالج کی زندگی کا مزا پڑ گیا تھا۔ نہ کوئی نگران نہ کوئی پرسان کہ بھائی کتنا پڑھا۔ محنت سے کیوں نہیں پڑھتے۔ پروفیسر دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ ساتھ چاء پلاتے تھے۔ سیر کے لئے اپنے ساتھ نظام آباد تغلق آباد تک لے جاتے تھے۔ ٹینس ساتھ کھیلتے تھے۔ اسکول کی بات تو تھی نہیں۔ کہ ماسٹر جی کو دیکھا اور دم نکلا۔ دوسرے روز اسکول میں بھی سبق نہ یاد ہونے پر فرماتے تھے۔ کہ کل سبق یاد کرتے وقت تو قصہ خوانی کرتے بازار میں آوارہ پھر رہے تھے۔ سبق کیا خاک یاد ہو۔"

مرزا غسلِ صحت کرتے ہی پھر کالج میں جا داخل ہوئے مگر صحت کمزور تھی۔ چار روز کی چپقلش سے پھر بخار ہو گیا۔ اب طبیبوں کا علاج شروع کیا گیا۔ تو اُنہوں نے مرضِ سل تشخیص کیا۔ کالج کو پھر چھوڑنا پڑا۔ مرزا کے دوستوں نے الوداعی ایڈریس دیا۔ اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ مرزا پھوپیا ہر ایک کے گلے ملتے تھے۔ اور یوں روتے تھے۔ گویا ہجرت کر کے چلے ہیں۔

مرزا کے لئے کالج سے جانا دافعی وطن سے ہجرت کرنا تھا۔ مرزا نے جاتے ہوئے اپنے تمام ناول اور

انگریزی فارسی کی نظم کی کتابیں اپنے دوستوں کو تحفہ میں دیں اور ہر کتاب کے سرورق پر لکھا "غریب الوطن مرزا پھویا کا ہدیۂ نیاز"۔ "متاعِ حیات صف شکن علی شاہ کی خدمت میں نذرِ محقر"۔ "جب 'اِن میموریم' پڑھنا تو میری مرحوم دوستی پر صدقہ آہ چڑھانا"۔ "ان اوراق کا مطالعہ تمہیں سکوتِ تغافل میں میری یاد دلائیگا"۔ "یہ جریدہ معرفت مفارقتِ صوری کے زمانے میں اِسی خاکسار کی یاد کا ذریعہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ۔

مرزا کئی سال تک نحیف و زار انسانی زندگی کے آلام و افکار پر گھر بیٹھے مضامین لکھتے رہے۔ انکی نوحہ خوانی پبلک میں مقبول تھی۔ جب کبھی لمبا مضمون تحریر فرماتے تھے تو حرارت ایکسو ایک درجہ پر پہنچ جاتی۔ اور حکیم صاحب تشخیص کرتے۔ کہ سل کے جراثیم کثرتِ ریاضت کے باعث کمزور تھیلیوں کو پھاڑ کر خون میں پھیل گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے تپ ہوگئی ہے۔ صحت کو ہمیشہ اس قدر مضبوط رکھنا چاہیئے۔ کہ جراثیم آنتوں کی تھیلیوں میں بند رہیں۔ جب کامل طاقت آجائیگی۔ تو خون سے غذا نہ ملنے کے باعث جراثیم خود بخود مرجائینگے۔ مرزا مجبوراً شعر کہنا اور مضمون لکھنا قطعی بند کر دیتے تھے۔ لیکن جب ان کا فسانہ باف دماغ معطل رہتا تھا۔ تو انہیں پریشان کن خواب نظر آنے لگتے تھے۔ اور وہ اپنی خوابوں ہی سے کہانیوں کا مصالحہ فراہم کرکے مضمون لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے ایک خدارسیدہ دوست نے انہیں یقین دلادیا تھا۔ کہ کم و بیش ہر انسان ملہم ہوتا ہے۔ اور تزکیۂ نفس کے مراحل طے کرنے کے بعد انسان اللہ تعالےٰ سے مکالمہ و مخاطبہ کا شرف حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنی خوابوں کو الہامی سمجھ کر اپنی فراغت کے ایام میں "رویاء مرزا" کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین شائع کرنے کی دُھن میں سرگردان رہنے لگے۔ کالج سے دُور رہنا ان کی صحت کے لئے چنداں مفید نہ ہُوا۔ آخر چار سال کی فراغت کے بعد انہیں پھر کالج کا شوق چرایا۔ اور اس دفعہ وہ علی گڈھ کالج میں داخل ہوئے۔ کیونکہ حسنِ اتفاق سے ان کے بہت سے ادبی دوست بھی علی گڈھ میں بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کررہے تھے

علیگڈھ میں سوسائٹی کی کمی نہ تھی۔ مرزا اگرچہ فسٹ ایئر میں تھے۔ لیکن فورتھ ایئر سے کمتر درجہ کے طلباء میں رہنا وہ اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ ادبی محفلوں میں وہ تحریری مضامین پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ زبانی تقریر کرنے سے انہیں اس قدر پسینہ آتا تھا۔ کہ نقاہت کے باعث غشی کی نوبت ہوجاتی تھی۔ اور پھر ایک ہفتہ تک بخار پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ ادبی مضامین کے علاوہ کبھی کبھی فارسی اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ جو کمرے کی چھتیاں چڑھا کر

اپنے منتخب احباب کو ہی سُنایا کرتے تھے لیکن ہر ادبی ہنگامہ کے بعد مرزا کو دو چار روز کی چھوٹی بیماری کے بہانے سے مل جایا کرتی تھی۔ مرزا کی ادبی شہرت نے انہیں کالج میں ہر دلعزیز تو بنا دیا تھا لیکن دو سال کے اختتام پر یونیورسٹی امتحان میں ناکام رہکر مرزا کے وقار میں کمی آگئی تھی۔ مرزا اپنے تئیں امتحانوں کے ناقابل سمجھ کر دُعاؤں پر زور دیا کرتے تھے۔ دوستوں اور عزیزوں میں بھی اُنہوں نے اپنے لئے دُعا کرانے کا عام اشتہار دے رکھا تھا۔ چونکہ وہ آہستہ خرامی کے عادی ہو گئے تھے اس لئے ایک سال امتحان میں رہ جانا انہیں زیادہ پریشان نہ کرتا تھا۔ جوں توں کر کے مرزا نے چھ سال میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تو یار دوستوں نے انہیں ایل ایل بی میں پڑھنے کا مشورہ دیا لیکن مرزا قانونی کتابوں کو رٹنے کی ہمّت اپنے میں نہ پاتے تھے۔ اس لئے استخارہ کر کے وہ چُپکے سے لاہور کے ایک کالج میں ایم۔ اے کلاس میں داخل ہو گئے۔ ایم۔ اے کی تعلیم ہر پریشان مزاج کے لئے دماغی عشرت ہُوا کرتی ہے۔

اگرچہ اسکول چھوڑے انہیں دس سال ہو گئے تھے لیکن تعلیمی مذاق ابھی تک تازہ تھا۔ لاہور میں بھی انہیں ایک کشتی کے کئی ملاح مل گئے۔ جنھوں نے قیام کالج کے دوران میں ایسے بہت سے دوستوں کو الیف۔ اے سے لیکر ایم۔ اے تک تعلیم کے مراحل سے پار اتارا تھا۔ لیکن خود کالج چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ مرزا پھویا ہمیشہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے اطمینان کے لئے روزانہ خطوط لکھا کرتے تھے۔ اور ان کے جواب بلا ناغہ نہ ملنے پر شکایتوں کے طومار خطوں میں اور زمانہ کی سرد مہری کا گلہ مضامین میں ہُوا کرتا تھا۔ آخر ایک دُنیا کی دعاؤں اور پروفیسروں کی مہربانی سے مرزا پھویا ایڑیاں رگڑ کر جوں توں کر کے ایم۔ اے کے مرحلے سے بھی گزر گئے۔

پنجاب گورنمنٹ کے فارسی دفتر میں انگریزی خوان فارسی منشی کی ضرورت تھی۔ دونوں صفات کا یکجا ہونا ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تعلیم میں مشکل ہے۔ مرزا پھویا اپنے وقت کا خون کر کے فارسی کتب کا مطالعہ اپنا مذاق پُورا کرنے کے لئے جاری رکھتے تھے۔ اور مضامین کے ذریعہ ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ میر منشی کی سفارش سے منصرم کا عہدہ انہیں پیش کیا گیا۔ ان کے لئے لاہور کی رہائش اور مستقل ملازمت جس میں ادبی زندگی کی چاشنی بھی تھی۔ ہزار غنیمت تھی۔ تین سال اس ملازمت میں نیک نامی سے گزارے۔ چیف سکرٹری بہادر کی نظروں میں چڑھ گئے۔ اکسٹرا اسسٹنٹی کی درخواست لاٹ صاحب کی بارگاہ سے منظور ہُوئی۔ اور ڈپٹیوں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن آخر لاہور چھوڑنا پڑا۔ یہ صدمہ

ناقابلِ برداشت تھا۔

مرزا پھویا کو پہلے ہی پہل بندوبست کا کام سیکھنے کے لئے سرحدِ پنجاب پر راجن پور میں تعینات کیا گیا۔ اس سے پہلے بھلا مرزا کی تمام نفیس زندگی میں ایسا سابقہ کاہے کو پڑا تھا۔ کہ مٹی کی گرمی میں "منشی منقا" نائب تحصیلدار بندوبست کی شاگردی میں جریب اُٹھلئے پٹواری کا کام سیکھتے پھریں۔ بندوبست کے اٹل قانون کے ماتحت یہ ضروری تھا۔ کہ مرزا کو جریب کشی سے لیکر تشخیصِ مال کے تمام مراحل سکھلاتے جائیں۔ مرزا میں جہاں اور طبعی کمزوریاں قابلِ مذمت حد تک جمع ہو گئی تھیں۔ وہاں ایک خوبی یعنی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کی عادت بھی انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ بندوبست کے کام میں یوں تو صعوبات گرداوری ہوتی ہی ہیں۔ لیکن سرکارِ انگلشیہ کا عہدِ عتیق کا دیرینہ نمکخوار طبقہ، تعلیم یافتہ امیدوار کو ملازمت سے بیدل کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتا۔ چنانچہ مرزا پھویا ان کے شکنجہ میں ایسے آتے۔ کہ پہلے سابقہ ہی میں ملازمت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے مایوس ہو گئے۔ کھیتوں میں جریب کشی۔ پٹوار خانوں میں جمعبندی۔ دفتر میں ماہواری نقشوں کی تیاری اور اس پر کچہری کے اندر قلم گھِسے ہوئے منشیوں کی حکومت سے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے۔ اور بجائے ماہوار داخل خارج کے نقشے تیار کرنے کے مکمل نوحہ غم مرتب کر کے انہوں نے نام بنام دوستوں کو بھیجنا شروع کیا۔ جب دوستوں کی طرف سے محنت کی بہت تاکید ہوئی۔ تو غریب مرزا پھویا اختلاجِ قلب کا بہانہ کرتے کرتے سچ مچ ہی بیمار ہو گئے دل میں یہ ٹھان کر کہ مکتب پڑھا کر اکل حلال کمانے سے بڑھ کر اور عزتِ نفس کو قائم رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ مرزا استعفے دیکر گھر واپس چلے آئے۔

مرزا پھویا کی طبعی نازک مزاجی اور نادرست صحت کے ہوتے مرزا کے کالج سے نکلتے ہی خاصے روزگار کے بن پڑنے اور فوری ترقی سے مرزا کے دوست حیران تھے۔ کہ یہ شخص جو دُنیا فہمی میں محض اُمّی تھا۔ کس طرح دیانت کا پیسہ کمانے کے قابل ہو گیا۔ مگر یہ محض ایک اتّفاق تھا۔ کہ مرزا کو ابتدا میں ان کے مذاق کے مطابق ملازمت مل گئی جس میں چڑیا چنونے کی کہانی لکھ کر وہ فراغت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن بندوبست کی پہلی ہی کڑی منزل میں مرزا دم چھوڑ گئے۔

اب ان کے خیرخواہوں نے انہیں ادبی رسالہ جاری کر کے قلم کے زور سے ایک عالم کو تسخیر کرنے کی صلاح دی۔ مرزا دھن کے پکے ہر کام بوجہ احسن تکمیل کو پہنچانا چاہتے تھے۔ ایک کتاب انہوں نے دو ہزار روپیہ صرف کر کے

"رویا مرزا" کے نام سے شائع کی۔ بہترین کاغذ اور بہترین کتابت کا انتظام کیا۔ لیکن سوائے دس پانچ دوستوں کے کسی نے مرزا کے "دُرِّ مکتوم" کی طرف توجّہ نہ کی۔ اور کتاب دیمک کا ناشتہ اور مرزا کا سکنی مکان قرضے کی نذر ہوا۔ رسالہ جاری کرنے میں جس قدر زیر باری ہُوئی وہ تو ایک طرف اور صوبہ کے حریف رسائل نے جو تنقید کا سلسلہ شروع کیا اس نے مرزا کا جگر شق کر دیا۔ اور مرزا مضامین کی تیاری میں خون اُگلنے لگے۔ بارے چار نمبر مشکل سے شائع ہوئے۔ کہ موصولہ مضامین کا ذخیرہ ختم ہُوا۔ اور مرزا کا ذہنی اثاثہ بھی تمام ہو گیا۔ مرزا جو طالب علمی کے زمانے میں لنڈھور بن سعدان کی داستان کی طرح طویل مضامین لکھنے کے لئے مشہور تھے۔ اب دُشمنوں کی معمولی جراحت کے بھی حریف نہ ہو سکے۔ مخالف تنقید پڑھ کر پیچ و تاب کھاتے لیکن ان سے جواب بن نہ آتا تھا۔ عذر کے طور پر کہا کرتے تھے۔ کہ مضمون آفرینی جوانی تک ہے۔ اور رنگینیٔ مضامین ولولہٴ جذبات کے ساتھ وابستہ ہے۔ بیاہا آدمی ایک سے لیکر نو تک کے ہندسوں سے کل کائنات کا حساب دُرست رکھ سکتا ہے۔ پوسٹ آفس۔ انکم ٹیکس اور محکمہ مال کی ملازمت کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ چاہو۔ کہ کوئی معقول مضمون اس کے قلم سے نکل جائے۔ تو یہ محال محض ہے۔ مَیں اپنا دل و دماغ۔ ذکاوت و ذہانت۔ مذاقِ صحیح اور جوشِ طبعی کو اپنی بیوی کو حق مہر میں دے چکا ہوں۔ اب اگر میرے دوست مجھ سے یہ چاہیں۔ کہ زمانۂ طالب علمی کی طرح انکے تفریح کا سامان بہم پُہنچاؤں۔ تو یہ انکی نافہمی کی دلیل ہے"۔

بے روزگاری نے مرزا کا ناک میں دم کر دیا لیکن قرض کا دروازہ کھُلا تھا۔ کچھ وقت سو کر کچھ رو دھو کر اور جو بچ رہتا وُہ فرسودہ دیوانوں کی چھان بین میں صرف کر دیتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ "مجھے قرض دینے والے نہایت ہی فرشتہ طینت ہیں اور قدرے بیوقوف بھی۔ کیونکہ مجھ سے واپسی کی امید تو اُنہیں ہے نہیں البتہ دوستی کو نبھاتے جا رہے ہیں"۔

(افضل علی)

رشک

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
مَیں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے — غالب

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آئے — غالب

حسد

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا — ذوق

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو — غالب

سانپ کی معشوقہ

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ اساڑھ کا پہلا بادل برس کر نکل گیا تھا حشرات الارض چاروں طرف رینگتے نظر آتے تھے۔ تلوتما نے کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھا۔ تو درخت ایسے نکھرے ہوئے معلوم ہوئے۔ جیسے کاتک کی چاندنی۔ ان پر ایک رُوحانی شگفتگی نظر آتی تھی۔ جیسے اہل معرفت کیف باطن سے مست کھڑے ہوں۔ چڑیاں بھی معمول سے زیادہ شوخ ہو گئی تھیں۔ ایک لمحہ بھی ایک ٹہنی پر قرار نہ تھا۔ ڈال ڈال، پات پات چہکتی اور پھدکتی پھرتی تھیں۔ تلوتما باغ میں نکل آئی۔ وہ بھی انہیں چڑیوں کی طرح چنچل ہو گئی تھی کبھی اس پودے کو دیکھتی کبھی پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑے ہوئے مینہ کی بوندوں کے چھینٹے اپنے مُنہ پر ڈالتی بیر بہٹیاں ادھر اُدھر رینگ رہی تھیں۔ انہیں چُن کر ہتھیلی پر رکھنے لگی۔ دفعتاً اُس نے ایک سیاہ جسم کو رینگتے ہوئے دیکھا۔ چلّا کر بولی "امّاں امّاں" ناگ جی جا رہے ہیں۔ لاؤ تھوڑا سا دودھ کٹورے میں رکھدوں۔

ماں نے کہا۔ جانے دو بیٹی۔ ہوا کھانے نکلے ہونگے۔

تلوتما۔ گرمیوں میں کہاں چلے جاتے ہیں دکھائی نہیں دیتے

ماں۔ کہیں جاتے نہیں بیٹی۔ اپنی بانبی میں پڑے رہتے ہیں۔

تلوتما۔ اور کہیں نہیں جاتے؟

ماں۔ بیٹی ہمارے دیوتا ہیں۔ اور کہیں کیوں جائینگے؟ تمہاری پیدائش کے سال سے یہ برابر یہیں رہتے ہیں کسی سے نہیں بولتے۔ بچّہ پاس سے نکل جائے۔ نظر تک نہیں اٹھاتے۔ آج تک ایک چوہیا بھی نہیں پکڑی

تلوتما۔ تو کھاتے کیا ہونگے۔

ماں۔ بیٹی یہ لوگ ہوا پی کر رہتے ہیں۔ اسی سے روشن ضمیر ہو جاتے ہیں۔ انہیں ماضی وحال کا یکساں علم ہوتا ہے۔ کوئی بڑا صاحب کمال فقیر جب غرور کرنے لگتا ہے۔ تو اُسے سزاءً سانپ کا جنم لینا پڑتا ہے۔ جبتک سزا کی میعاد پُوری نہیں ہوتی۔ تب تک وُہ اسی قالب میں رہتا ہے۔ بعض بعض تو سو سو برس تک زندہ رہتے ہیں۔

تلوتما۔ ان کی پوجا نہ کی جائے۔ تو کیا کریں؟

ماں۔ بیٹی کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ ناراض ہو جائیں تو سر پر نہ جانے کیا بلا نازل کر دیں۔ جس سال تمہارا جنم

ہُوا تھا۔ یہاں پہلے پہل نظر آئے تھے۔ تب سے سال میں دس پانچ بار ضرور درشن دے جاتے ہیں۔ ان کی ایسی دُعا ہے۔ کہ آج تک کسی کے سر میں درد تک نہیں ہُوا۔

(۲)

کئی سال گذر گئے۔ تلوتما کا شباب آیا۔ دوشیزگی کے دن رُخصت ہوئے۔ کلی کھل کر پھُول ہوئی۔ شادی کا مبارک دن آپہنچا۔ برات آئی۔ رسمیں ادا ہوئیں۔ اور تلوتما کی رُخصتی کی مہورت آپہنچی۔

تلوتما پر اضطراب کا عالم طاری تھا۔ سہیلیوں کی چٹکیاں اُسے مطلق نہ بھاتی تھیں۔ وہ اکیلی بیٹھکر رونا چاہتی ہے۔ آج ماں باپ، بھائی بند۔ سکھیاں سہیلیاں سب چھوٹ جائینگی۔ پھر نہ معلوم کب ملنے کا اِتّفاق ہو۔ نہ جانے یہ لوگ کس مزاج کے ہونگے۔ امّاں کے آنسو ایک لمحہ کے لئے بھی نہ تھمینگے۔ مَیں ایک دن کے لئے کسی کے گھر چلی جاتی تھی۔ تو وہ رو رو کر ہلکان ہوجاتی تھیں۔ اب ہمیشہ کی جُدائی اُن سے کیونکر برداشت ہوگی۔ اُن کے سر میں درد ہوتا تھا۔ تو جبتک مَیں آہستہ آہستہ نہ ملوں۔ انہیں کسی کل چین ہی نہ آتا تھا۔ بابوجی کو اب پان بناکر کون دیگا۔ مَیں جبتک کھانا نہ پکاؤں اُنہیں کوئی چیز مرغوب ہی نہ ہوتی تھی۔ اب اُن کا کھانا کون پکائیگا۔ یہاں میرے سر میں ذرا سا درد ہوتا تھا۔ تو امّاں اور بابوجی گھبرا جاتے تھے۔ فوراً وید حکیم بُلائے جاتے تھے۔ وہاں نہ جانے کیا حال ہوگا۔ بند کمرے میں کیسے رہونگی۔ معلوم نہیں وہاں کھُلی چھت ہے یا نہیں۔ ہوگی بھی تو مجھے کون سونے دیگا۔ اندر گھُٹ گھُٹ کر مرونگی۔ سوکر اُٹھنے میں ذرا دیر ہو جائیگی تو طعنے ملیں گے۔ یہاں صبح کو کوئی جگاتا تھا۔ تو امّاں کہتی تھیں سونے دو۔ کچّی نیند جاگ جائیگی تو سر میں درد ہونے لگیگا۔ وہاں جلی کٹی باتیں سُننے کو ملینگی۔ بہو کاہل ہے۔ دن بھر پلنگ پر پڑی رہتی ہے۔ کیا ستم ہے۔ کہ ماں باپ پال پوس کر جوان کریں۔ اور جب لڑکی اس قابل ہو کہ والدین کی کچھ خدمت کرسکے۔ تو باہر کا ایک آدمی آئے اور اُسے زبردستی، اُس کی منشا کے خلاف اُڑا لے جائے۔ وہ (شوہر) دیکھنے میں تو نیک معلوم ہوتے ہیں۔ دل کا حال کون جانے کہیں غُصّہ ور یا تنک مزاج ہوئے۔ تو میری زندگی دُوبھر ہوجائیگی۔ چڑیا ہوتی تو کہیں اُڑ جاتی۔ سب لوگ ڈھونڈھتے رہ جاتے۔

دفعتہً اُس کی ماں نے آکر کہا۔ بیٹی تُم سے ایک بات کہنی ضروری ہے۔ وہاں ناگ پُوجا ضرور کرتی رہنا۔ گھر کے اور لوگ چاہے منع کریں۔ پر تُم اسے اپنا فرض خیال کرنا ابھی میری آنکھیں ذرا جھپک گئی تھیں۔ ناگ جی نے خواب میں درشن دئے۔

تلوتما۔ امّاں مجھے بھی ان کے درشن ہُوئے ہیں۔ پر مَیں نے

تو بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا۔

ماں۔ دیکھنا تمہارے گھر میں کوئی سانپ نہ مارا جائے۔ یہ جنتر لو۔ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔

تلوتما ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی۔ کہ ناگاہ بارات کی طرف سے گریہ وزاری کی صدائیں آنے لگیں۔ ایک لمحہ میں کہرام مچ گیا۔ ایک سانحہ عظیم ہو گیا۔ نوشہ کو سانپ نے ڈس لیا۔ وہ بہو کو رخصت کرانے آرہا تھا۔ پالکی میں مسند کے نیچے ایک کالا سانپ چھپا ہوا تھا۔ نوشہ جونہی پالکی میں بیٹھا سانپ نے کاٹ لیا۔

چاروں طرف نالہ و شیون کی دلدوز صدائیں پھیل گئیں۔ تلوتما پر تو بجلی سی گر پڑی۔ ماں سر پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ اس کے باپ بابو جگدیش چندر فرط الم سے بیہوش ہو کر گر پڑے۔ سانپ کا منتر جاننے والے آئے۔ جھاڑ پھونک ہوئی۔ ڈاکٹروں نے آکر نشتر لگائے دوائیں دیں۔ پر زہر قاتل تھا۔ ذرا دیر میں نوشہ کے ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ناخن سیاہ ہو گئے۔ غش آنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ ادھر آسمان پر صبح نمودار ہوئی۔ اُدھر نوشہ کا جنازہ اُٹھا۔

جیسے کوئی آدمی بوروں سے لدی ہوئی کشتی پر بیٹھا ہوا جھنجھلاتا ہے۔ کہ یہ اور تیز کیوں نہیں چلتی۔ کہیں آرام سے بیٹھنے کی جگہ نہیں۔ اسقدر ہل کیوں رہی ہے گویا کسی بڈھے کا سر ہے۔ یا کھلونے کی بڑھیا۔ ناحق اس میں بیٹھا۔ پر سوء اتفاق سے جب کشتی کسی بھنور میں پڑ جاتی ہے یا تند اور مخالف موجیں اُسے زیر و زبر کرنے لگتی ہیں۔ تو وہ اس کے مستول سے چمٹ جاتا ہے۔ بادبان کی رسیاں پکڑ لیتا ہے۔ وہی حالت تلوتما کی تھی۔ ابھی تک وہ صدمہ فراق سے بے تاب تھی۔ سُسرال کی تکلیفوں کا خیال کر رہی تھی۔ پر اب اُسے ہوش آیا۔ کہ ان سب تکلیفوں کے باوجود کشتی مجھے ندی سے پار تو لئے جاتی تھی۔ ایک لمحہ قبل وہ دل میں جس آدمی کو کوس رہی تھی۔ جسے ڈاکو رہزن اور غارتگر سمجھ رہی تھی۔ وہ اب اُسے ساری دُنیا سے پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے بغیر اب زندگی بجھی ہوئی شمع تھی یا ایک درخت بے برگ و بار۔ ایک لمحہ پہلے وہ دوسروں کیلئے باعثِ رشک تھی۔ اب مایۂ درد اور قابلِ رشک۔

(۳)

ایک سال گزر گیا۔ بابو جگدیش چندر دین پرست راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ اصلاح تمدن کی تحریکوں کو مہلک سمجھتے تھے۔ پر تلوتما کی بیوگی کا صدمہ نہ برداشت کر سکے تلوتما کے عقد ثانی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ہنسنے والوں نے تالیاں بجائیں۔ خوب انگشت نمائیاں ہوئیں۔ پر وہ اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ تلوتما پر سارا گھر فدا ہوتا تھا۔

اس کی منشاء کے بغیر کوئی بات نہ ہونے پاتی۔ حتےٰ کہ وہ گھر کی مالک بنادی گئی تھی۔ یہی دھیان رکھتے تھے کہ اس کا رنج تازہ نہ ہونے پاتے۔ لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک بیکسی سی چھائی رہتی تھی۔ جسے دیکھکر بابوجی کا جگر ٹکڑے ہو جاتا تھا۔ پہلے تو اُس کی ماں بھی اس انحراف تمدن پر رضامند نہ ہوئی۔ لیکن برادری والوں کی مخالفت جوں جوں زور پکڑتی گئی۔ اُس کی مخالفت کمزور ہوتی گئی۔ اصولاً تو شاید بہت کم لوگوں کو بابو صاحب سے اختلاف تھا۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنا دوسری بات تھی۔ قول اور فعل کی مناسبت ذاتی معاملات تک ضروری سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ وسیع حلقوں میں اس کی ضرورت کے لوگ قائل نہیں ہوتے بالآخر کئی مہینوں کی دوا دوش کے بعد ایک با اصول، روشن طبع، تعلیم یافتہ نوجوان شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔ تلوتما کو ساری قوم میں اپنی تشہیر دیکھکر رنج ہوتا تھا۔ وہ دل میں کڑھتی تھی۔ بابوجی ناحق میرے لئے یہ دردسر خرید رہے ہیں۔ اگر میری تقدیر میں سہاگ لکھا ہوتا۔ تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ اُسے کبھی کبھی ایک القا سا ہوتا تھا۔ کہ میں ہمیشہ اسی طرح رہونگی جب شادی طے ہوگئی اور منگیتر کی تصویر اس کے سامنے آئی۔ تو اس کے کلیجہ میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ کتنا متین، کتنا شگفتہ چہرہ تھا۔ کیسے خط و خال پیشانی سے ذہانت اور الوالعزمی ٹپک رہی تھی۔ وہ تصویر کو لئے ہوئے ماں کے پاس آئی۔ اور بولی۔ امّاں مجھے مُنہ تو نہ کھولنا چاہیئے۔ پر موقع ایسا ہے۔ کہ خاموش نہیں رہا جاتا۔ آپ بابوجی سے کہدیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مَیں اسی میں خوش ہوں۔ مجھے ایسا خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں وہی سانحہ . . . .

ماں نے خائف نگاہوں سے دیکھکر کہا۔ بیٹی کیسی بدفالی مُنہ سے نکالتی ہو۔ تمہارے دل میں خوف سما گیا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے خیال پیدا ہوتے ہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیا ایشور کو ہم سے کوئی دشمنی ہے؟

تلوتما۔ ہاں مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ماں۔ کیوں تمہیں ایسے خیال گھیرے رہتے ہیں۔

تلوتما۔ کیا جانے کیوں کوئی میرے من میں بیٹھا ہوا کہہ رہا ہے۔ کہ اِس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ مَیں اکثر بُرے بُرے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ راتوں کو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی شخص جس کی صورت سانپ سے بہت مشابہ ہے۔ میری چارپائی کے چاروں طرف گھومتا رہتا ہے۔ مَیں خوف کے مارے کسی سے کہتی نہیں۔ دم سادھے لیتی ہوں۔

ماں نے سمجھا لڑکی کو وہم ہوگیا ہے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ یہ محض تلوتما کا عقد ثانی نہ تھا۔ بلکہ اصلاح تمدن کی ایک عملی مثال تھی۔ حامیانِ اصلاح دُور و قریب سے آنے لگے۔

(۴)

شادی ویدوں کے قاعدہ سے ہوئی۔ مہمانوں نے خوب تقریریں کیں۔ بابو جگدیش چندر کے اخلاقی جرأت کی تعریف ہونے لگی۔ تیسرے دن رخصتی کی ساعت تھی۔

جنواسے میں ہر ایک ممکن احتیاط سے کام لیا گیا تھا برقی روشنی سے سارا جنواسا دن ہوگیا تھا۔ زمین پر رینگتی ہوئی چیونٹیاں بھی نظر آتی تھیں۔ فرش میں نہ شکن تھی، نہ جھول، شامیانے کے چاروں طرف قناتیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ کسی طرف سے کیڑے مکوڑوں کے آنے کا احتمال نہ تھا۔ مگر شدنی تھی وہ ہو کر رہی۔

صبح کے چار بجے تھے۔ تاروں کی برات رخصت ہو رہی تھی۔ ایک طرف شادیانے تھے۔ تو دوسری طرف آہ و بکا بھوگی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پر تلوتما کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وقت نازک تھا۔ وہ کسی طرح گھر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ سکھیوں سے گلے ملنا محض نمائش معلوم ہوتی تھی۔ ہر لحظہ کھٹکا ہوتا تھا۔ کہ کہیں کوئی سانحہ نہ ہو جائے۔ نوشہ نیند سے جاگا اور جوتے میں پیر ڈالا ہی تھا۔ کہ چیخ کر پیر کھینچ لیا۔ معلوم ہوا پیر آگ کی چنگاری پر پڑ گیا۔ دیکھا تو ایک کالا سانپ جوتے میں سے نکل کر رینگتا ہوا چلا جاتا تھا۔ چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ نوشہ نے ایک آہ سرد بھری اور بیٹھ گیا۔ دنیا اُس کی نگاہوں میں تاریک ہوگئی۔

دم کی دم میں جنواسے میں خبر پھیل گئی۔ مجمع ہوگیا۔ ادویات کا پہلے ہی سے انتظام کیا گیا تھا۔ اس فن کے کئی ماہر جمع تھے۔ سبھوں نے دوائیں دیں۔ جنتر منتر کئے۔ کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ تلوتما نے سُنا تو سر پیٹ لیا۔ ایک وحشت کے عالم میں برہنہ پا اور بے نقاب گھر سے نکلکر جنواسے کی طرف چلی۔ وہ اپنے شوہر کے قدموں پر گرنا چاہتی تھی۔ گھر کی عورتوں نے روکا۔ ماں نے بھی باچشم تر سمجھایا۔ لیکن بابو جگدیش چندر نے کہا۔ کوئی ہرج نہیں جانے دو۔ ایک بار تو پتی کا دیدار ہو جائے۔ یہ آرزو کیوں دل میں رہے۔ تلوتما اسی وارفتگی کے عالم میں جنواسے پہنچی۔ مگر وہاں اُس کی تشفی کے لئے صرف مرنے والے کا دم واپسیں تھا۔ اُن ادھ کھلی آنکھوں میں درد اور التجا کا ایک دفتر تھا۔ اور یاس و حسرت کا ایک افسانۂ دلگداز

(۵)

یہ سانحہ فسانہ ہوگیا۔ مادیات کے قائل سرگوشیاں کرتے یہ ماجرا کیا ہے؟ روحانیات کے بندے عارفانہ انداز سے سر ہلاتے تھے۔ گویا انہیں علم غیب ہے۔ جگدیش چندر

اب تقدیر پر شاکر ہو بیٹھے۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ لڑکی کی تقدیر میں بیوہ رہنا ہی لکھا ہے۔ ناگ کی پوجا سال میں دو بار ہونے لگی۔ تلوتما کی مزاج میں ایک نمایاں تغیر ہوا شباب کے دن روزہ اور ریاضت میں صرف کرنے لگی۔ مایوسوں کا یہی سہارا ہے:

تین سال گزر گئے۔ بات گئی گزری ہو گئی تھی لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر دیارام نے پھر اس افسانہ کو تازہ کیا۔ وہ حیوانیات کے ماہر تھے۔ حشرات کے عادات و خواص کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ شادی کا پیغام بھیجا۔ جگدیش چندر نے حیلہ وحجت سے کام لیا۔ دیارام اور بھی مصر ہوئے۔ لکھا میں نے ایک معرکۃ الآرا علمی تحقیقات کی غرض سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کینہ پرور زہریلے سانپ سے لڑنا چاہتا ہوں۔ میں نے ازالۂ زہر کیلئے ہر ایک ممکن تدبیر کر لی ہے۔ سانپ اگر سو دانت لے کر بھی آئے۔ تو مجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔ وہ مجھے کاٹ کر خود مر جائیگا۔ اگر بصورتِ محال کاٹ ہی لے۔ تو میرے پاس ایسے آلے اور ادویات ہیں۔ جن سے میں چشم زدن میں اس کے زہر کو رد کر سکتا ہوں۔ آپ اس کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں زہر سے مصون ہوں۔ جگدیش چندر کو اب عذر کی گنجائش نہ رہی۔ ہاں مزید احتیاط کے لئے انہوں نے یہ انتظام کیا۔ کہ شادی سے ایک ہفتہ قبل ڈھاکہ پہنچ گئے۔ چلتے وقت اپنے صندوق بستر وغیرہ خوب احتیاط سے رکھے۔ کہ کہیں سانپ ان میں چھپ کر نہ بیٹھ جائے۔ وہاں ایک دن فال نیک دیکھ کر شادی ہو گئی تعجب یہ تھا۔ کہ تلوتما نے اب کے ایک بار بھی انکار نہ کیا اُسے اب خوشی کی امید نہ تھی۔ اس لئے غم کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ وہ یاس کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی۔ جب دل میں کوئی حس ہی نہیں باقی رہتا۔ سوکھی گھاس کے لئے پانی اور آگ دونوں یکساں ہیں۔

شادی کے دوران میں کوئی حادثہ نہ ہوا۔ تلوتما رو دھو کر سسرال گئی۔ جگدیش چندر گھر لوٹ آئے۔ پر ایسے فکرمند تھے۔ جیسے کوئی آدمی سرائے میں اپنا صندوقچہ کھلا چھوڑ کر بازار چلا جائے۔

تلوتما کے مزاج میں اب ایک عجیب انقلاب ہوا۔ وہ گھر کے اور آدمیوں سے ہنستی بولتی، آرام سے کھاتی پیتی، سیر کرنے جاتی، جلسوں میں شریک ہوتی۔ نوکروں سے اخلاق سے پیش آتی۔ بصورتِ ظاہر دیارام سے بھی خلوص اور محبت کا برتاؤ کرتی۔ ان کے آسائش کا ہمیشہ خیال رکھتی۔ کوئی کام اُن کے مزاج کے خلاف نہ کرتی۔ پروفیسر صاحب فضول خرچ آدمی تھے۔ تلوتما نے اپنے حسن انتظام سے آمد و خرچ میں مساوات کی صورت پیدا کی۔ ہر اجنبی آدمی اُسے دیکھ کر کہتا تھا۔ عورت ہو تو ایسی ہو۔ اُن کی

زندگی قابل رشک معلوم ہوتی تھی لیکن اصلی حالت کچھ اور ہی تھی۔ عالم خلوت میں اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو جاتی۔ بھنویں تن جاتیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ جسم توا ہو جاتا پلکیں کھلی رہ جاتیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے نتھنے پھڑکتے۔ اور اُن میں سے جھلستی ہوئی لپٹیں نکلتیں چہرہ کچھ سیاہ سا پڑ جاتا۔ اور گو صورت میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ پر معلوم نہیں کیوں اُس پر ناگن کا گمان ہوتا کبھی کبھی پھنکارنے بھی لگتی۔ اس حالت میں دیارام کو اُسکے قریب یا اس سے کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ اس کے حسن پر صرف اسکے حسن پر شیدا تھے۔ مگر اس عالم میں انہیں اس سے نفرت ہوتی۔ اُسے اسی ہیجان کے عالم میں چھوڑ کر خود باہر نکل آتے۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ خود فزیالوجی اور پیتھالوجی اور خدا جانے کن کن علوم کا مطالعہ کیا۔ پر یہ عقدہ نہ کھلا۔ طبیعیات کے حدود کا قائل ہونا پڑا۔

انہیں اب اپنی زندگی وبال معلوم ہوتی تھی۔ اپنی جسارت پر پچھتاتے۔ ناحق اس عذاب میں جان پھنسائی۔ انہیں گمان ہونے لگا۔ کہ اس پر ضرور کوئی آسیب ہے باطل پرست نہ تھے۔ مگر عقل کی انتہا ہی باطل پرستی ہے۔ استدلال اور استقرا کا آخر اوہام کا آغاز ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہوئی۔ کہ ہمیشہ تلوتما سے خائف رہتے۔ اُس کی وہ طیش کی صورت اُن کے ذہن سے نہ اُترتی۔ انہیں ایسا وہم ہونے لگا کہیں یہ مجھے ہلاک نہ کر دے۔ نہ جانے کب جنون کا دورہ ہو ہمیشہ اسی میں مبتلا رہتے۔ ہپناٹزم، برقیات، وغیرہ نئی طبی ایجادوں کا استعمال کرایا۔ انہیں ہپناٹزم سے امید تھی۔ کہ ضرور فایدہ ہوگا۔ پر جب یہ نسخہ بھی کارگر نہ ہُوا۔ تو وہ مایوس ہو گئے۔

(۶)

ایک روز پروفیسر دیارام کسی جلسہ میں گئے تھے۔ لوٹے تو بارہ بج گئے۔ بارش کے ایام تھے۔ نوکر چاکر سب سو رہے تھے۔ وہ عادت کے خلاف تلوتما کی خوابگاہ میں یہ پوچھنے گئے۔ کہ میرا کھانا کہاں رکھا ہُوا ہے۔ مگر اندر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ تلوتما کے سرھانے کی طرف اُنہیں ایک نہایت جسیم سیاہ سانپ بیٹھا ہُوا نظر آیا۔ پروفیسر چپکے سے لوٹ آئے۔ اپنے کمرہ میں جا کر کسی دوا کی ایک خوراک پی۔ اور پستول اور نیزہ لیکر پھر تلوتما کے کمرہ میں پہنچے۔ یقین ہو گیا یہ وہی پُرانا، میری جان کا دُشمن، کینہ پرور سانپ ہے۔ اِتنے دنوں میں سراغ لگاتا ہُوا یہاں تک پہنچا ہے۔ پر اس موذی کو تلوتما سے کیوں اتنا تعلق ہے۔ اس کے سرھانے یوں بے ضرر بیٹھا ہُوا تھا۔ گویا رسّی کا ٹکڑا ہے۔ یہ کیا راز

ہے؟ اُنھوں نے سانپوں کے متعلق عجیب و غریب افسانے پڑھے تھے۔ حیرت خیز روایتیں سُنی تھیں۔ پر ایسا بعید از قیاس و وہم ماجرا کبھی ان کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ وہ یوں مسلّح ہوکر پھر کمرہ کے اندر گئے۔ تو رقیب کا پتہ نہ تھا۔ ہاں تلوتما پر جنون کا غلبہ ہوگیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی شعلہ بار نظروں سے دروازہ کی طرف گھُور رہی تھی۔ اس کے نتھنوں سے آگ کے ذرّے نکل رہے تھے ان کی حرارت دو گز کے فاصلہ سے محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت جنون معمول سے زیادہ تند تھا۔ دیارام کو دیکھتے ہی تلوتما بجلی کی طرح لپکی۔ بجائے ہاتھوں سے حملہ کرنے کے اُنھیں دانتوں سے کاٹنے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کی گردن میں حلقہ ڈال دیا۔ دیارام نے ہر چند گلا چھُڑانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ حلقہ لحہ بہ لحہ سانپ کے حلقوں کی طرح مضبوط اور تنگ و سخت ہوتا جاتا تھا۔ اُدھر یہ خوف تھا۔ کہ اُس نے مجھے کاٹا تو غالباً اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ اُنھوں نے وہ دوا پی تھی۔ جو سانپ کے زہر سے زیادہ قاتل تھی۔ اس پنجۂ مرگ میں پھنسے ہُوتے اُنھیں خیال پیدا ہُوا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے! تاہل کی ذمہ واریاں تو سب موجود' اس کی خوشیوں کا نام نہیں۔ ان کے بدلے یہ خلجان' یہ خطرۂ جان' یہ سوہان رُوح' یہ اسرار کیا ہے۔ یہ سانپ کوئی آسیب

تو نہیں ہے۔ جو اس پر غالب آکر اس کی یہ حالت کر دیتا ہو' کہتے ہیں آسیب سے پیدا ہونے والی مدہوشی میں معمول پر جو حملہ کیا جاتا ہے۔ اُس کا اثر آسیب ہی پر پڑتا ہے۔ نیچی ذاتوں میں اس کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ انہیں حسرتناک خیالوں میں غرق تھے۔ کہ اُن کا دم گھٹنے لگا۔ تلوتما کے دونوں ہاتھ آہنی شکنجوں کی طرح ان کو کچلے ڈالتے تھے۔ وہ بیکس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ اس مصیبت سے نجات کیونکر ہو کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی۔ سانس لینا دشوار ہوگیا' جسم شل ہوگیا اعضا ڈھیلے پڑگئے۔ پیر تھرّانے لگے۔ دفعتہً تلوتما نے ان کے بازوؤں کی طرف مُنہ بڑھایا۔ دیارام کانپ اُٹھے۔ دل نے کہا۔ یہ اس وقت انسان نہیں ناگن ہے قاتل' زہریلی' بے رحم ناگن ہے۔ اس کے زہر سے جان بچنی مشکل ہے۔ بے ضرر چوہا دیوانہ ہوکر کاٹ لیتا ہے۔ تو جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اُف! کتنی ہیبتناک صورت ہے۔ بالکل ناگن معلوم ہورہی ہے۔ نگاہیں کتنی سفاک ہیں۔ ہرچہ بادا باد۔ اس زندگی سے تو مرجانا ہی اچھا ہے۔ انہیں معلوم ہُوا اب گرا ہی چاہتا ہوں۔ تلوتما بار بار سانپ کی طرح زبان نکالتی تھی۔ قریب تھا۔ کہ وہ دیارام کے بازو میں دانت چُبھا دے۔ کہ وہ چیخکر بولے۔ اگر تونے مُنہ نہ ہٹا لیا۔ تو اسی وقت تیری گردن مروڑ دونگا۔ تلوتما اینٹھکر بولی۔

"ظالم تیری اتنی جرأت کہ تو اس حسینہ کو ہولناک نظروں سے دیکھے۔ یہ کہکر وہ پھر منہ کھولکر لپکی تب دیارام نے داہنے ہاتھ کو سیدھا کیا۔ اور تلوتما کے سینہ پر پستول داغ دیا۔ پر اس کا کوئی فوری اثر نہ نظر آیا۔ گرفت اور بھی سخت ہوئی۔ آنکھیں اور بھی شرربار ہوئیں۔ یہ زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔ نازک احساسات کہاں؟ دیارام نے پستول کی دوسری گولی داغی۔ یہ زخم کاری پڑا۔ شکنجہ ڈھیلا ہوا۔ ایک لمحہ میں تلوتما کے ہاتھ نیچے کو لٹک گئے۔ سر جھک گیا، اور وہ لاشہ بے جان کی طرح زمین پر گر پڑی۔

تب وہ نظارہ دیکھنے میں آیا جس کی نظیر شاید الف لیلہ اور حاتم طائی اور طلسم ہوشربا کی داستانوں میں بھی نہ ملیگی۔ وہیں پلنگ کے پاس زمین پر ایک کالا جسیم سانپ پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے سینہ اور منہ سے خون جاری تھا۔

دیارام کو آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ یہ کیا طلسم ہے۔ کیا راز ہے۔ انہوں نے نیزہ سے سانپ کے جسم میں ایک کونچا مارا۔ اور اسے اٹھا کر باہر آنگن میں لائے سانپ بے دم ہوگیا تھا۔ اسے اپنے کمرہ میں لے گئے۔ اور ایک خالی صندوق میں بند کر دیا۔ پھر تلوتما کے کمرے میں گئے کہ دیکھوں اس کی کیا حالت ہے۔ خوف کے مارے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اب اپنی جان کا خطرہ نہ تھا۔ بلکہ ایک خونیں نظارہ کا۔ ہاں یہ خیال کچھ باعث تسکین تھا۔ کہ سانپ مر گیا ہے۔ تو تلوتما کی جان بچ گئی ہو۔ باطل نے حق کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی امید و بیم کی حالت میں انہوں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ تو تلوتما آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔

دیارام کو کونین کی دولت مل گئی۔ تلوتما کا چہرہ شگفتہ تھا۔ یہ شگفتگی انہیں آجتک کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف مسکراتی ہوئی بڑھی۔ اور بولی۔ آج اتنی رات تک کہاں رہے؟

دیارام نے آج پہلی بار اسے گلے سے لگایا۔ اور بولے۔ ایک جلسہ میں چلا گیا تھا۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے کہیں درد تو نہیں ہے؟

تلوتما نے ان کی طرف پیار کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ سینہ میں خفیف سا درد ضرور ہے۔ لیکن میں آج جیسی خوش ہوں ایسی کبھی نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ میں کسی باطنی مرض سے شفا پا گئی ہوں"۔

پریم چند

فریبِ دولت

(۱)

منشی محمد لطیف نے اخبار ہاتھ سے رکھدیا۔ اور حقے کی نے منہ سے لگاکر کسی گہری سوچ میں غرق ہوگئے اِس وقت اُن کی نگاہیں زمین کی طرف تھیں لیکن خیالات آسمان میں اُڑ رہے تھے۔ وہ غریب آدمی تھے۔ اُن کی تنخواہ صرف چالیس روپے ماہوار تھی۔ لیکن اُنھوں نے کبھی شکوۂ روزگار نہیں کیا۔ انہیں جو کچھ مل جاتا تھا۔ وُہ اُسی پر صابر و شاکر تھے۔ اور طبیعت کے سادہ تھے۔ دل کے نیک۔ اخراجات کی پریشانی میں بھی اُن کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ جس طرح چاند کالی بدلیوں میں بھی چمکتا رہتا ہے

لیکن آج اخبار میں ایک مختصر خبر دیکھکر اُن کی قناعت پر زوال آگیا۔ سویڈن کے ایک باورچی کے نام گیارہ لاکھ کی لاٹری نکلی تھی۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوا۔ گویا یہ خبر اُن کے لئے خضرِ راہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے کالم میں ڈنمارک کی لاٹری کا اشتہار تھا محمد لطیف کا دل رقص کرنے لگا جس طرح کالی گھٹا کو دیکھکر مور ناچنے لگتا ہے۔ اس وقت اُن کو ایسی خوشی ہوئی۔ گویا بھولے ہوئے مسافر کو ہزاروں پگڈنڈیوں میں سے ایک سیدھا راستہ مل گیا۔ اُن کو یقین ہوگیا۔ کہ اِس لاٹری کا انعام میرے نام نکل آنا یقینی امر ہے۔ برسوں کی قناعت آنِ واحد میں غائب ہوگئی۔ اُنہوں نے اخبار کو پھر ہاتھ میں لیا اور اُس میں محو ہوگئے۔ اتنے میں اُن کی بیوی زینب نے آکر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور نرمی سے پُوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو"؟

محمد لطیف نے آنکھیں بند کرلیں۔ گویا اُنھوں نے کوئی ایسا خوشگوار منظر دیکھا تھا۔ جسے وہ بھولنا نہیں چاہتے۔ اور جواب دیا۔ "کچھ نہ پوچھو"۔

زینب نے حیرت سے کہا۔ "کوئی ایسی بات ہے"؟

"تم سمجھ ہی نہیں سکتیں"؟

"تو آپ ہی بتادیں"۔

محمد لطیف نے سنجیدگی سے اخبار ہاتھ میں لے لیا اور بولے "میں لاٹری کا ٹکٹ خریدنے والا ہوں"۔

"کتنے روپے خرچ ہونگے"؟

"پچیس"

زینب چونک کر رہ گئی۔ جیسے کوئی عجیب بات سُن لی ہو پچیس روپے کا ٹکٹ خریدنا اُس کے لئے ایسی فضولخرچی تھی۔ جو گناہ کی حد تک پہنچتی تھی لیکن شوہر کے پاسِ خاطر

سے اُس نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ تاہم چہرہ دل کا آئینہ ہے محمد لطیف پر صورت حال روشن ہو گئی۔ ساتھ ہی اپنے افلاس اور تنگدستی کا خیال آ گیا۔ اِس خیال سے اُن کی چلتی ہوئی زبان رُک گئی۔ انہوں نے بیوی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا اُن سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ ہچکچاتے ہوئے بولے "مجھے یہ جوا کھیل لینے دو۔ میرے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ کہ لاٹری میرے نام ضرور نکل آئیگی"۔

زینب انکار نہ کر سکی۔ اُس کے پاس پیسہ پیسہ کر کے بچائے ہوئے پچپن روپے تھے۔ ان سے وہ اپنے لئے کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوانا چاہتی تھی۔ مگر خاوند کی خاطر اس نے یہ خیال دل سے دُور کر دیا۔ اور روپے میاں کے حوالے کر دئے۔ قسمت کی بساط پر پانسہ پھینکا گیا۔

(۲)

محمد لطیف کو دن رات لاٹری کا خیال رہنے لگا۔ رات کو سوتے سوتے چونک اُٹھتے۔ دن کو دفتر میں کام کرتے کرتے بے چین ہو جاتے۔ چٹھی رسان کو دیکھ کر اُن کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ تار والا نظر آ جاتا۔ تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔

اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔ محمد لطیف اور زینب ہر وقت بے چین و مضطرب رہنے لگے جس طرح طالبعلم امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے گھبرا جاتا ہے۔ اب اُن کو تنخواہ لیکر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ امید نے اطمینانِ قلب میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ ہوس صبر کی دشمن ہے۔ جہاں جاتی ہے صبر کو بھگا دیتی ہے۔ جب کئی دن گذر گئے۔ اور کوئی اطلاعی تار موصول نہ ہوا۔ تو مایوس ہو گئے۔ دل نے کہا۔ یہ خیال چھوڑ بھی۔ اب اِس میں رکھا ہی کیا ہے۔ مگر امید نے ڈھارس دی۔ اور جن لوگوں کو انعام ملتا ہے۔ وہ کیا آسمان سے تھوڑے اُترتے ہیں"۔

رات کا وقت تھا محمد لطیف اور ان کی بیوی چھت پر لیٹے ہوئے اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔ اِن تین چار مہینوں میں اُن کا خرچ بے حد زیادہ ہو گیا تھا لاٹری کی امید نے حوصلے فراخ کر دئے تھے۔ اس لئے اُن پر قرض چڑھ گیا تھا۔ زینب سوچتی تھی کیا ہو گا؟ دس روپے بنئے کے دینا ہے۔ پندرہ بزاز کے۔ اور ابھی تنخواہ آنے میں پندرہ دن باقی ہیں۔ ایک ایک کر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مگر چاروں طرف تاریکی دکھائی دی۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی زینب کا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ آگے بڑھ کر بولی۔ "کون ہے"؟

جواب ملا۔ "تار لے جائیے"۔

زینب کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ امید سامنے کھڑی تھی۔ محمد لطیف بھاگے بھاگے

نیچے گئے۔ اور تار لیکر پڑھنے لگے۔ امید یقین بن گئی چلّا کر بولے۔ "لاٹری نکل آئی"۔

(۳)

لاٹری نکل آئی۔ کیسے دل کو خوش کردینے والے الفاظ تھے۔ زینب کے دل میں مسرت کی ترنگیں اُٹھنے لگیں۔ بھکاریوں کو راج مل گیا۔ دوڑتی ہوئی نیچے اُتری۔ اور محمد لطیف کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت اُن کے ہاتھ میں تار کا فارم کیلے کے پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ اُنھوں نے بیوی کو دیکھتے ہی ایک نعرہ مارا اور کہا۔ "مبارک ہو! ہمارے نام دوسرا انعام نکلا ہے"۔

زینب وفور مسرت سے اُچھل پڑی۔ اور بولی "کتنے روپے کا۔"

"تین لاکھ کا"

زینب کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ پھولوں پر بارش ہوگئی۔ محمد لطیف نے بادۂ مسرت سے مست ہوکر کہا۔ "میں نہ کہتا تھا۔ ہمارا نصیبہ جاگنے والا ہے"۔ زینب خوشی خوشی پھر چھت پر چڑھ گئی۔

اتنے میں باہر شور سا سنائی دیا۔ زینب نے چھت پر سے جھانک کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تار گھر کا چپڑاسی نالی میں پڑا ہوا ہے۔ اور محمد لطیف اُسے گالیاں دے رہے ہیں۔ زینب نے متعجب ہوکر پوچھا۔ کیا بات ہے؟

محمد لطیف نے اُسے ایک لات اور ماری اور بیوی سے مخاطب ہوکر بولے۔ "سرکاری ملازم ہے۔ تار لانے کا انعام مانگتا ہے۔ گویا ہم پر کوئی احسان کیا ہے۔ بے ایمان کہیں کا"۔

زینب نے گال پر اُنگلی رکھکر جواب دیا۔ "یہ آپ نے کیا کیا۔ مزدور آدمی ہے۔ چار پیسے دے دیتے تو کیا ہم غریب ہوجاتے۔ آخر اتنی بڑی خوشخبری لایا ہے"۔

یہ الفاظ کسی اور وقت محمد لطیف کے غصّہ پر پانی کا کام کرتے۔ لیکن اس وقت تیل بن گئے۔ نیا نیا روپیہ ملا تھا۔ کڑک کر بولے۔ "میں اسے پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

زینب کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ کیا روپیہ آدمی کے اخلاق کو بھی تبدیل کردیتا ہے۔ کیسے نیک تھے۔ ان کی شرافت کی سارے شہر میں دھوم تھی۔ اُنھوں نے کبھی کسی کو تُو کہکر نہیں بلایا۔ مگر اس وقت ایک غریب چپڑاسی کو گالیاں دے رہے ہیں۔ اور مار رہے ہیں۔ زینب کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ اُس نے نیچے جاکر بڑی مشکل سے خاوند کو روکا۔ اور چپڑاسی کی خلاصی کرائی۔ اُس کے لئے یہی انعام تھا۔

دوسرے دن زینب محلے میں مٹھائی بانٹنے نکلی۔

اس وقت اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ ہوا پر اُڑ رہی ہے۔ اور دُنیا اُس کی طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے محلے کی عورتیں اُسے مبارکباد دے رہی تھیں۔ ان مُبارکبادوں میں کتنا احترام تھا۔ کتنا جوش۔ جس میں خلوص دِلی کے بجائے حسد کی زیادہ آمیزش تھی زینب کے سامنے نئی دُنیا کھل گئی۔ دولت جادو ہے۔ یہ سُنا ہی کرتی تھی۔ پر آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ اُس نے کسی کو کچھ دے نہیں دیا۔ کسی سے کچھ سلوک نہیں کر دیا لیکن اس کے باوجود عورتوں کا لب و لہجہ اُس کی طرف ایسا مودبانہ تھا۔ گویا وہ اُن کی ملکہ بن گئی۔ یہی عورتیں تھیں جو اُس کی پروا تک نہیں کرتی تھیں۔ اس وقت اُسکو اُن کی پروا کی ضرورت تھی۔ مگر آج اُس کے راہ میں آنکھیں بچھ رہی تھیں۔ حالانکہ اب اُسے اُن کی ہمدردی کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

ایک ہمسائی نے کہا "اللہ نے تمہیں راج گدی دی ہے۔ اب ہمیں بھول نہ جانا"

زینب کی خودداری کو اِس سے صدمہ پہنچا۔ اُس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "بہن! کیا کہیں یہ بھی ممکن ہے؟"

شرفن بولی "اب کچھ خُدا کی راہ میں کرنا چاہیئے"

زینب "یتیم خانہ قائم کروں گی۔"

شرفن نے جواب دیا۔ "بھول نہ جانا۔ روپیہ بُری بلا ہے"

زینب نے تیکھی نگاہوں سے دیکھکر کہا۔ "روپیہ اگر خُدا کے کام نہ آئیگا تو اور کس کام آئیگا۔"

(۴)

شام ہوتے ہوتے زینب گھر واپس ہُوئی۔ اِس وقت اُس کے دماغ میں کئی قسم کے خیالات چکر کھا رہے تھے سوچتی تھی۔ کیا سے کیا ہو گئے۔ کل تک پیسہ پیسہ کو محتاج تھے۔ آج لاکھوں کے مالک ہیں۔ یہ سب اللہ کی دین ہے۔ مگر شرفن کی بات خوشی کو کرکرا کر دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ یہ خیال اس کے ذہن سے خارج ہو جائے مگر اُس کی یہ ایک کوشش اُسے زیادہ روشن، زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔ اتنے میں محمد لطیف داخل ہوئے۔ زینب حیران ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ان کا لباس بیش قیمت تھا۔ مُنہ میں ٹرکش سگار تھا۔ سر پر انگریزی ٹوپی اور پاؤں میں خُوبصورت بُوٹ۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک نوکر ایک بکس اُٹھائے ہُوئے داخل ہُوا۔ زینب نے جلدی سے مُنہ پر گھونگھٹ کھینچ لیا۔ اور ایک کونے میں چھپ گئی۔ محمد لطیف خود بھی پردے کے قائل تھے۔ مگر اِس وقت ان کو یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ نوکر کے باہر چلے جانے پر بولے۔ یہ پردہ وردہ فضول رسم ہے تیں

اسے برداشت نہیں کر سکتا"۔

زینب کے دل پر دوسری چوٹ لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ تو کیا اب میموں کی طرح کھلے مُنہ پھرا کروں"؟

"کیا ہرج ہے"؟

"مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ آپ سے کہتی ہوں۔ کہ مجھے معاف رکھیں"۔

"اور مَیں تم سے کہتا ہوں۔ کہ میرا کہا مان لو"۔

زینب کا چہرہ کپاس کے پھول کی طرح زرد ہو گیا۔ گھبرا کر بولی"۔ اور سب مان لونگی۔ ایک یہ نہ ہوگا"۔

محمد لطیف نے دل ہی دل میں کچھ سوچ کر کہا" خیر ابھی نہ سہی۔ تم اس وقت یہ لباس پہن لو۔ بہت سے روپے صرف کر آیا ہوں"۔

زینب نے بکس کھولا تو سناٹے میں آگئی۔ اُسے یہ گمان تک نہ تھا۔ کہ محمد لطیف اُسے انگریزی کپڑے پہننے پر مجبور کرینگے۔ بے بسی کے انداز سے بولی۔ مجھ میں ولایتی لباس پہننے کا سلیقہ نہیں"۔

"مگر اب تو پہننا پڑے گا"۔

"مَیں نہیں پہنونگی"۔

محمد لطیف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ کڑک کر بولے" تمہیں پہننا پڑیگا" زینب کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی نے ذبح کر دیا ہو۔ اس سے پیشتر کبھی محمد لطیف نے اُسے سخت لفظ نہ کہا تھا آج اُس کی رُوح سہم گئی۔ اس نے میاں کی طرف اس طرح دیکھا۔ جس طرح صید صیّاد کو دیکھتا ہے۔

(۵)

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ محمد لطیف بیوی کو موٹر میں بٹھا کر بازار کی سیر کو نکلے۔ مگر اُن کو سیر کی بہ نسبت نمائش کہیں زیادہ مقصود تھی۔ وُہ لوگوں کو دکھانا چاہتے تھے۔ کہ محمد لطیف آج نوابوں کی مانند شان و شوکت کا مالک ہے۔ وہ لوگوں کی طرف اس طرح دیکھتے تھے۔ جیسے وہ ان کی رعایا تھے نگاہوں سے اوچھاپن اور غرور مترشح تھا۔ مگر زینب کی یہ حالت نہ تھی۔ وہ نئی دُلہن کی طرح سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ شرم سے بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی اِن کو ہو کیا گیا ہے۔ اب روپیہ ملا ہے تو کیا وضعداری کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ یکایک شرفن کا کہنا یاد آگیا۔ شرم نے چہرہ سُرخ کر دیا۔ موٹر اُڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو زینب اس سواری پر ناز کرتی۔ لیکن اِس وقت یہ اُس کے لئے موجب زحمت تھی۔

اتنے میں موٹر ایک عالیشان مکان کے سامنے رُکی۔ اور محمد لطیف اُوپر چڑھ گئے۔ زینب نے سمجھا۔ کہ کوئی دُکان ہے۔ کچھ خریدنے گئے ہونگے۔ اتنا روپیہ ہاتھ آیا ہے۔

دل کی حسرتیں نکال رہے ہیں۔ مگر اُسے کتنی حیرت ہوئی۔ جب محمد لطیف ایک عورت کو ساتھ لئے نیچے اُترے۔ یہ عورت خوبصورت تھی۔ مگر اس کی خوبصورتی میں زہر ملا ہوا تھا۔ زینب کو سکتہ سا ہوگیا۔ بولی "یہ کون ہے"؟

محمد لطیف نے اُسے موٹر میں سوار کیا۔ اور آپ بیٹھتے ہوئے کہا۔ تم ان کو نہیں جانتیں۔

موٹر چلنے لگی۔

"نہیں! مَیں نے انہیں آج پہلی دفعہ دیکھا ہے"۔

"یہ اس شہر کی سب سے مشہور گانیوالی ہیں۔

زینب ایک گانیوالی عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سُن کر اس طرح پیچھے ہٹی۔ گویا وہ عورت نہیں۔ بلکہ سانپنی تھی۔ اُس نے دیوانہ وار چلّا کر کہا۔ اسکا یہاں کیا کام ہے"؟

محمد لطیف نے کڑک کر جوابدیا۔ مری کیوں جاتی ہو۔ یہ تمہیں کھا تو نہیں جائینگی"۔

زینب نے اس طرح گردن بلند کی۔ جیسے کسی نے ناگن کو چھیڑ دیا ہو۔ آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ مجھے اُتار دو۔ مَیں اس کے ساتھ نہ بیٹھ سکونگی"۔ یہ کہتے کہتے وہ کھڑی ہوگئی۔ اُس کے لئے ایک بازاری عورت کے ساتھ ایک موٹر میں بیٹھنا بدترین قسم کی ہتک تھا۔ اُس نے دوبارہ چلّا کر کہا۔ "موٹر روک لو۔ مَیں کود پڑونگی"۔

محمد لطیف نے کہا۔ کیوں ناحق شور مچاتی ہو۔ جانتی نہیں کہ مَیں تین لاکھ کا آدمی ہوں۔ اور امیروں کے ہاں ہزاروں قسم کے شغل ہوتے ہیں۔ انہیں تم آج سے بہن سمجھو۔

زینب کے جسم میں رعشہ سا آگیا۔ شرفن کے کہنے کی تصدیق ہوگئی۔ یہی محمد لطیف تھے۔ جو کل تک پرائی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے تھے آج ایک بازاری عورت کو پہلو میں بٹھلاتے ہوئے بازار سے گزر رہے تھے۔ اور اتنا ہی نہیں۔ انہیں اُس ذلیل عورت کو اپنی بیوی کی بہن کہنے میں بھی عار نہ تھا۔ زینب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آدمی اتنی جلدی اتنا کمینہ، اتنا ذلیل ہوسکتا ہے۔ اس کی اُسے امید نہ تھی۔ اُس نے سوچا۔ غریبی کیسی اچھی تھی۔ روپیہ پاس نہ تھا لیکن خوشی آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اب روپیہ تو ہے۔ مگر دل کو اطمینان نہیں۔ وہ دولت کو پھولوں کی سیج سمجھتی تھی مگر یہ خیال نہ تھا کہ اُس میں ایسے نکیلے کانٹے بھی ہونگے۔

یکایک وہ زور سے چلّا اُٹھی۔ "موٹر روک لو۔ کوئی کچلا جائیگا۔ بازار میں بھیڑ تھی لیکن محمد لطیف نے پروا نہ کی اور موٹر کی رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ دو لڑکے نیچے آگئے۔ موٹر رُک گئی۔ لوگ اُس کے گرد جمع ہوگئے۔ محمد لطیف کو اب ہوش آگیا تھا لیکن بعد از وقت۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں ہتکڑی ڈالدی۔

اور تھانے کو لے چلا۔ زینب کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کئی گھنٹے سے ایک خواب سا دیکھ رہی تھی۔ یہ گرفتاری اسکی تعبیر تھی۔ لیکن کتنی دردناک۔ زینب سوچنے لگی کیا دولت میں یہی گن ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تھانے میں پہنچ گئی۔ زینب نے ایک سپاہی سے پوچھا "ابھی یہاں کوئی شخص گرفتار ہو کر آیا ہے کیا؟"

سپاہی نے زینب کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا "جس کی موٹر کے نیچے دو لڑکے کچلے گئے ہیں؟" "ہاں وہی"

"مگر اس نے تو یہاں آکر ایک اور خون کر دیا ہے"

زینب ششدر سی ہو گئی۔ دم بخود ہو کر بولی "وہ کس طرح؟"

"جس نے اُسے گرفتار کیا تھا اُسے پستول مار دیا"

"مگر اُن کے ہاتھوں میں تو ہتھکڑی تھی"

"راستہ میں اُسے ایک امیر آدمی سمجھ کر اتار دی گئی تھی"

زینب نے آہ سرد بھر کر کہا "تو اب کیا ہو گا؟"

سپاہی نے جواب دیا "اب تو پھانسی سے کم سزا نہ ہو گی"

(۶)

زینب کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم سیسہ ڈال دیا۔ سپاہی کا ایک ایک لفظ اُس کے دل پر ہتھوڑے کی چوٹ تھا۔ وہ فکر میں ڈوب گئی۔ ابھی ابھی کیسی خوش تھی۔ محلہ کی عورتیں مبارکباد دے رہی تھیں۔ مگر دو ہی گھنٹے میں کیا سے کیا ہو گیا۔ وہ پہلی مرتبہ لاٹری کا نام سنکر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ خوشی ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے مشابہ ہے۔ جسکے پیچھے شب تار پوشیدہ ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُس کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ جس میں محمد لطیف قید تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں پاؤں میں بیڑیاں، چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر بنا ہوا تھا آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُنکو یقین ہو چلا تھا کہ اب میرا بچنا ناممکن ہے۔ زینب کے کلیجے میں جیسے کسی نے چھری بھونک دی۔ اُس نے اپنا سر زور سے آہنی دروازے پر دے مارا۔ اور اُس کے ساتھ ہی

(۷)

زینب کی آنکھ کھل گئی ...... یہ سب خواب تھا۔

... زینب کا بدن پسینہ میں شرابور تھا۔ اور کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اُسکو یکایک اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ کہ حقیقت میں خواب ہو سکتا ہے۔ مگر جب ہوش و حواس بجا ہوئے۔ تو وہ ایسی خوش تھی جس طرح کسی کی سزائے موت منسوخ ہو گئی ہو۔

محمد لطیف نے سر ہلا کر کہا "کاش لاٹری میں ہمارے نام انعام نکل آئے"

زینب گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دعا کے ہاتھ بلند کر کے بولی "خدا ایسا کبھی نہ کرے"

محمد لطیف کی حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے شاید یہ پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن جو کچھ زینب نے دیکھا تھا۔ اگر وہی محمد لطیف دیکھ لیتے۔ تو وہ بھی یقیناً زینب کی طرح پاگل ہو جاتے۔

سدرشن

لیلا

یا

محاصرۂ غرناطہ

مصنفہ لارڈ لٹن — مترجمہ سید امتیاز علی تاج

فصل دوم

قصر سلطانی

ایک ایسے حجرے میں جس کے لطف سے صرف لطیف آب وہوا کے رہنے والے ہی لذت آشنا ہو سکتے ہیں۔ ایک نوجوان مورتکیہ لگائے بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

سفید سنگ مرمر کے ستونوں پر صندل کی چھت کھڑی تھی جس کا نقرئی اور طلائی کام جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور ان ستونوں کے اوپر وہ کشادہ اور خوبصورت محرابیں اپنی آغوش کھولے ہوئے تھیں۔ جن کی نزاکت اور خوبصورتی اطالیہ کے محراب دار تاکستانوں کی یاد دلاتی تھی۔ نازک جالیوں کی خوشنما عربی صنعت نگاہ اشتیاق کو بار بار اپنی جانب مائل کرتی تھی۔ محرابوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پانی کے فوارے سنگ مرمر کے جالیدار فانوسوں سے چھن چھن کر نکلنے والی روشنی میں غسل نور کر رہے تھے اور پانی کے گرنے کی خوش آیند آواز سے ایک روح نواز موسیقی نکل رہی تھی۔ حجرے کے ایک جانب فراخ اور کشادہ جھروکے تھے جو بل کھاتی ہوئی اور چاند سے خراج نور لیتی ہوئی ڈارو کی ندی کے کناروں تک پہنچے ہوئے تھے اور فضا نے شب کی خاموشی اسقدر نورانی تھی کہ غرناطہ کی بلند پہاڑیاں۔ گنجان

جنگل۔ اور نارنگی کے درختوں کے وہ جھنڈ صاف نظر آرہے تھے جن کی وجہ سے غرناطہ کے قدرتی مناظر اجتک عدیم النظیر ہیں۔

اس خوشنما عمارت کا فرش سنگ مرمر کا تھا اور اس پر خوبصورت اور بیش بہا مسندیاں رکھی تھیں جن کے گدیلوں پر نہایت قیمتی زردوزی کا کام بنا ہوا تھا۔ جھروکوں کے مقابل میں ایک مسند تھی۔ جس پر نوجوان مور تکیہ لگائے بیٹھا تھا مسند کے اوپر گول ڈھال۔ سبک ترکش اور شمشیر خمدار آویزاں تھی۔ اور یہی وہ ہتھیار ہیں جن سے مور عموماً لڑا کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں پر ایسے بیش بہا جواہر جڑے ہوئے تھے کہ اگر بالفرض اُن کے مالک کے مرصع اور بیش قیمت لباس پر کسی کی نظر نہ بھی پڑے۔ تب بھی دیکھنے والا اس کے اسلحہ کی ترصیع ہی دیکھ کر اُس کے مالک کی علوّشان کا اندازہ کرسکتا تھا۔ نوجوان مور کے روبرو چاندی کی تپائی پر ایک قلمی کتاب کُھلی رکھی تھی۔ لیکن وہ پڑھی کبھی نہ گئی تھی۔ وہ اپنے سر کو ہاتھوں پر سہارا دیئے پریشان نگاہوں سے سامنے کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو افق میں صاف صاف نظر آرہی تھیں۔

اس گہوارۂ تعیش کے مالک کا چہرہ ایسا پژمردہ تھا کہ اگر کوئی شخص اُس کو دیکھتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ دیکھنے والے کے دل میں اُس کے متعلق حسرت آمیز ہمدردی پیدا نہ ہوتی۔

اس کے خوبصورت چہرے پر ایک سنجیدہ اور حکمت آمیز غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرخ وسفید رعنائی پر غور کرنے سے یہ نظارہ اور بھی موثر ہوجاتا تھا۔ اس شخص کے خط وخال عام موروں سے مختلف تھے۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال گھنگریالے اور سنہری تھے اور اس کی کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھوں سے وہ ملائمت عیاں تھی۔ جو تابش خورشید کے پروردہ ممالک کے شعلہ مزاج باشندوں میں کم پائی جاتی ہے۔ ابوعبداللہ دودماں موریں کے آخری بادشاہ کا سراپا یہ تھا:-

ابوعبداللہ کہہ رہا تھا۔ عربی علوم کے یہ اوراق کیا سکھاتے ہیں؟ بس یہی کہ دولت وحکومت سے نفرت کرنی چاہئے اور اقلیم دل کو ہی اپنی سلطنت سمجھنا چاہئے۔ گویا دانشمندی اسی کا نام ہے۔ لیکن اگر میں ان اصول پر عمل کروں تو کیا مجھے بھی لوگ دانشمند کہیں گے؟ آہ۔ نہیں۔ تمام دنیا مجھے مجنوں اور دیوانہ کہیگی۔ ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے کہ عقل وفراست

جن خیالات کو معقول سمجھکر دل کو اُن سے لبریز کردیتی ہے۔ عقل ان کے رنگ میں رنگے جانے سے متنفر ہوتا ہے۔ آہ اے رسول پاک۔ اگر انسانوں کی عیاری اُن کی حماقت پر سبقت نہ لے گئی ہوتی تو انسان کی بیوقوفی کی کیا حد ہوتی!"

نوجوان سلطان یہ کہہ کر بے چینی سے تکیئے پر گر پڑا۔ یہ الفاظ ایسے بادشاہ کے لئے جس کا تاج اُسکے سر پر ڈگمگا رہا ہو ضرورت سے زیادہ فلسفیانہ تھے چند لمحے متفکر رہکر وہ اور بھی بیقرار ہوگیا۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اور بولا "میری روح موسیقی کے سمندر میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔ وہ عالم خیال کے راستوں پر سفر کرتے کرتے تھک گئی ہے اور اب صرف نغمہ و زمزمہ کا آبِ شیریں تھکے ماندے مسافر کو فرحت اطمینان بخش سکتا ہے"

سلطان نے تالی بجائی۔ معاً بارہ دری سے ایک لڑکا نکل کر سامنے آگیا۔ اور سلطان کے ایک نہایت ہلکے سے اشارے پر جسے کوئی بمشکل دیکھ سکتا تھا۔ وہ نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس پرستان کے ستونوں کے درمیان اور چھلکتے جھرنوں کے پاس نازنینان عرب کے ننھے ننھے نازک پاؤں رقص کرتے آرہے تھے۔ وہ زرق برق پشوازیں پہنے ہوئی تھیں۔ جن کی دلاویزی اُن کے بازوؤں کی عریانی سے اور بھی دوبالا ہورہی تھی۔ وہ نہایت خاموشی سے اس خنک فرحت بخش اور ارمان انگیز عشرت گاہ میں جگمگاتی ہوئی داخل ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مشرقی سحر و افسوں کے زور سے چند پریاں آسمان سے اُتر آئی ہیں۔ کہ ایک نوجوان سلیمان کی خلوت کی گھڑیوں کو اپنے زمزمۂ ترنم سے لبریز کردیں۔ ان کے ہمراہ ایک نازنیں تھی جس کا قد اگرچہ اوروں سے کچھ چھوٹا تھا مگر حسن بے مثال تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں ایک ہلکا سا موری بربط تھامے ہوئے آئی۔ اس کے خوشنما انداز قامت اور دلفریب ایشیائی خط و خال پر نگاہ پڑتے ہی ابوعبداللہ کے حسین و جمیل چہرے پر ایک خفیف دلاویز تبسم نمودار ہوا۔ وہ تنہا سلطان کے قریب آئی اور ادب و حیا سے اُس کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور پھر اپنے ساتھیوں میں شامل ہوکر یہ گیت گانا شروع کیا۔ جس کے ہر سُر اور ہر لفظ پر رقاصہ لڑکیوں کے پاؤں تال دیتے تھے۔ اور جب الاپ کے وقت وہ سب باہم ملکر گاتی تھیں اور اپنے اپنے باجے کے نقرئی گھنگرو ہلاتی تھیں۔ تو کمرہ موسیقی سے معمور ہوجاتا تھا۔

آئینہ کا گیت

اے نغمۂ نرم و خوش ادا چل
اے نقرئی موج جاں فزا چل
اے باد صبا تو اپنے ہمراہ
گلبرگ سرود و نغمہ لے جا
یہ کشتی نازک و معطر
لے جا تو اسے بجان دلبر
لے جا تو اسے نسیم لے جا

ہم پر ہے کھلی بہار الحاں
جوں شاخ درخت باغ رضواں
جن پہ برگ ہیں گھنگرو سے لٹکتے
اور ہل کے ہوا سے ہیں وہ بجتے

ہم پھرتی ہیں جبکہ رقص کرتی
نغمہ کی ہیں ہم سے کلیاں جھڑتی
جنت ہے وہیں جہاں ہے جانا

اے میٹھی صدا جسے ہوں سنتی
اے کاش کہ تجھ سی میں بھی ہوتی
اور تیری طرح میں اس کو بھاتی
تو دل ہی میں اس کے بیٹھ جاتی

جب ہوتے خیال تازہ اسکے
میں دل ہی میں رہتی اُسکے بس کے
اس طرح اخیر ہوں تو بہتر

گانا بجانا موقوف ہو گیا۔ رقاصہ لڑکیاں ایک خوش آئند ادا کے ساتھ بے حس و حرکت اور خاموش کھڑی ہو گئیں گویا کسی کے سحر سے وہ سب سنگ مرمر کے بُت بن گئی تھیں۔ مگر وہ نو عمر مغنیہ سلطان کے قدموں میں ایک گدیلے پر آکر خاموش بیٹھ گئی۔ اور اشتیاق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں شاہنشاہ کی افسردہ آنکھوں میں ڈالیں۔ اُسیوقت ایک شخص حُجرے میں کھڑا ہوا دکھائی دیا جس کی آمد کا علم کسی کو نہ ہوا تھا۔

یہ شخص میانہ قامت تھا اور دُبلا پتلا تھا مگر اُسکے قوٰی مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے سیاہ رنگ کی ایک ڈھیلی ڈھالی عبا پہن رکھی تھی۔ جس کی وضع بالکل ارمنی چغنے کی سی معلوم ہوتی تھی۔ عبا کے نیچے وہ ایک شوخ ارغوانی رنگ کی صدری پہنے ہوئے تھا کمر میں ایک چوڑی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں ایک طلائی کلید لٹک رہی تھی اور بائیں پہلو میں ایک خمدار خنجر کا مرصع قبضہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص کے خط و خال اندلس کے موروں سے کچھ واضح مگر شاندار تھے۔ پیشانی کشادہ اور بلند تھی۔ آنکھیں سیاہ اور غیر معمولی طور پر بڑی اور روشن تھیں۔ اُس کی داڑھی

کے بال چھوٹے۔ سیاہ چمکیلے اوپر کی طرف بل کھائے ہوئے تھے اور موٹے موٹے ہونٹوں کے سوا جن پر مستقل مزاجی اور بلند ہمتی برستی تھی۔ چہرے کے باقی نچلے حصے کی رازداری کر رہے تھے۔ اس کی ناک اونچی خوبصورت اور خمدار تھی۔ اس کا سر جو اس کے قدوقامت کے تناسب سے کچھ زیادہ بڑا معلوم ہوتا تھا۔ عالی ہمتی اور قوی مزاجی کا پتہ دیتا تھا۔ بادی النظر میں یہ شخص بمشکل ادھیڑ عمر کا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن بغور دیکھنے پر اس کی پیشانی کے اوپر اور آنکھوں کے گرد گہری گہری جھریاں پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جن سے اُس کی سن رسیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بادشاہ کے حضور میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے خاموش اس بات کا منتظر تھا کہ بادشاہ کی نظر اُس پر پڑ جائے۔

اسے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ جونازنین بادشاہ کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں اور حرکات نے ابوعبداللہ کی نگاہوں کو اجنبی کیجانب متوجہ کر دیا۔ اور جب بادشاہ کی نگاہیں اُس پر پڑیں تو خوشی سے اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔

ابوعبداللہ نے خوش ہو کر اُسے بلایا۔ اور رقاصہ لڑکیوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ مغنیہ جو سلطان کے قدموں میں بیٹھی تھی کہنے لگی "اے دل وجان کے مالک! کیا میں بھی نہ ٹھہروں؟ تیری بلبل تو اپنے آشیانے ہی میں مسرور ہے۔"

بادشاہ نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اُس کے لہراتے ہوئے کاکل پیچاں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا "جان سے پیاری آمینہ۔ تجھے صرف میری عیش وعشرت کی ساعتوں میں رفیق حال بننا چاہئے۔ ملک داری کی دماغ سوزیوں سے تجھ کو کیا واسطہ؟ عندلیب اپنا ابھی آخری نغمہ حضور ماہتاب میں پیش نہ کر چکی ہوگی کہ میں تیرے پاس آجاؤں گا۔"

آمینہ آہ بھر کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ہمجولیوں کے ہمراہ چلی گئی۔

رشک

رشک حقیقت میں تحسین کا ایک طریقۂ اظہار ہے (رگے)

رشک انسانوں کو اکتساب فضیلت کیلئے اُبھارتا ہے (لائیوی)

ہے کوئی ایسا ساحر جو عورت کے دل سے رشک مٹا سکے؟ (گرنول)

حسد

حاسد مرجاتا ہے مگر حسد کبھی فنا نہیں ہوتا (مالیئر)

حاسد دوسروں کو خوش دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے (ہامس)

حسد غرور سے پیدا ہو کر انتقام کو پیدا کرتا ہے (سقراط)

ساون رین کا سپنا

ایک ڈراما

(گذشتہ سے پیوستہ)

مصنفہ:۔ ولیم شیکسپیئر

مترجمہ:۔ سید امتیاز علی تاج

فصل دوم

منظر دوم۔ اثینا قنس کا گھر

(قنس۔ اسنوج۔ بوطوم۔ فلوت۔ اسنوت اور استرونج داخل ہوتے ہیں)

قنس۔ کیوں بھئی تمام لوگ آ گئے؟

بوطوم۔ سب سے بہتر یہ بات کرو نہ۔ کہ فہرست دیکھکر ایک ایک شخص کو اپنا مجموعی طور پر پکار ڈالو +

قنس۔ لو بھئی یہ رہی فہرست اس میں درج ہیں ان لوگوں کے نام۔ جو نواب اور بیگم کے سامنے اُن کی شادی کے دن کی رات کو ہمارا ناٹک کھیلنے کیلئے اثینا بھر میں لاجواب ہیں +

بوطوم۔ او میاں پطرس قنس۔ پہلے فرمائیے۔ کہ یہ کھیل ہے کس مضمون پر۔ پھر ایکٹروں کے نام لینا دیوں باقاعدگی سے کسی ٹھکانے پر پہنچو نہ +

قنس۔ تو حضرت سنئے۔ ہمارا کھیل ایک بہت ہی رنجیدہ لطیفہ ہے۔ اور اس میں پیراموس اور ٹھسبی کی نہایت ہی افسوسناک موت کا حال ہے +

بوطوم۔ بھئی واللہ چیز مزے کی دکھائی دیتی ہے۔ تو جناب پطرس اب فہرست پر سے ایکٹروں کے نام پکارتے چلئے۔ صاحبان۔ اے صاحبان۔ اب ذرا ہٹ کر کھڑے ہو جائیے +

قنس۔ تو میں جس جس کا نام پکاروں۔ جواب دیتا جائے نک بوطوم جلاہا +

بوطوم۔ جناب جو پارٹ مجھے کرنا ہے۔ بتا دیجئے اور پھر ٹٹو کو ایڑ لگائیے +

قنس۔ نک بوطوم۔ تم پیراموس قرار پائے ہو +

بوطوم۔ یہ بیراموس کون ہوا؟ کوئی عاشق واشق ہو یا ظالم شخص ہے۔

قِنس۔ عاشق میاں اور پھر ایسا۔ کہ عشق کی خاطر نہایت بہادرانہ پن سے اپنے آپ خودکشی کرلیتا ہے۔

بوطوم۔ خوب۔ تو حضرت اگر یہ چیز عین بین طور پر کی گئی تو آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے گی۔ اگر ہمارے ذِمّے ہے۔ تو پھر دیکھنے والے اپنی آنکھوں کا انتظام کریں۔ جناب من ایک طوفان اُٹھا دونگا۔ ہاں طوفان ویسے اپنا کسی قدر رنج بھی ظاہر کردونگا (باقی ایکٹرو سنیں) ہمارا خاص مذاق ظالم کے پارٹ کا ہے۔ ارقل کا پاٹ تو ایسا کرسکتا ہوں۔ کہ یادو شاید۔ یا پھر کوئی ایسا پارٹ ہو۔ جس کا کام بڑا زبردست اور خوفناک ہو۔ تو جناب سب لوگ کانوں پر ہاتھ نہ دھریں تو سہی (اکڑ کر اور خاص ایکٹری انداز سے)

تڑقتی چٹختی چٹانوں کے ٹکر
اُڑا دینگے دیوارِ زنداں کے ٹکڑے
نظر آئے سورج کا رتھ دور سے جب
بنائے وہ قسمت کو چاہے بگاڑے

بے مثل چیز ہے۔ اچھا اب باقی ایکٹروں کے نام لے ڈالو۔ یہ ارقل کی باتیں تھیں۔ ظالم کے پارٹ کی۔ عاشق کا پارٹ ذرا زیادہ جگر سوز ہوتا ہے۔

قنس۔ فرانسس۔ فلوت۔ دھونکنی ساز۔

فلوت۔ یہ ہوں پطرس قنس۔

قنس۔ فلوت تم کو ثِسبی بنا ہوگا؟

فلوت۔ پر یہ ثِسبی ہے کون؟ کوئی آوارہ گرد ہو رہا ہے؟

قنس۔ یہ بیراموس کی معشوقہ ہے۔

فلوت۔ توبہ توبہ یار۔ عورت مجھ سے نہ بنا جائے گا اور داڑھی بھی تو نکل رہی ہے میرے۔

قنس۔ کچھ ڈر نہیں۔ تم نقلی مُنہ لگا لینا۔ باقی رہی آواز تو جتنی پتلی آواز سے بولا جائے بولنا۔

بوطوم۔ یہ بات ہے۔ تو ثِسبی بھی مجھ ہی کو بنجانے دو میں بڑے زوروں کی مہین آواز میں کہوں گا "ثِسبی ثِسبی۔ ارے میرے بیر سے بیراموس تیری پیاری ثِسبی۔ تیری جان ثِسبی"

قنس۔ نہیں نہیں تمہیں بیراموس ہی بننا ہوگا۔ اور فلوت تم ثِسبی۔

بوطوم۔ اچھا آگے چلو۔

قنس۔ روبن استرونیج درزی۔

استرونیج۔ کہئے پطرس قنس۔

قنس۔ روبن۔ استرونیج۔ تمہیں ثِسبی کی ماں بننا ہوگا۔ طام۔ اسنوت۔ پنجیرا۔

اسنوت۔ ہوں۔

قنس۔ تم ہیراموس کے باپ رہے۔ ہم خود تھسبی کے باپ۔ اسنوخ نجار۔ تم شیر بن جانا۔ لیجئے چھٹی ہوئی بیٹھ گیا کھیل ٹھیک۔

اسنوج۔ شیر کے بول تمہارے کنے لکھے ہوئے بھی ہیں؟ ہوں تو ابھی سے مجھے دے ڈالو۔ وجہ کیا کہ مجھے ذرا سہج سہج پڑھنے کی عادت ہے۔

قنس۔ اجی تم فی البدیہ بولنا۔ گرجنے کے سوا اس میں دھرا ہی کیا ہے۔

بوطوم۔ ایک بات کہیں۔ بھئی شیر بھی ہمیں ہی بنجانے دو۔ جناب من ایک دفعہ تو ایسا گرجوں کہ سماں بندھ جائے اور نواب تو کہے کہ بیٹا گرج جا۔

قنس۔ اور حضرت جو کہیں آپ بہت زور سے گرج بیٹھے تو بیگم اور عورتیں ڈر کے مارے چیخیں مارنے لگیں گی پھر پھانسی کہیں نہیں گئی۔

سب۔ ہاں بھیا سب کے سب پھانسی پر چڑھا دیئے جائیں گے۔

بوطوم۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ کہ اگر تم نے بیگمات کو ڈرا دیا ایسا کہ وہ بوکھلا گئیں۔ تب تو البتہ ان کو اس کے سوا کچھ نہ سوجھے گا۔ کہ ہم کو پھانسی پر ٹنگوا دیں۔ لیکن حضرت ہم تو اپنی آواز کو ایسا ہلکا پھلکا بنا کر نکالیں گے جیسے کوئی کبوتر غٹر غوں کرے۔ ہم گرجیں گے۔ اور جناب کہیں گے۔ کوئی بلبل بول رہا ہے۔

قنس۔ تم ہیراموس کے سوا اور کچھ نہ بنو۔ وجہ کیا کہ ہیراموس بڑا قبول صورت آدمی ہے۔ بہت مناسب شخص۔ ایسا کہ چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہ ملے۔ اور پھر دیکھو نہ کہ کتنا پیارا خسر لیف شخص سا آدمی ہے تمہیں ضرور ہیراموس ہی بننا ہوگا۔

بوطوم۔ اچھا پھر اسی کو لئے لیتے ہیں ہم۔ پر داڑھی کونسی لگائیں اس پارٹ میں!

قنس جو تمہارا دل چاہے۔

بوطوم۔ تمہاری بھوسلی داڑھی لگالیں گے۔ یا لاکھی رنگ والی۔ یا وہ عنابی سہی۔ یا پھر مہندی کے رنگ والی میں کر ڈالیں گے اور نہیں تو جی اصل زرد داڑھی لگالیں گے۔

قنس۔ صاحبان! یہ ہیں آپ حضرات کے پارٹ۔ اب میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ بلکہ آپ سے کہتا ہوں کہ کل رات آپ انہیں منہ زبانی یاد کرلیں۔ اور مجھے شہر کے باہر ایک میل کے فاصلے پر۔ چاندنی رات میں جنگل میں ملیں۔ وہاں ہم کھیل تیار کریں گے۔ پوچھو کیوں؟ کہ اگر ہم نے شہر میں کہیں جمع ہونا شروع کیا تو لوگوں کا جمگھٹا لگا رہا کریگا اور ہماری تمام تجاویزیں طشت از بام ہوجایا کریں گی ۔ اور

انشا میں اس سامان کی فہرست بھی تیار کر لونگا جو ہمیں
کھیل میں درکار ہوگا۔ میں منت سے کہتا ہوں۔ مایوس
نہ کرنا مجھے۔

بوطوم۔ اجی آجائیں گے اور چھپے ڈھکے بلا کھٹکے اپنی تیاری
کرلیں گے۔ لو بھئی پارٹوں پر خوب محنت کرو اب کوئی
نقص نہ رہ جائے۔ ہاں۔ اللہ حافظ۔

قنس۔ ڈیوکس اوک پر جمع ہوں گے۔

بوطوم۔ سن لیا حضرت۔ نہ پہنچیں گے تو ناک اڑا
دونگا۔ اور کیا کہتے ہو۔

سب جانتے ہیں

شانِ استغنا

مبارک ہو تجھے اے شوقِ پنہاں نازِ استغنا
کریں گے سرخرو تجھ کو یہی اندازِ استغنا

جو دل قابو میں ہو تو ہم بھی ترکِ اعتنا کرلیں
دکھا دیں اُس ستم انگیز کو اعجازِ استغنا

دلِ حسرت زدہ اتنا نہ برباد تمنا ہو
جو سوزِ التجا کے ساتھ ہو کچھ سازِ استغنا

جوانی نے غضب کا دو دلوں میں تفرقہ ڈالا
ادھر عرضِ نیازِ عشق اُدھر ہے نازِ استغنا

کہا یہ نجد میں لیلیٰ سے جذبِ شوقِ مجنوں نے
نہ نکلے پردۂ محمل سے اب آوازِ استغنا

فروغِ حسن، شانِ خود نمائی کر چلا پیدا
کہ ہر نوخیز میں پاتا ہوں میں پروازِ استغنا

فراقِ یار میں غم کھاتے کھاتے مٹ گئے لیکن
نہ لائے لب پہ حرفِ مدعا جانبازِ استغنا

ملے ہیں ہم ادا کیا کیا تمہیں اس نوجوانی میں
غرورِ حسن و تمکینِ حیا و نازِ استغنا

زمانے میں بہت رسوا کیا بیتابیِ دل نے
چھپایا رازِ دل ہم نے تو پایا رازِ استغنا

ترے ذوقِ محبت نے کیا بیگانہ دنیا سے
مٹا کر شانِ ہستی ہم نے پایا رازِ استغنا

نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر تم نے تڑپا ہی کیا محوی
یہ شانِ بے نیازی! اور یہ اندازِ استغنا

محوی لکھنوی

اُٹکّلیس

(۱)

قلم اُٹھایا اور اس سرخی پر۔ توخیال آیا کہ اس عجیب و غریب لفظ کی سوانح عمری بھی عجیب ہوگی۔ کہتے ہیں کہ الفاظ میں جان ہوتی ہے۔ مگر یہ مسئلہ ایسا نازک ہے کہ اس کو فلسفیوں کے ہی حوالہ کیجئے تو بہتر ہے۔ نہ راقم اس کی بال کی کھال کھینچ سکتا ہے اور نہ قائین کرام اس نازک ذہنی عمل جراحی سے محظوظ ہو سکتے ہیں البتہ اتنا مان لینا آسان ہے کہ الفاظ پیدا ہوتے ہیں ارتقا پاتے ہیں۔ مذکر یا مونث ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے پیوند ہوتے ہیں اُن کے بچے ہوتے ہیں اور وہ چیا کہ دنیا کی ہر شے کا انجام ہے مر بھی جاتے ہیں۔ بعض کے ڈھیر مصر کی ممیوں کی طرح باقی رہتے ہیں اور اکثر تو بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اگر آپ نے اتنا مان لیا۔ اور ماننے بھی بلا استدلال کیونکہ اس سرخی کے تحت راقم استدلال کو حتی الوسع پاس پھٹکنے نہ دیگا تو باقی ہی کیا رہا۔ یہ بھی مان ڈالئے کہ الفاظ رنگ روپ صورت شکل اور وضع قطع بھی رکھتے ہیں اور جب اسقدر اور آپ نے مہربانی فرما کر مان لیا تو لگے ہاتھوں اسے بھی کیوں نہ منوا لیا جائے کہ بعض الفاظ ایسی وضع قطع کے ہیولیٰ۔ خو نَق سے ہوتے ہیں کہ اُن سے ظرافت بڑی ٹپکتی ہے اور ہنسی اُن کے گلے میں باہیں ڈالے کھلکھلاتی پھرتی ہے۔ انسانوں میں بھی یہی حال ہے۔ بعض اللہ کے لال ایسے بھی ہوتے ہیں کہ آدمی کی سی صورت سہی مگر فطرت نے ظرافت کی ترنگ میں کچھ ایسے خد و خال بنائے ہوتے ہیں کہ دیکھتے ہی آپ بیساختہ ہنس پڑیں +

ایسے ہنسی پٹے لفظ ہر زبان میں ہوتے ہیں ہماری اُردو بھی ان سے خالی نہیں۔ بلکہ اردو میں چونکہ بھانت بھانت کی بولیاں کیمیاوی آمیزش پا رہی ہیں قیاس یہ چاہتا ہے کہ اردو میں ایسی ہنسی کے پوٹ الفاظ کسی طرح انگریزی سے کم نہ ہونے چاہئیں۔ بہرحال اُٹکّلیس اور اُس کا علاتی یا اخیافی بھائی اُٹکل پچّو اسی قبیلہ کے ہیں بہت کوشش کی کہ اس کے ماں باپ کا پتہ چلے مگر افسوس ہے کہ ہماری کوششوں نے کامیابی کا تاج حاصل نہیں کیا اور اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں چلا۔ اس میں کوئی ایسی قباحت تو ہے نہیں اس لئے کہ انسانوں میں بہت

سے ایسے ہیں جن کے شجرے کا پتہ نہیں چلتا تو پھر بیچارے اُنگریس کا خاندان ناقابل تحقیق ہو تو کون بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ غرض اُنگریس کا شجرہ ناظرین کرام کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صاحب کو اتفاقاً کچھ پتہ چل جائے تو براہ کرم کسی لغت نویس کو مطلع فرمائیں۔

یہ تو اُن کے شجرہ کا حال ہے۔ اب ان کی خو بو پر نظر دوڑائیے۔ "اُنگریس" عجیب بات ہے کہ اس میں کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ ہندوستان کی کالونس جھلکتی ہے نہ بھورا پن۔ مغلوں کی بادشاہت ٹپکتی ہے نہ آریاؤں کی میدے اور شہاب والی دلفریبی۔ ڈیل ڈول گڈیل ہے۔ سر سے پیر تک مستعدی ہے کہ اُبلی پڑتی ہے ایسا معلوم دیتا ہے کہ ایک گران ڈیل گنوار کاندھے پر ایک بڑا سا بھاری لٹھ رکھے کان کی لَو تک باچھیں کھولے کھڑا ہے۔ آواز میں کچھ نہ پوچھئے انگریزی الفاظ سے اسقدر مشابہت ہے کہ انگریزی عبارت میں بٹھا دیجئے تو گمان بھی نہ ہو کہ یہ آبنوس نژاد ہے۔ ذرا اس کی باطن کی بھی خبر لیجئے! باطن کیا ہے نرا جذبات کی پوٹ ہے۔ عقل کو دور سے دیکھا اور ایک قہقہہ مارا۔ استدلال سے قطعاً تنفّر ہے۔ ارسطو اور مل سے خلقی بغض ہے ایک عجیب بدتمیزی آپ کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے وہ یہ کہ موقع ہو یا نہ ہو آپ اُچھل پڑتے ہیں یا بیچ میں ٹپک پڑتے ہیں یہ اُنگریس صاحب کی ہیئت کذائی اور یہ کیرکٹر ہے +

ماں باپ کے متعلق ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ماں باپ تو ضرور ہوں گے۔ پتہ اس کا نہیں چلتا کہ وہ کون ہے کیا ہے۔ بہرحال ان کا وجود اس کا شاہد ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح پیدا ضرور ہوئے کس سنہ میں پیدا ہوئے اور کس جگہ۔ پہلے پہل فضائے ادب اردو میں ان کا بلند قہقہہ سنائی دیا یہ ایسے امور ہیں کہ ان کا بھی کھوج لگانا بہت مشکل ہے۔ راقم کا خیال ہے۔ آپ مانیئے یا نہ مانیئے مجھے اصرار نہیں۔ کہ انکا سن برطانوی حکومت سے چھوٹا ہے۔ رہا مولد و منشا۔ آپکی شان تو اس قیاس کی طرف مایل کرتی ہے کہ آپ کسی شہر میں اور اُس شہر کے کسی بھنگڑ خانہ کی دھواں دھار فضا میں ظہور پذیر ہوئے ہونگے +

مگر آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ اس عجیب الخلقت ناتحقیق لفظ کو زیب عنوان کرنے سے کیا حاصل؟ اس کا راز ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے خیال کا ایک دریا کا سا بہاؤ ہے۔ سوچنا جسے کہتے ہیں اُس کے معنے صرف یہ ہیں کہ اس بہاؤ کے کسی حصہ پر آپ نے نظر گڑو دی ہے اور اس کی روانی کے ساتھ آپ کی

نظر بھی بہ رہی ہے اور یہ بہی محض چند لحظوں کے لئے اسی کا نام توجہ ہے۔ بڑے بڑے عالی دماغ جو بڑا تیر مارتے ہیں وہ یہی۔ ہے کہ بار بار اپنی نظر کے سامنے نفس رَو کے کسی حصّہ کو لے آتے ہیں۔ اگر نفس زندگی کے متعلق اس بہاؤ کے استعارے کو صحیح مان لیجئے تو پھر ظاہر ہے کہ ہماری ہر لحظہ کی زندگی بےگنتی خیالات سے معمور ہوتی ہے اور یہ کہ ان خیالات میں ایک دوسرے سے استدلالی تعلق نہیں ہوتا اور ہو نہیں سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کے خیالات کی رو کا چربہ اُتار دیا جائے؟ یہ خیالات کا بہاؤ جان کے ساتھ ساتھ موجیں مارتا ہے۔ آپ جاگتے ہوں یا سوتے۔ بے غل وغش سوتے ہوں یا خواب دیکھتے ہوں کسی کام میں اسقدر محو ہوں کہ اپنے آپے کا ہوش نہ ہو یا اپنے آپ کو منہ میں گلوری یا حقّہ کی مہنال اُڑائے خیالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا ہو۔ یہ نفسیاتی مسئلہ ایک پہیلی سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک مثال لیجئے تو صاف ہو جائیگا۔

فرض کیجئے کہ قارئین کرام میں سے کسی اہل قلم نے فہرست مضامین میں یہ عنوان دیکھا "اٹمکریس" اب اُن کے خیالات کی رو ملاحظہ فرمائیے۔

واہ۔ یہ بھی کوئی سرخی ہے۔ اٹمکریس۔ اسکے معنے بھی ہوئے۔ آجکل پچّو، بھلا اس پر کیا خاک مضمون لکھا جائیگا۔ کل موٹر سے میری ٹمٹم ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچی۔ ہاں تو یہ مضمون دیکھنا چاہیئے۔ چھوٹو ذرا حقہ اور پان اندر سے منگوا لینا۔ عجیب بات ہے۔ زندگی میں بعض باتیں کیسی اٹمکریس ہو جاتی ہیں۔ بھلا مجھے دیکھئے کہ کہ ادبیات کا مجھے خاص مذاق۔ میرے مضامین پر لوگ سر دھنتے ہیں مگر زندگی بھی عجیب راز ہے میری نوکری تو دیکھئے چرس اور چانڈو۔ بھنگ اور گانجا۔ سیندھی اور شراب کی جانچ پڑتال۔ ہندوستان میں انسان محض قلم پر نہیں جی سکتا۔ کل بیگم صاحب کو کیا اچھی لیس لا دی ہے۔ خوش ہی تو ہو گئیں۔ عورت نمود کی چیزوں کو کسقدر پسند کرتی ہے۔ فطرت کو کون بدل سکتا ہے۔ کل عہدہ دار صاحب کیا اٹمکریس بکواس کر رہے تھے۔ بات کا سر نہ پیر۔ اللہ کی شان ہے۔ گدھوں کو بھی پالتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ ابے یہ چلم کیسی بھری ہے۔ چھٹو چھٹو اُلو کا پٹھا کہیں کا۔ دیکھ تو سہی چلم راکھ میں اَٹی ہوئی ہے۔ حقہ بولتا ہی نہیں ایک تپڑ دے منہ پر۔ اچھا مضمون پڑھنا چاہیئے۔ یہ مضمون نگار صاحب کون ہیں؟ معلوم نہیں کیا ستیاناس کیا ہے۔ اس سرخی پر تو میرے قلم سے مضمون نکلتا سارا فلسفۂ حیات بھر دیتا۔ کیا خاک لکھا ہوگا۔ آجکل جس کے ہاتھ میں قلم آیا اور لکھنا شروع کر دیا معقول یا نامعقول

جی چاہتا ہے کہ ایک دم سارے رسالے اور اخبار بند کر دئیے جائیں۔ خیالات بلند نہ عبارت ٹھیک نہ زبان ٹکسالی روپیہ بنانے سے مطلب۔ اس پر کیا مزیدار مضمون ہو کہ ایک دفعہ تو سارے اخبار رسالہ اور اُن کے عینک باز ایڈیٹر بھڑک ہی تو جائیں۔ چلم ٹھیک کر دی ہاں اب ٹھیک ہے۔ آنکھیں کھول کر کام کیا کرو۔ کیوں پکارتے ہو بٹیا۔ امّی جان مجھے کیوں بلا رہی ہیں؟ اچھا آتے ہیں۔ ٹھیک کہا ہے شادی کے بعد انسان کام کا نہیں رہتا "اچھا اب ذرا ہو آؤں" اور پھر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور اس عاجز کا مضمون بن پڑا آرام کرسی کے ہاتھ پر زبان حال سے طلبگار خواندن منہ تکتا کا تکتا رہ جاتا ہے۔

یہ تو محض ایک مثال تھی۔ اصلیت کا صحیح چربہ شیکسپیئر اور ڈیکنس کے قلم سے شاید ممکن ہوتا غرض اس ناچیز راقم کا اس سرخی کے تحت ایسے چربے اُتارنے کا قصد ضرور تھا مگر صاف صاف تو یوں ہے کہ راقم سے یہ کام ممکن نہیں تو دوسری بہتر صورت یہ باقی رہجاتی ہے کہ اس عنوان کے تحت جس مضمون پر جی چاہا لکھنا شروع کر دیا اور اس قسم کی تحریرات کی یہ پہلی قسط ہے۔ باقی کی قسطوں کے لئے قارئین کرام کی قدر دانی اور مدیر صاحب کی مشفقانہ اشاعت کی آمادگی زبردست شرطیں ہیں +

محمد عظمت اللہ خاں

افکار فکری

جدھر دیکھو اُدھر گلکاریاں ہیں خون بسمل کی
ارے او ناشناس درد کچھ تجھ کو خبر بھی ہے
چلا تو ہوں سوئے کوئے بتاں لیکن حقیقت میں
مرا داغ جگر بھی اے ستمگر شمع سوزاں تھا
خوشا قسمت کہ وہ قاتل نمک پاش جراحت ہے
اسیری ذوقِ فطرت کو بدل سکتی نہیں ہرگز
ترے آئینۂ دل کا خدا حافظ ہے اے فکری

عجب دلکش ہے رنگینی زمینِ کوئے قاتل کی
مرے زخمی کلیجہ کی مرے دُکھتے ہوئے دل کی
نہ شادی مرگ ہو جائے مسرت قرب منزل کی
بُجھا کر جسکو رونق کھوئی تو نے اپنی محفل کی
خدا اوندا بڑھا دے اور کچھ دن زندگی دل کی
قفس میں بھی وہی ہے زمزمہ سنجی عنادل کی
نظر آتی ہے شکل اسمیں انہیں اپنے مقابل کی

تبصرہ

نظم اقبال

مصنّفہ

(آنریبل سر ذوالفقار علی خاں بہادر بالقابہم)

اگرچہ یورپ اور امریکہ کے خاص خاص ارباب ذوق نے نظم اقبال پر تنقید کر کے مشرق کے اس نامور اور ممتاز شاعر کی خصوصیات شعر کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم سر ذوالفقار علی خاں بہادر کی مختصر اور جامع تنقید جو انہوں نے ایک عالمانہ فصاحت و بلاغت سے زبان انگریزی میں حوالہ قلم فرمائی ہے۔ ایک بڑی کمی کو پورا اور ایک ضروری فرض کو ادا کرتی ہے نظم اقبال کے چند ٹکڑوں کا انگریزی ترجمہ ممکن ہے کہ اقبال کے شعر کو بہت سی خصوصیات اور ممیزات سے معرا کر دے اور مغرب کے نقادان سخن کو اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا صحیح اندازہ لگانے سے محروم رکھے مگر یقیناً یہ تنقید مغرب کے دلدادگان فن کے لئے ایک نئی حقیقت کا انکشاف ثابت ہوگی۔ بلکہ ہم کسیقدر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تحریر ہندوستان کے ایسے بامذاق لوگوں کے لئے بھی جو مشرقی علوم و فنون کو صرف انگریزی زبان کی وساطت سے ہی سمجھ سکتے ہیں ایک نئی دنیا کی دریافت سے کم حیرت انگیز نہ ہوگی +

ڈاکٹر رامیش چندر کا قول ہے کہ "آج ہندوستان دنیا کی نگاہوں میں اس لئے حقیر نہیں کہ اس میں ان افراد یا اشیاء کی کمی ہے جو اس کے لئے مایۂ ناز ہوسکیں بلکہ اس لئے ہے کہ ہندوستانی خود ان لوگوں یا اُن چیزوں کی قدر کرنا نہیں جانتے"

ڈاکٹر ٹیگور کو جن کی شہرت کا ڈنکہ آج چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ ہندوستانیوں کی سخن فہمی یا قدر شناسی کی بدولت یہ عام قبولیت اور عالمگیر شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ اس جوہر قابل کی دریافت کا سہرا مغرب کے اُن قدر شناسوں کے سر ہے جو بلا امتیاز ملک و ملت علوم و فنون کی تحقیق و تدقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا یہ امر ایک زندہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر ڈاکٹر براؤن اپنی عمر کی قیمتی ساعتوں کو ایران اور ایران کے شعرا کے مطالعہ

میں صرف نہ کردیتے تو آج فارس کے بے بہا علمی موتی گمنامی ہی کے تاریک سمندر میں غرقاب رہتے۔ اور اگر میکس ملر یا دوسرے مغربی مستشرق۔ ویدوں کے راز کا انکشاف نہ کرتے تو ہند قدیم کے یہ قیمتی خزانے قدامت کی خاکستر تار میں ہی دفن رہ جاتے +

ہمیں یقین ہے کہ اگر اقبال کو جس کی نظم نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے بہت سے ممالک کی رگ جاں میں خون زندگی دوڑا رہی ہے۔ اور جس کے شعر نے عالم شرق پر ایک نئی دنیائے تفکر و تدبر کے دروازے کھولدیئے ہیں کوئی مغربی نکتہ شناس اور قدرداں مل جاتا۔ تو اُس کی شہرت آج ٹیگور سے کم نہ ہوتی +

اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹیگور کا صوفیانہ رنگ اور اُس کے شعر کا کیف خواب آور مغربی ممالک میں اس لئے بھی زیادہ مقبول و محبوب ہوا کہ وہاں کی مادہ پرست اور کشاکش حیات سے لبریز زندگیاں دنیاوی جدوجہد سے تنگ آکر اور مادی ترقی کے معراج کمال تک پہنچکر ایک ایسے ادب کے لئے چشم براہ تھیں جو اُن کو مذہبی تعصب اور اعتقادی تفریق کے بغیر اطمینان قلب بخشے اور کارزار حیات کی نبرد آزمائیوں کو معطل کرکے ایک نئی روحانیت کے کیف سے سرشار کردے۔ اور اسی لئے جب بنگال کے اس روحانی نغمہ سرا نے اپنی آسمانی شاعری کے تاروں سے ایک عالمگیر محبت اور صوفیانہ معرفت کا راگ الاپا تو مغرب کے شور نفسانیت سے تنگ آئے ہوئے کان۔ گوش برآواز ہو گئے اور آج ہندوستان کا یہ متبرک اور بزرگ شاعر مغرب کے لئے ایک روحانی پیغمبر بن گیا +

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ٹیگور جس کا دل ویدانت کے فلسفہ سے سرشار اور جس کی آنکھیں روحانی اطمینان کے نور سے منور تھیں۔ ہندوستان کی خوابیدہ قومیت کی حالت زار اور پراگندہ جمعیت کی پریشانی سے متاثر نہیں ہوا۔ ورنہ اس کا شعر ایک نغمہ خواب پرور کی جگہ ایک رجز تہور ہوتا۔ مگر شاید قدرت کو یہ کام اقبال سے لینا تھا کہ اُس نے اس خاموش خلوت نشیں شاعر کے دل میں ایک سیل آرزو۔ ایک طوفان جدوجہد متلاطم کردیا۔ اور اس کی آنکھیں اُن نظاروں کو دیکھکر بے چین ہوگئیں جو ایک آرزوئے ترقی سے معمور اور تمنائے آزادی سے بیقرار قومیت کی کشاکش حیات کا یقینی نتیجہ ہیں اس راہرو کیطرح جو سامنے اُفق میں منزل مقصود کے سنہری نشانوں کو دیکھکر اور بیتاب ہو جاتا ہے۔ اقبال کے تخیل نے ہندوستان کو حرکت آرزو اور ترقی کا فلسفہ سمجھایا اور ان اشعار میں جنکا شکوہ سنگ خارا سے زیادہ پائدار جن کا اثر برقی رو سے زیادہ تیز اور بیقرار تھا اُس نے ایک مردہ قوم میں جان ڈالدی

اُس ذمہ دار قائد کی طرح جو اپنے مقتدیوں کی روحوں سے کھیلنے کو گناہ عظیم سمجھتا ہے۔ اقبال نے اپنے پیروؤں کو بقائے اصلح کے راز سمجھا کر ان کو آرام سے بیزار اور فتح و جاذبیت کے جذبوں سے معمور کر دیا۔

یہ مختصر رسالہ بقول سرذوالفقار اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی توجہ کو اقبال اور اُسکی شاعری کی طرف منعطف کیا جائے۔ یہ ایک مبارک مقصد ہے خدا کرے نواب صاحب ممدوح کو اسمیں کامیابی ہو مگر ہم اس امر کا بصد غرور و ناز اعلان کرتے ہیں کہ اقبال امریکہ اور یورپ کی قدردانی کا محتاج نہیں اس کا جوہر تعریف سے مستغنی ہے اور اس کا کام صلہ اور ستائش سے بے نیاز۔ ایک دن آئیگا کہ یورپ اور امریکہ کی متلاشی آنکھیں اقبال کو ڈھونڈنے کے لئے نکلیں گی اور ہندوستان اپنے اس مایۂ ناز شاعر کو غیر فانی عزت سے دیکھنا سیکھ لیگا۔ خدا کرے وہ دن اقبال کی زندگی ہی میں آئے۔

نواب صاحب ممدوح کو اقبال کے دوسرے ناقدین پر وہ تمام فوقیت حاصل ہے جو ایک شاعر کے ہم نشین اور ہم مشرب دوست کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے کانوں میں اقبال کی شیریں تکلمی بسی ہے اور اُنکی آنکھوں میں اقبال کی پُرسحر صحبت کے جلوے ہیں۔ پس اقبال اور اُس کے شعر کے متعلق جو کچھ وہ لکھ سکتے ہیں اور کون لکھ سکتا ہے۔ اگرچہ نظم اقبال میں زیادہ تر اقبال کے ابتدائی زمانے کے کلام اور پھر اس کلام کے بہت ہی قلیل اور مختصر حصّوں کو ہی پیش نظر کیا گیا ہے اور شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ جیسی غیر فانی نظمونکو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تاہم نواب صاحب ممدوح نے ان ہی اقتباسات کی شرح میں اس تبحر و عبور کا ثبوت دے دیا ہے جو ان کو نظم اقبال پر ہے۔ اور ان کی تحریر اقبال کے کلام کی تمہید کے طور پر کافی استفادہ کی اہل ہے کاغذ اچھا ہے مگر لکھائی اور چھپائی نظم اقبال اور نامور مصنف کی شایانِ شان نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قدردانانِ فن۔ ظاہری خوبیوں کو نظرانداز کرکے اس بے نظیر ادبی کوشش کی باطنی سحر کاریوں سے مسرت اندوز ہوں گے۔

کتاب کی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ہے حجم دیباچہ کے علاوہ جو سردار امراؤ سنگھ صاحب جیسے قابل انشاپرداز اور سخن فہم کا نتیجہ فکر ہے ۷۴ صفحہ ہے۔ کتاب غالباً "نوبہار" شملہ کے پتہ پر نواب صاحب ممدوح کے پرائیوٹ سکریٹری صاحب کے نام خط لکھنے سے ایک روپے کی قلیل قیمت پر مل سکتی ہے۔

ایڈیٹر

نگار

[illegible]

... اپنے علمی و ادبی ذخیرہ میں ... [illegible]

... نگار کی اشاعت سے پہلے تصنیف شدہ کتب میں ... [illegible] ... نظر آتا ہے۔ اور ...

[illegible] ... ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے

مغرب اور مشرق کے ماہرین علوم و فنون کے قیمتی اور مفید ... [illegible] ... زبان اردو کے علم و ادب میں ایک ... [illegible]

[illegible] ... کی دوسری ... [illegible] ... ایک دلکش اور مقبول ... [illegible] ... اگرچہ اردو کے علم ادب کی ... [illegible]

... ہم کہہ سکتے ہیں کہ نگار نے ... [illegible] ... سلسلہ کے نظام ... کی ایک ... [illegible]

[illegible] ... ہندوستان ... [illegible]

[illegible]

... نگار کی موجودہ اشاعت ایک نہایت ... سے آراستہ ہے ... [illegible]

... کیا ہے۔ اس تصویر کے مطالعے ... [illegible] ... ہیں ... ان کو ... آئندہ اشاعت میں ... [illegible] ... بیان کریں گے

ہم اس ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے جس سے اس تصویر ... [illegible] ... نقش و رنگ کی زیبائش بنانے کے ... [illegible] ... کوشش کی ہے۔

اس طرح حضرت جناب ... [illegible] ... صاحب کی ... [illegible] ... کا ثبوت ہے ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

تیتری

[illegible]
[illegible]
[illegible]
چھایا ہوا ہے کیف سا مستی بہار
[illegible] گلشن [illegible]
[illegible]
ہیں صبا کو ابھی دکھلانے لگا بہار
اپنے پروں کو گلوں کے چلتا وہ جھوم کر
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

فطرت کو جوش نشاط اب ہو چلا ہے سوار
کا دور رفتہ رفتہ ہوا ختم سرد کا شمار
بادل لگے ہیں ابر ہیں مصروفِ کاروبار
رشکِ ارم ہے صحنِ گلستاں و سبزہ زار
رقصاں صبا پہ بوئے گلِ یاسمن سوار
کھلنے لگے رنگ رنگ کی خوشبو نے شاخسار
اور تیتری فضا سے مصفا ہیں آشکار
چھایا ہوا ہے دیار کا یوں عالمِ خمار
رخسارِ گل کو چومتا ہو کے بے قرار
گردوں پہ ابر ہو گیا وہ جوشش بہار
مسکن ہے اس پہ باغ کے جوبن کا اب نکھار
پیشانیٔ فلک پہ شفق کا ہو جوں نگار
پھیلی [illegible] آنکھیں سبل کے بار
[illegible] پھول سے [illegible]
[illegible] فضا سے [illegible]

۷۸۶

ہزار داستان

ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جلد ۱ — اشاعت سوم ماہِ اگست ۱۹۲۲ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوان چند پرنٹر چھپا۔ اور دارالاشاعت ادب لطیف لاہور کیلئے سید افضال علی حسنی پبلشر نے

دریا حباب اندر

(صفحہ ادارت)

۱۔ ان معاصرین کی خدمت میں جنہوں نے ازراہ کرم اپنے گرانقدر جرائد ورسائل میں ہزار داستان پر ریویو کرکے مجھے مرہون منت کیا ہے۔ میں اپنا دلی شکریہ پیش کرتا ہوں۔ اور انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ میں اُن کی مشفقانہ نصائح کی تعمیل کو ایک اہم فرض سمجھتا ہوں۔ اور ان کی قدر افزائی کی دل سے قدر کرتا ہوں۔

۲۔ بمبئی اور کلکتے کے بلاک بنانے والوں نے ہزار داستان کے دفتر کو ایک محشرستانِ انتظار بنا رکھا ہے۔ پہلی اشاعت کی تصویر کو وقت مقررہ پر منگانے کے لئے ایک اچھی خاصی رقم محض تار برقی کے پیاموں پر صرف ہوئی۔ مگر یہ نامہ و پیغام ایک منتظر و بیقرار عاشق کی آہ نارسا سے زیادہ موثر ثابت نہ ہوئے۔ دوسری اشاعت کی تصویر کے لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک آدمی خاص اسی مقصد کے لئے کلکتہ بھیجا گیا۔ جو اپنے زعم میں تمام انتظامات کرکے واپس آگیا۔

آج ۱۴ تاریخ ہے۔ رسالہ تیار ہے۔ مگر صرف تصویر کا انتظار ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اشاعت تصویر کے بغیر شائع کردی جائے۔ اور یا تصویر کے انتظار میں اشاعت معرض التوا میں پڑ جائے۔ میں ناظرین کے شوق اور اپنے کاروباری ذمہ واری کو محسوس کرکے پہلی صورت کو ترجیح دے رہا ہوں۔ مگر اس کمی کو ایک صفحہ جمیل کی زیادتی سے پورا کیا جا رہا ہے۔ جو غالب مرحوم کے کسی قدر کم معروف مگر حقائقِ فطرت سے بہت زیادہ لبریز کلام سے مزیّن ہے۔ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ کہ یہ دُعا مانگوں۔ کہ خدا ہندوستان کے ذمہ دار کارخانوں کو دوسروں کی مشکلات کی قدر کرنا سکھائے۔

۳۔ ہزار داستان کی آئندہ اشاعت سے مختصر افسانوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ یہ افسانے اس اعتبار سے ایک اہم خصوصیت رکھتے ہیں۔ کہ ان کا ماخذ واقعات ہیں۔ اور واقعات بھی ایسے جن کے متعلق ضروری تحریرات موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی مہیب نوعیت اس امر کی متقاضی ہے۔ کہ ان کو تخئیل کی کم ازکم آمیزش سے دلچسپ افسانوں کی صورت میں ڈھال دیا جائے تاکہ یہ افسانے حضرت سلیمانؑ کے اس قول کا ایک بین ثبوت بن جائیں۔ کہ "سچے واقعات جھوٹی کہانیوں سے زیادہ حیرت انگیز ہوتے ہیں"۔

۴۔ پچھلی اشاعت میں "تخلیق موسیقی" کی تصویر کے نامور مصور مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کا نام فہرست مضامین میں نہیں چھپا۔ اس سہو کے لئے میں نادم ہوں۔ آئندہ اشاعت میں اس مشہور صناع کی ایک لاجواب تصویر "شہیدِ عشق کی تربت" زینتِ اوراقِ ہزار داستان ہوگی۔

۵۔ میں مسٹر گرودت سوندھی ایم۔اے۔آئی۔ای۔ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے اپنے نادر تخئیل کا اِک بے بہا نتیجہ" واے حسرت" ہزار داستان کے لئے عنایت فرمایا۔ اُردو میں غالباً ممدوح کی یہ پہلی کوشش ہے۔ مگر ایک پختہ کار دماغ جس کی سحر طرازیاں ابتک ادب انگریزی کے لئے وقف تھیں اپنی ملکی زبان میں جو کرشمے دکھا سکتا ہے انکا ثبوت یہ مختصر افسانہ ہے۔

۶۔ "معجزاتِ ادارت" تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اسکا مقصد صرف تفریح وتفنن ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اسے صرف اسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔

۷۔ منشی پریم چند صاحب اور مسٹر سدرشن کا شکریہ ادا کرنا میرے امکان سے باہر ہے۔ کہ انہوں نے اپنے نادر نتائج فکر کے لئے ہزار داستان کو منتخب کرلیا ہے۔ ہزار داستان کی پہلی تینوں اشاعتوں کا ان ممتاز افسانہ نویسوں کے جواہر تخئیل سے مالا مال ہونا یقیناً ایک نمایاں خوش قسمتی ہے۔

۸۔ غالب مرحوم کے رنگ کو ان ہی کی ایک لاجواب غزل کی تضمین میں قائم رکھنا مولانا سہا کا ہی حصّہ ہے۔ اس دعوے کی تصدیق کے لئے میں ناظرین کی توجہ خاص طور پر آج کی اشاعت کی اس قابلِ قدر زینت کی طرف منعطف کرنے کا آرزومند ہوں۔ ایڈیٹر

اثرِ غالب

دامانِ دِل بوہمِ تماشا نہ کھینچیے
اے مدعی خجالتِ بے جا نہ کھینچیے
تا چند نازِ مسجد و بتخانہ کھینچیے
جوں شمع دِل بخلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وُہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے
دیدارِ دوستانِ لباسی ہے ناگوار
صورت بہ کارخانہ دیبانہ کھینچیے

دفینہ

(۱)

بابو ہری داس اینٹوں کا روزگار کرتے تھے۔ اُنکا پزاوہ شہر سے متصل تھا۔ قرب وجوار کے دیہاتوں سے سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے روزانہ آتے اور پزاوے سے اینٹیں سروں پر اُٹھا اُٹھا کر اُوپر قطاروں میں لگاتے۔ ایک آدمی پزاوے کے دروازے پر ایک ٹوکری میں کوڑیاں لئے بیٹھا رہتا تھا۔ مزدوروں کو اینٹوں کی تعداد کے اعتبار سے کوڑیاں تقسیم کرنا۔ جتنی زیادہ اینٹیں ہوتیں اُتنی ہی زیادہ کوڑیاں ملتی تھیں۔ اس لالچ میں اکثر مزدور اپنی قوت برداشت کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ بوڑھی عورتوں اور کمسن بچوں کو اینٹوں کے بوجھ سے اکڑے ہُوئے دیکھنا کشمکش حیات کا بڑا عبرتناک نظارہ تھا۔ کبھی کبھی ہری داس خود آکر کوڑی والے کے پاس بیٹھ جاتے اور مزدوروں کو اور زیادہ اینٹیں لانے کا بڑھاوا دیتے۔ یہ نظارہ اور بھی عبرتناک ہوجاتا تھا جب اینٹوں کو کسی خاص ضرورت سے جلد باہر نکالنے کی ضرورت درپیش ہوجاتی۔ اُس وقت مزدوری دوچند کردی جاتی۔ اور مزدور اپنے مقدور سے دوگنی تعداد لیکر چلتے۔ ایک ایک قدم چلنا دشوار ہوجاتا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شل۔ پزاوے کی راکھ سے رنگے ہُوتے۔ اینٹوں کا ایک پہاڑ سر پر لئے ایک ایک قدم سنبھل کر رکھتے گویا سر پر ہوس کا بھوت سوار ہے۔ سب سے دردناک صورت ایک لڑکے کی تھی۔ جو ہمیشہ اپنی عمر کے لڑکوں سے ڈیوڑھی اینٹیں اُٹھاتا اور سارے دن ایک لمحہ کے لئے بھی دم نہ لیتا۔ اس کے چہرہ پر ایک دردناک مسکینی چھائی رہتی تھی۔ جسم کی لاغری نے صورت کو اور بھی قابل رحم بنادیا تھا۔ اس میں طفلانہ شوخی و شرارت، زندہ دلی اور کھلاڑی پن کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہ آتی۔ اور لڑکے دوچار کھیپ کے بعد آرام کرتے، کوئی بنئے کی دوکان سے گڑ لاکر کھاتا۔ کوئی چبینہ کھاتا۔ کوئی سڑک پر آنے جانیوالوں یکّوں اور موٹروں کا تماشہ دیکھتا۔ اور کوئی معرکہ میں اپنے دست و بازو کے جوہر دکھاتا لیکن یہ غریب لڑکا مایوسانہ عزم اور پیرانہ متانت کے ساتھ مصروفِ کار رہتا تھا۔ بابو ہری داس کو اس پر ترس آتا۔ کبھی کبھی کوڑی والے کو اشارہ کرکے اینٹوں کی تعداد سے زیادہ کوڑیاں دلا دیتے۔

ایک دن اُنہوں نے اُس کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور

اُس کے حالات پوچھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ اُس کا گھر قریب کے ایک موضع میں ہے۔ گھر میں ایک بڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ بھی کسی کہنہ مرض میں مبتلا ہے۔ گھر کا سارا دارومدار اُسی لڑکے کے سر ہے۔ کوئی اُسے روٹیاں پکا کر دینے والا بھی نہیں۔ یہاں سے شام کو جاتا ہے۔ تو اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتا ہے۔ اور ماں کو کھلاتا ہے۔ ذات کا ٹھاکر ہے۔ مگن سنگھ نام ہے۔ ایک زمانہ میں اُسکا خاندان سارے علاقہ میں ممتاز تھا۔ لین دین ہوتا تھا۔ شکر اور گڑ کا کاروبار بھی تھا۔ مگر بھائیوں کی رقابت اور حسد نے گردشِ تقدیر کے ساتھ مل کر اُسے اب نانِ شبینہ کو بھی محتاج کر دیا ہے۔

ہری داس نے پوچھا گاؤں کے لوگ تمہاری کچھ مدد نہیں کرتے؟

مگن سنگھ۔ ان کا بس چلے تو مجھے مار ڈالیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر میں روپے گڑے ہوتے ہیں۔ انہیں مار ڈالیں تو روپے مل جائیں۔

لڑکا ذہین اور فہیم تھا۔ اس کے اخلاق نے بابو صاحب کو گرویدہ کر لیا۔ دوسرے دن سے انہوں نے اس کی تنخواہ مقرر کر دی۔ اور اُسے کوڑیاں تقسیم کرنے کا منصب ملا۔ پزاوے کے منشی جی کو تاکید کر دی۔ کہ اس لڑکے کو کچھ پڑھا دیجئے۔ بیکس کے نصیب خفتہ بیدار ہو گئے۔

(۲)

مگن بڑا حاضر باش، وقت کا پابند لڑکا تھا۔ ملازمت کئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا۔ نہ ایک دن کی رخصت لی۔

برسات کے دن تھے پزاوے کا کام بند تھا۔ مگن متواتر تین دن سے غیر حاضر تھا۔ ہری داس کو اندیشہ ہوا کہیں بیمار تو نہیں ہوا۔ اُس پر انہیں کامل اعتماد تھا۔ اینٹوں کا سارا اسٹاک اس کے اعتبار پر چھوڑ دیا تھا۔ کئی آدمیوں سے دریافت کیا۔ پر کچھ تحقیق نہ معلوم ہوا۔ چوتھے دن وہ پوچھتے پوچھتے مگن سنگھ کے گھر پہنچے۔ مکان واقعی کسی زمانہ میں محل ہوگا گو اس وقت اس کا بیشتر حصہ کھنڈر ہو گیا تھا۔ اُن کی آواز سُنتے ہی مگن باہر نکل آیا۔ ہری داس نے پوچھا کئی دن سے نہیں آئے۔ طبیعت کیسی ہے؟

مگن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولا۔ اماں آجکل بہت بیمار ہیں کہتی ہیں۔ اب نہ بچونگی۔ کئی بار آپ کو بلانے کے لئے مجھ سے کہہ چکی ہیں۔ میں مارے لحاظ کے آپ کے پاس نہ جاتا تھا۔ اب آپ آگئے ہیں تو چلکر ذرا دیکھ لیجئے۔ اُن کو تسکین ہو جائیگی۔

بابو ہری داس اندر گئے۔ در و دیوار سے بیکسی ٹپک رہی تھی۔ سرخی، کنکر، اینٹ کے ڈھیر جا بجا پڑے ہوتے صرف دو کمرے گذر کے قابل تھے۔ ویرانی کی زندہ صورت

تھی۔ مگن سنگھ نے اُنہیں ایک کوٹھری میں آنیکا اشارہ کیا۔ وہ اندر گئے تو دیکھا۔ ایک بوسیدہ ٹاٹ پر مریضہ پڑی ہوئی ہے نقاہت اور نحافت بیکسی کے آغوش میں مُنہ چھپائے ہوئے تھی۔ مگن سنگھ بنئے کی دوکان پر شکر لانے گیا کہ بابو صاحب کو شربت پلاوے۔ اتنی ہی خاطر سہی۔ اور وہ کس قابل تھا!

ہری داس کی آہٹ پاکر مریضہ نے آنکھیں کھولیں۔ قیافہ سے پہچان گئی۔ ضعیف آواز میں بولی۔ آپ آگئے۔ آپ کے درشن کرنے کو بہت جی چاہتا تھا میرے لاوارث لڑکے کے وارث اب آپ ہی ہیں۔ جیسے آپ نے ابتک اس کی پرورش کی ہے۔ وہی نگاہ آگے بھی رکھئیگا۔ میری مصیبت کے دن پورے ہوگئے۔ میری مٹی کو ٹھکانے لگا دیجئے گا۔ اس گھر پر ایک دن لچھمی کی نگاہیں تھیں۔ جب سے دن بُرے آئے اُنہوں نے بھی آنکھیں پھیرلیں۔ بزرگوں نے اسی دن کے لئے کچھ روپے دھرتی ماتا کو سونپ دئے تھے۔ جگہ کا پتہ اس بیجک سے چلیگا۔ مگن کے باپ نے بہت دُکھ سہے۔ پر یہ بیجک نہ ملا۔ ان کی تقدیر میں آرام کرنا نہ لکھا تھا ان کے مرنے کے بعد ردّی کے بوروں میں مجھے یہ بیجک مل گیا۔ تب سے اُسے چھپا کر رکھے ہوئے ہوں۔ میرے سرہانے جو صندوق ہے۔ اسی میں رکھا ہوا ہے۔ سب پتہ ٹھکانا اس میں لکھا ہے۔ اُسے کھُدوا ئیگا۔ اگر دشمن لوگ اکھاڑ نہیں لے گئے ہیں۔ تو روپے ضرور ملیں گے۔ مگن کو دیدیجئے گا۔ میں

نے یہ بھید اس سے اب تک نہیں کھولا ہے۔ اس کے گُن سبھاؤ کو دیکھتی تھی۔ کپوت دیکھتی تو بیجک اپنے ساتھ لیجاتی پر آپ کی دیا سے لڑکا ہونہار ہے۔ دھن پا جائیگا۔ تو ایک بار پھر اپنے خاندان کا نام روشن کردیگا۔

ہری داس نے اس بیجک کے راز کو پوشیدہ رکھا۔ مگن سنگھ کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے گھر میں بھی کسی سے نہ کہا۔ نیّت میں فتور آگیا۔

اس مکان سے میل بھر پچھم کی طرف ایک مندر کے چبوترے کے نیچے ایک تہ خانہ میں دفینہ رکھا ہوا تھا۔ بیجک میں مفصل پتہ درج تھا۔

ہری داس دفینہ پر تصرف کرنا چاہتے تھے۔ اور اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کام مشکل تھا۔ نیک نامی پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ جو دُنیا میں سب سے بڑی سزا ہے۔ شام کو سیر کرنے کے بہانے نکل جاتے۔ جب چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔ تو مندر کے چبوترہ پر آبیٹھتے۔ پہلو میں ایک تیز کُدالی چھپی رکھتی تھے۔ چبوترہ کو اُس سے کھودنا شروع کرتے۔ دن کو بھی ایک دو بار اُدھر تاک جھانک کرتے۔ کہ کسی کی نگاہ چبوترہ پر تو نہیں پڑ رہی ہے۔ رات کو اندھیرے میں اینٹوں کو ہٹاتے ہوئے اُنہیں خوف ہوتا تھا۔

چبوترہ لمبا چوڑا تھا۔ اُسے کھودنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ آجکل اُن کی حالت ایک چلّہ کش کی سی تھی ہمیشہ

گم سم گم رہتے۔ اگر کوئی چھیڑ کر باتیں کرتا۔ تو جھنجھلا پڑتے کسی خیال میں محو رہتے۔ پزاوے کی طرف بہت کم جاتے۔ اصول پرست آدمی تھے۔ بار بار دل اس سعی فاسد سے نفور ہوتا۔ اپنے کو نفرین کرتے۔ مگر شام ہوتے ہی ان پر ایک وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ بلاکشانِ محبّت کی طرح کوئے یار کی طرف روانہ ہو جاتے۔ یہانتک کہ دوسرے مہینہ کا آخری دن آپہنچا۔ آج انہیں معمول سے زیادہ محنت کرنی پڑی۔ منزل مقصود سامنے نظر آرہی تھی۔ دوسرے دن کے لئے پھر کہیں زحمت باقی رہے۔ بارہ بجے رات تک وہ اُسی چبوترے پر بیٹھے اینٹیں نکالتے رہے۔ اتنی شدید محنت کے بعد تہ خانہ کی سطح سنگین نظر آئی۔ علم کو عین الیقین کا درجہ حاصل ہوا۔

گھر کی طرف چلے تو باوجود سخت تکان کے اُن کی طبیعت شگفتہ تھی۔ تخیل سُنہری خواب دیکھنے میں مصروف تھا۔ پزاوے میں اب اینٹیں نہ پکائی جائینگی۔ نئی ایجاد کے مطابق ریت کو باریک پیسکر اینٹیں بنائی جائینگی۔ اس کے لئے مشینری یُوروپ سے منگائی جائیگی۔ تھوڑے دنوں میں "ہری داس اینڈ سنس" کا نام بچّہ بچّہ کی زبان پر ہوگا۔ مگن سنگھ اُس کارخانہ میں شریک کرلیا جائیگا۔ سو روپے ماہوار کی تنخواہ اس کی پرواز فکر سے کہیں زیادہ ہوگی۔ نوچ کھسوٹ پر تو ہستی کا نظام ہی قائم ہے۔ اس سے کیونکر گریز ہو سکتی ہے فی الواقع روزگار کوئی ہو۔ اخلاق کے کتابی اصولوں کی اطاعت کرکے سرسبز نہیں ہو سکتا۔ یوں اگر دیکھا جائے۔ تو اصولاً کسی انسان کو اُس سے زیادہ پر تصرف کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔ جو اس کی فطری ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہے۔ وہ سرقہ ہے غنیمت ہے۔ مگر اس اصول کی پابندی کون کرتا ہے۔ انہیں دلائل سے اپنے نفس کو بہلاتے ہوئے بابو ہری داس مکان پر پہنچے۔ اور کھانا کھا کر لیٹے۔ ذرا دیر میں ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ سمجھے تکان ہے ایک گھنٹہ میں بخار چڑھ گیا۔ اُسے بھی تکان سمجھے۔ بخار کی شدت بڑھتی گئی۔ صبح ہوتے ہوتے ان کی حالت ردی ہو گئی ڈاکٹر نے دیکھا دوا دیکر چلا گیا۔ مگر کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔ تین دن وہ ایک نیم غشی کی حالت میں پڑے رہے۔ چوتھے دن پروانہ آپہنچا۔ بیماری کے دوران میں جب ذرا طبیعت سنبھلتی اور ہوش آتا۔ تو انہیں گمان ہوتا۔ عجب نہیں یہ میری نیّتِ خام کی سزا ہو۔ جی میں آتا مگن کو بیجک دیدیں۔ اس سے عذر تقصیر کریں۔ مگر افشائے راز کا خوف مانع تھا۔

(۴)

ہری داس کی وفات کے بعد اُن کے نوجوان صاحبزادے بابو پربھو داس کو کارآمد کاغذوں میں بڑی احتیاط سے رکھا ہُوا بیجک ملا۔ بیجک مگن سنگھ کے بزرگوں کا لکھا ہوا تھا دفینہ اُس کے بزرگوں کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔

بابو ہری داس کی نیّت بھی ظاہر ہو گئی۔ والد کی کج باطنی پر تعجب ہوا۔ کتنے راستباز، دیانت پرور آدمی تھے۔ لوگ اُن کا کتنا اعتبار کرتے تھے۔ اُنہوں نے اس بیجک کا راز پوشیدہ رکھا۔ تو کچھ سمجھ کر ہی۔ مَیں اُس میں شاخسانے کیوں نکالوں۔ نوجوان آدمی تھے۔ دل میں عروج اور ثروت کے ولولے تھے۔ دفینہ ہاتھ آجائے۔ تو زندگی کتنے آرام سے گزرے۔ لاکھوں روپے ہونگے۔ ممکن ہے دس پانچ لاکھ ہوں۔ پھر تو شہر بھر میں ہی نظر آونگا۔ اچھے اچھے رئیسوں کا سر جھکا دونگا۔ اور دکھا دونگا کہ دولت کا بہترین استعمال کس طرح ہونا چاہیے۔ ارادہ مضبوط ہو گیا۔ شام ہوتے ہی گھر سے نکلے۔ وہی وقت وہی تیر، کُدالی۔ وہی چوکنی نگاہیں معلوم ہوتا تھا۔ بابو ہری داس کی مُردہ آرزو نے یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

چبوترے کی سطح پہلے ہی کھُد چکی تھی۔ اب سنگین تہ خانہ تھا۔ جوڑوں کا ہٹانا مشکل۔ پُرانے زمانہ کا مسالہ تھا۔ کُدالی اُچٹ اُچٹ کر لوٹ آتی تھی۔ کئی دنوں میں اُوپر کی درازیں کھُلیں۔ مگر چٹانوں کا ہٹانا دشوار۔ بہت زور لگایا مگر تختوں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ پارے ثبات تھا جو کسی طرح ہلتا ہی نہ تھا۔ کسی کی مدد خارج از بحث تھی۔ سب کچھ اپنے ہی ہاتھوں کرنا تھا۔ رات گزرتی جاتی تھی۔ یہانتک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ پر تختوں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل تھے۔

اس حالت میں دفینہ کو چھوڑ کر جانا بھی مشکل تھا۔ کسی کی نگاہ پڑ جائے تو دل کی تمنا دل ہی میں رہ جائے۔ یہ مرحلہ آج ہی طے کرنا تھا۔ قسمت کی بازی آج ہی کھیلنی تھی۔ وہ تھک کر اُسی تختہ پر بیٹھ رہے۔ اور سوچنے لگے کیا کروں۔ گھر کے لوگ متفکر ہونگے۔ کوئی علاج نہیں۔ دفعتہً انہیں خیال آیا۔ کیوں نہ بارود سے کام لوں۔ فوراً بازار کی طرف چلے۔ دو میل کا راستہ ہوا کی طرح طے کیا۔ مگر دوکانیں بند تھیں۔ آتشباز نے غرضمند دیکھا۔ حیلے کرنے لگا۔ اس وقت بارود نہیں مل سکتی۔ دوکان بند ہے۔ رات کو سودا بیچنا سرکاری حکم کے خلاف ہے۔ آپ کون ہیں؟ بارود لیکر کیا کیجئیگا۔ کہیں کوئی حادثہ ہو جائے تو اُس کا ذمہ وار کون ہوگا؟ پربھو داس نے منت والتجا سے کام لیا۔ انہیں اپنے ضبط کو کبھی اسقدر پابندِ عنان نہ کرنا پڑا تھا۔ آخر روپے کی سُریلی جھنکار نے اُسے رام کیا۔ پربھو داس یہاں سے چلے تو معلوم ہوتا تھا مرادوں کی لاویز صدائیں کانوں میں آ رہی ہیں۔ مندر کے پاس پہنچے تو دو بج چکے تھے۔ ہُو کا عالم تھا۔ رات بھی اندھیری تھی۔ اُنھوں نے درازوں میں بارود رکھی۔ فلیتہ لگایا اور بھاگے۔ ایک لمحہ میں زور کا دھماکا ہُوا۔ چٹان اُڑ گئی۔ اندھیرا غار سامنے منہ کھولے ہُوئے تھا۔ یہ کنج لحد تھا یا آشیانۂ آرزو؟ ظلمات کی طرح تاریک مگر آب حیات سے پُر۔ جیبی لالٹین روشن کی اور تہ خانہ کی طرف جھانکا۔ پختہ فرش تھا۔ کسی چشمہ کے سطح بلوریں کی طرح صاف۔

خس وخاشاک کا نام نہیں۔ نہ کیڑے مکوڑوں کا گذر۔ بیخوف غار میں کود پڑے۔ پر اندر پہنچتے ہی اُن پر ہراس کا غلبہ ہوا۔ کہیں کوئی آکر مجھے اندر بند نہ کر دے۔ انھوں نے غار کے دروازے کو ایک ہاتھ سے پکڑے پکڑے اندر کا جائزہ لیا۔ دو بڑے خم دکھائی دیتے مُنہ پر سے ڈھکنا اُٹھایا۔ اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔

(۵)

صبح کا وقت تھا۔ پربھوداس اپنے کمرہ میں لیٹے ہوئے تھے سامنے لوہے کے صندوق میں پُوری دس ہزار اشرفیاں رکھی ہُوئی تھیں۔ ماں سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ پربھوداس کو شدّت کا بخار تھا۔ کروٹیں بدلتے تھے کراہتے تھے۔ مگر آنکھیں آہنی صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

مگن سنگھ اب پرزادہ کا منشی تھا۔ آکر بولا۔ پرزادے جلینگا گاڑی کھنچواؤں؟ پربھوداس نے اُس کی طرف آنکھیں اُٹھائیں اور رو پڑے۔ پھر دم لیکر بولے نہیں۔ تم بھی جلد چلے آنا۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔

مگن سنگھ نے اُن کے چہرہ کا رنگ دیکھا۔ ہوش اُڑ گئے۔ ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ ڈاکٹر نے آکر رسم ادا کی۔

پربھوداس کا بخار بڑھتا گیا۔ دس بجتے بجتے چہرہ پر مُردنی چھا گئی۔ ماں نے اُس کی صُورت دیکھی۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ پربھوداس کی حالت نزع کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ روتی تھی۔ اور پربھوداس کی حسرتناک آنکھیں اُسی صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

پربھوداس کی بیوی سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ دیر تک شوہر کے پائینتی کی طرف کھڑی روتی رہی۔ پربھوداس کے اعضاء سرد ہو گئے تھے۔ حرارت لمحہ بہ لمحہ غائب ہوتی جاتی تھی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ رُوح نکل گئی تھی۔ صرف حسرت باقی تھی۔ مگر حسرت بار نگاہیں صندوق کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

شام ہو گئی محلہ کے یار و اغیار کمرہ میں جمع تھے۔ بابو ہری داس کا ذکر خیر ہر ایک زبان پر تھا۔ بھگوان کو دُنیا منصف کہتی ہے مگر سچ پوچھو تو اس کے دربار میں انصاف نہیں۔ ورنہ کیا اس خاندان پر یہ آفت آتی۔ باپ اور بیٹے دونوں کا مزاج ایک تھا۔ شکل وصورت کتنی ملتی تھی۔ باپ کو نہ دیکھو بیٹے کو دیکھو۔ مہینہ دو مہینہ کے اندر خاندان کا چراغ گل ہو گیا اب کوئی نام لیوا اور پانی دیوا بھی نہیں! افسوس! یہ نیرنگیِ روزگار ہے۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر دوبارہ آئے مریض کو دیکھکر مایوسانہ انداز سے سر ہلایا۔ اس کا جسم بے جان تھا۔ رُوح ایک تمنّا کی صورت میں آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ دونوں آنکھیں صندوق کی طرف جمی ہوئی تھیں۔

اسی اثناء میں مگن سنگھ سامنے آیا۔ آنکھیں تر تھیں۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی پربھوداس کے اوسان

بجا ہو گئے۔ ایک لمحہ کے لئے اُن کے جسم میں حیات کی ایک برقی رو دوڑ گئی۔ اُنہوں نے تکیہ کے نیچے سے ایک کاغذ نکال کر مگن سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ تب آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ہی لمحہ کے بعد گھر سے ماتم کی دلخراش صدائیں بلند ہو گئیں۔

وہ کاغذ وہی بیجک تھا۔ اس کے پشت پر پربھو داس نے یہ الفاظ لکھے تھے۔ میں نے تمہارا حق غصب کرنا چاہا تھا۔ اس کے لئے معاف کرنا۔ تمہاری دولت آہنی صندوق میں محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ تم اس کے مالک ہو۔ اس غریب خاندان کی پرورش کا بار تمہارے سر ہے۔ رخصت

پریم چند

جنونؔ اچھا

نہ کچھ سعیِ طلب اچھی، نہ حاصل کا سکون اچھا
دو عالم دور افتادہ رہیں، اپنا جنون اچھا

سرِ محفل بھی سر ہو جائے گا اِک نالۂ سوزاں
کریں گے اب تیرا کہنا ہی اے دردِ دروں اچھا

گل افشانی تیری گفتار کی معلوم ہے سب کچھ
مگر حسرت رہی جاتی ہے میں بھی تو سنوں اچھا

کبھی اہلِ نظر کی جستجو ہو گی تو دیکھیں گے
پھری جاتی ہے ہم سے؟ ہاں نگاہِ پرفسوں اچھا

نہ دیکھو، پھیر لو منہ، خوش رہو، یہ چھیڑتے کیوں ہو
تمہیں کیا فکر؟ میں جانوں مرا حالِ زبوں اچھا

خدا ہی شرم رکھے سادگیٔ ظلمِ خوباں کی
بُرائی کر کے یہ بھی چاہتے ہیں میں کہوں اچھا

جو اُس کی آستیں میں جذب ہونے کے لئے نکلے
تو اکثر خندہ ہائے عیش سے اک اشکِ خوں اچھا

سہاؔ جس بات کو جی چاہتا ہے وہ نہیں ہوتی
بتاؤ تو کہ اس صورت سے پھر کیونکر جنوں اچھا؟

ہزار داستان قسم دوم

اکثر علم دوست اور ہمدرد کرمفرماؤں کے مشورے کی تعمیل میں اب کی اشاعت سے "ہزار داستان" کی ایک دوسری قسم شائع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ تاکہ محض قیمت کی گرانی جو کہ موجودہ کاغذ کی نوعیت کی بنا پر ناگزیر ہے۔ شائقین کو ہزار داستان کی خریداری سے باز نہ رکھے۔ اس میں صرف کاغذ اس درجہ کا نہ ہوگا۔ جو موجودہ قسم میں صرف کیا جاتا ہے۔ باقی مضمون تصویر اور دیگر تمام خوبیوں کے لحاظ سے دونوں اقسام میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔ قسم دوم کی قیمت سالانہ چھ روپے اور ششماہی تین روپے فی پرچہ ۸/ ہوگی۔ تناسب اور ارزانی کے اصول کو مدِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے۔ کہ ہزار داستان قسم اوّل کی ششماہی قیمت بھی بجائے ۵ روپیہ کے ۴ روپیہ کر دی جائے۔ چنانچہ آئندہ سے اسی شرح پر عملدرآمد ہوگا۔

تصاویر

ہزار داستان کی تصاویر رنگین، جو حضرات خریدنا چاہیں۔ ۲ فی تصویر چار آنہ قیمت ۸/ فرما کر دفتر ہزار داستان سے حاصل [illegible] ہیں۔

منیجر ہزار داستان

وائے حسرت

گاؤں کا پلا ہُوا نوجوان سمندر کے کنارے کی ریتی پر نہانے کے لئے تیار کھڑا تھا پچھلے پہر کا سُورج جو بادلوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ اس وقت اس کے سڈول جسم پر چمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کرنوں نے اُمنگوں کا جذبہ اور زندگی کا احساس اس کے جسم پر پھیر دیا ہے

گذشتہ شب کو وہ گاؤں کی چوپال میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے ماہی گیروں اور ملاحوں کی حیرت انگیز باتوں کو بہت توجہ سے سُنا تھا کئی ایک اس کنارے پر جہاں وہ اس وقت کھڑا تھا جل مانسوں کو دیکھ چکے تھے۔ اور کئی ایک نے بحری اژدہا کو دُور سے سر نکالے ہُوئے سمندر کی سطح پر پیچ و تاب کھاتے دیکھا تھا۔

چونکہ یہ نوجوان ساری عمر سمندر سے دُور پلا تھا۔ وہ ماہی گیروں اور ملاحوں کی مبالغہ آمیز کہانیوں سے واقف نہیں تھا۔ اس نے سب باتوں کو سچ جانکر باور کر لیا تھا اور اس وقت اس کے دل میں ان قدرتی عجائبات کو دیکھنے کی تمنا بیقرار تھی۔

یکایک ڈوبتا ہُوا سورج جو بڑی تیزی سے چمک رہا تھا اور جس کی شعاعوں نے پانی میں گویا آگ لگا رکھی تھی۔ ایک بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا اور سمندر نے سوائے ان سُنہری قطعوں کے جہاں بادل میں سے چھن چھن کر کرنیں گر رہی تھیں پھر اپنا اصلی سبز اور نیلا رنگ اختیار کر لیا۔

نوجوان نے سمندر کی طرف دیکھا۔ پر اسے سنسان سمندر کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس نے دُور سطح سمندر سے ملتی ہوئی افق پر نظر ڈالی۔ اسے کسی کشتی کا بادبان نظر آیا۔ لیکن یہ کیا تھا؟ سمندر کے ایک سنہری قطعے میں کوئی سفید اور چمکدار چیز تیر رہی تھی۔ نوجوان پانی میں کودا اور تیرنے لگا۔ کیا یہ تیرتی ہوئی چیز انسانی جسم سے مشابہت نہ رکھتی تھی؟

آہ۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا یہ سنہری بالوں والی عورت تو نہیں تھی۔ جس کو ملاحوں اور ماہی گیروں نے دیکھا تھا۔ وہی جن کو ایک حوصلہ والا مرد جیت سکتا تھا۔ وہی جس کو صرف انسان کا ہاتھ لگنے کی دیر تھی کہ فوراً ایک خوبصورت نازنین بن جائیگی؟

اس کا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جوانی کی بیقرار رُوح اس کی آنکھوں میں چمک اُٹھی۔ اور جسم کے اندر خون ایک سیل آتشیں کی طرح دورہ کرنے لگا

آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور اپنے کم عمر لیکن مضبوط بازوؤں سے پانی کو ہٹا ہٹا کر دُور نکل گیا۔

اچانک سُورج پھر نکل آیا۔ اور سمندر طلائی ابرق کی طرح جھلکنے لگا۔ اور ...... اور وہ چمکتا ہوا جسم آس پاس کی روشنی میں تحلیل ہو گیا۔ لیکن نوجوان مستعدی سے ہاتھ مارتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کوئی سو گز تیر گیا ہوگا۔ کہ سورج ایک سیاہ بادل کے ٹکڑے کے پیچھے پھر چھپ گیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ بحری نازنین اب اسے صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ اس کے نزدیک نہیں پہنچا تھا۔ کہ اُسے خیال آیا کہ سمندر کا چڑھاؤ بھی تو گھٹ رہا ہے۔ اور اپنے زور سے اس نازنین کو ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے لیکن کیا یہ صرف وہم ہی تھا۔ یا ایک سچی حقیقت کہ اس گل اندام نے اپنی خوبصورت کلائی سے اسے اشارہ کیا۔

سر کو نیچا کر کے نوجوان نے اور بھی زور زور سے پانی میں ہاتھ مارنے شروع کئے۔ اور دل میں ٹھان لی۔ کہ اسی ریلے میں اس نازنین کو پکڑ لیگا۔ اپنے خیال میں وہ کئی سو گز تیر گیا ہوگا۔ مگر جب اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ تو نازنین غائب تھی۔ کیا وہ اُسے اپنے نایاب حسن کا لالچ دے کے خود غائب ہو گئی تھی؟ نہیں وہ ذرا اور آگے نیلے پانی میں کلیلیں کر رہی تھی۔ اور اپنے ہاتھ کے اشاروں سے اسے بڑھنے کی دعوت دے رہی تھی۔

"میں اس دفعہ تو ضرور ہی اس کو قابو میں لے آؤں گا"

یہ ارادہ کر کے نوجوان نے پھر تیرنا شروع کیا۔ مگر اب تیرنے میں کچھ دِقّت محسوس ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ پانی گاڑھا ہو رہا ہے۔ اور اس میں آگے بڑھنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔

اب اس کی سانس پھول گئی۔ سمندر کے پانی کے گھونٹ اس کے مُنہ کے اندر جا رہے تھے لیکن جوانی کی آگ اور تعاقب کے شوق نے اس کے ارادہ کو کمزور نہ ہونے دیا۔ یہ سوچ کر کہ سر اُٹھا کر دیکھنا اس کے لئے مہلک ہوگا۔ اُس نے اس خواہش کو ضبط کئے رکھا۔ لیکن اب اس کے ہاتھ پیر اکڑ رہے تھے۔ سر اُٹھا کر دیکھنے کی خواہش نہ رُک سکی۔ اور اُس نے آنکھیں اُٹھائیں۔ لیکن وائے حسرت وہ نازنین ابھی دُور تھی۔ مگر ہاں اتنی دُور بھی تو نہ تھی۔ اور اس کے بالوں کے لطف حجاب سے اسے ایسا دکھائی دیا۔ کہ وہ شام کی ہلکی ہوا کی موجوں پر اسے پیغام محبت بھیج رہی ہے۔ سر نیچا کر کے اور دم روک کر اس نے اپنی رہی سہی طاقت آگے بڑھنے میں صرف کر دی۔ بس پندرہ ہاتھ اور پھر وہ نازنین سے جا لیگا۔ ایک۔ دو۔ تین ــ چار ــ آہ کس مشکل سے ہاتھ اُٹھتے تھے۔ بس ہر ایک بار یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ آخری دفعہ اُٹھ رہا ہے۔ تیرہ ــ چودہ ــ پندرہ ــ اس کا دِل اُچھل پڑا۔ اس کا ہاتھ اس نازنین

کے شفاف جسم کو چھونے کو ہے۔ بس ایک آخری کوشش اور وہ اپنے دل کی خواہش کو پالیگا۔ اس نے جسم کو زور سے آگے دھکیلا۔ اور اپنے داہنے ہاتھ سے نازنین کو پکڑ لیا مگر کیا وہ چھوتے ہی پگھل گئی۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ تو نازنین غائب تھی۔

جانکنی کی مایوسی سے اس نے کنارے کی طرف دیکھا۔ پر کنارہ دُور تھا۔ بہت۔ بہت ہی دُور تھا۔ پانی کی سطح پر صرف چند بُلبلے اُٹھے۔ اور پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔

سونڈھی

غالب اور سہا

عقل نے تھاما گریباں سعیِ پُرتقصیر کا ۔۔۔ زیست نے پکڑا ہے دامن مرگِ دامنگیر کا
ہے گلہ تقدیر کا یا کاتبِ تقدیر کا ۔۔۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کیا رہا ہے، بس ذرا قاتل کو چھیڑا چاہیئے ۔۔۔ اک بہانہ چاہیئے، یا اک اشارا چاہیئے
مژدہ اے ذوقِ شہادت اور کیا چاہیئے ۔۔۔ جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

ملنے والے ولولوں کی کارفرمائی نہ پوچھ ۔۔۔ یاس اور امید کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
ہجر میں کیا کیا ہوں وقفِ ناشکیبائی نہ پوچھ ۔۔۔ کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

وہ مزے رازونیازِ بے خودی میں ہم نے پائے ۔۔۔ نالہ و شیون میں اظہارِ تمنا کے بجائے
قصۂ غم کہہ بھی جائیں حرف بھی لب تک نہ آئے ۔۔۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

خیر اچھا ہے اگر گلشن چھٹا صحرا چھٹا ۔۔۔ دل سے ہے ویرانہ سہا اور سر میں گلشن کی ہوا
سوزِ پنہاں سے بصد انداز طپیدن رہ گیا ۔۔۔ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

روزا

شام ہونے کو تھی، مہر جہان افروز کو بارگاہ فطرت سے فرمانِ معطلی مل چکا تھا۔ اور وہ اپنی ان گرم جفاؤں پر جو اس نے بارہ گھنٹے کے دورانِ حکومت میں دُنیا والوں پر توڑی تھیں پشیمان و نادم، شرمندہ و خجل، رختِ سفر باندھکر نہایت سرعت کے ساتھ سرگرم رفتار تھا۔ اس کا وہ زرین اور تابناک چہرہ جس کی تمازت نے دن بھر دُنیا والوں کو بیچین و مضطرب رکھا۔ اب بے نور اور زرد ہو گیا ہے۔ گویا وہ اپنی بیجا دست درازیوں پر متاسف ہے!

دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی مسافت بعجلت طے کر لی۔ اور جس وقت اسکا مایوس و مغموم چہرہ، نصف پردۂ ظلمات میں پوشیدہ ہو چکا تھا۔ اس نے ذرا سستانے کے بہانے ٹھیر کر اپنی سلطنت ماضیہ کو ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دوشیزہ آدھا چہرہ ڈھانپے غرفہ سے جھانک کر معالۂ منظر سے بہرہ اندوز مسرت و انبساط ہو رہی ہے۔ اور پھر لرزتا کانپتا ٹھٹکتا مچلتا روانہ ہوا۔ آہ! بالکل آخر میں اس نے ایک مضطرب جست کر کے دُنیا کو ایک مرتبہ اور دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور غائب ہو گیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی مشک بو بادِ بہاری کے متصل جھونکے آہستہ خرامی کے ساتھ آئے۔ دو خدا جانے سرگوشی میں کیا مژدۂ رُوح پرور سنایا: کہ غنچہائے ناشگفتہ کھلکھلا کر خندہ زن ہوئے۔ عندلیبِ خوشنوا نے چہکار الیا۔ کبک دری نے قہقہ لگایا۔ اور سب طائرانِ چمن نغمہ سنج بہار ہو گئے۔ انہار لطافت بار نے جو گلشن کے ہر چہار طرف، عشقِ ہیجان کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک کروٹ لی۔ اور شوخی سے اچھل اچھل کر دِل تڑپا دینے والے انداز میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہنے لگیں۔ بیچ میں نکلا ہوا پتھر جو گھڑی گھڑی سنگِ راہ ہو جاتا ہے۔ تو تیوری چڑھاتی، متبسم لب پر عمداً غصّہ لا کر بل کھاتی۔ اپنی ساعدِ سیمین سے اس کو ہٹانے کی ناکام جہد کرتی، شرماتی ہوئی سمٹ کر نکل جاتی ہیں۔

عام آمد و رفت سے مصئون باغ سے دُور ایک گوشے میں جہاں چند گلاب کے درخت چاروں طرف سے جُھک کر کچھ ایسے مل گئے ہیں۔ کہ بیچ میں ایک دروازہ سا بن کے رہ گیا ہے۔ وہاں ایک حسن کا مجسمہ حسین، ایک نور کا فوّارہ نازنین، ایک عجیب انداز میں جس سے وحشت، خوف، یاس اور انتظار مترشح ہے۔ دستِ نگارین سے ایک گلاب کی ٹہنی پکڑے جھکی کھڑی ہے! آہ قابلِ صد رشک گلاب کی ٹہنی! وہ گھڑی گھڑی جھک کر سرِ ایک پتہ تک نظر دوڑاتی ہے لیکن [illegible] جیسے پر گھٹائیں جھک جاتی ہیں۔ دفعۃً اس کی [illegible]

چمک اُٹھیں، چہرہ ارغوانی ہو گیا!!

دُور سے ایک نوجوان خوبرو کشیدہ قامت مگر حواس باختہ تیز قدمی کے ساتھ اسی جانب چلا آ رہا ہے۔ جس وقت وہ اس حصّہ زمین پر جو اس ماہتاب حسن کی ضیا پاشیوں سے قطعۂ نور بنا ہوا تھا۔ داخل ہوا تو ایک نقرئی اور سریلی آواز فضا میں تھرائی "پیارے البرٹ تم آ گئے" نوجوان کی متجسس نگاہیں آواز کے ساتھ وہاں پہنچیں۔ اور دونوں لپک کر ہم آغوش تھے۔ "میری جان، میری آرزو، تجھے ضرورت سے زیادہ منتظر رہنا پڑا۔ اس اتفاق کا بُرا ہو۔ میری پیاری کو زحمتِ انتظار گوارا کرنی پڑی۔ روزا، میری روح کی زندگی۔ روزا آہ تو ساحرہ ہے، تو نے اس دل کو ایسا مسحور کیا۔ کہ تیرے بغیر اس کو ایک لمحہ چین، ایک ثانیہ قرار نہیں میں سوتا ہوں تو تیرے حسین خیال کو اپنے آرزو مند دل میں لئے۔ اور بیدار ہوتا ہوں تو ایک نئی تمنا پیدا کئے۔ پیاری روزا! کیا تیرے ہر عضو میں مقناطیسی کشش ہے۔ کہ میں بلا ارادہ تیری طرف کھنچتا ہوں۔ آہ میری تمنائیں تیرا ہوں اور ہمیشہ تیرا"

یہ وہ بے سر و پا الفاظ تھے جو خود بخود البرٹ کے منہ سے نکل رہے تھے۔ روزا کے بشرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ اس بے وقت اظہارِ محبت سے مکدر ہے۔ اس نے کہا "خیر یہ باتیں تو فرصت کی ہیں۔ کیا تم وہ آخری فیصلہ سننے کے لئے تیار ہو۔ جو والد نے ہماری نسبت کیا ہے؟"

البرٹ پایانِ وحشت میں تھا۔ اس نے روزا کے ان اہم الفاظ پر غور نہ کیا۔ "میری آرام جان، میں وحشی ہوں، دیوانہ ہوں، مجنون ہوں، مجھے اجازت دے کہ میں تیرے حسن کی تعریف میں تمام عمر گزار دوں۔ اگر میری تمنا کچھ ہے۔ تو یہ کہ تو میرے روبرو ہو۔ اور میں تیرے حسن کی مدح سرائی کیا کروں۔ اور اگر آرزو ہے تو یہ کہ تو میرے سامنے ہو۔ اور میں تیری محبت کی قصیدہ خوانی کیا کروں"

روزا نے شرما کر کہا۔ "تم تو اپنے آگے کسی کی چلنے دیتے نہیں خیر فیصلہ تو سن لو"

البرٹ ٹھٹھک کے بولا۔ "کہہ اے حسن مجسم کہہ، تیری شیریں آواز سے میرے دل کو راحت، سرور اور شادمانی حاصل ہو گی"

روزا متانت سے بولی "ابا نے حکم دے دیا ہے۔ کہ میں تم سے آج کے دن سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ اور جواب صاف یہ دیا بلکہ کہا ہے۔ کہ وہ آئندہ سے تم کو اپنے احاطہ میں نہ دیکھیں..."

البرٹ بیتاب ہو کر چلا اُٹھا۔ "کون؟ روزا! کیا تو مجھ سے چھین لی جائیگی؟ او خدا! اس سے پہلے مجھے موت دیجیو۔ میری تمام خوشی اور شادمانی تباہ ہو گئی۔ میری خرمن امید پر بجلی گری آہ! روزا میں تیرے بغیر نہیں جی سکتا، نہیں زندہ رہ سکتا۔ ایک دن ایک ساعت"

روزا نے کہا، اس کے چہرہ سے استقلال ظاہر تھا۔ "میں تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ کہ سوائے تمہارے اور کسی کی نہ ہونگی، صرف والد کی اجازت درکار تھی۔ اب چونکہ قضیہ برعکس ہے۔ اور وہ نہیں چاہتے۔ لہذا میں حاضر ہوں۔ تم مجھے اپنے وطن لے چلو۔ اور پھر جب ہم وہاں شادی کی رسم ادا کر لینگے۔ تو کوئی کچھ نہ کہہ سکیگا۔"

البرٹ کو شادی مرگ کی سی کیفیت ہو گئی۔ "یا خدا! میں یہ کیا سن رہا ہوں، کیا پیاری روزا مجھ سے اس درجہ محبت کرتی ہے۔ کہ گھر بار عزیز اقارب سب کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہے۔" "ہاں میرے دل کی مسرت میں کل ہی تیار ہوں"

"لیجئے اب میں رخصت ہوتی ہوں کل تم ضرور آ جانا۔"

"ضرور، اے حسن کی دیوی ضرور!"

(۲)

دوسرے دن طلوع آفتاب سے قبل، صبح کے دھندلکے میں روزا اور البرٹ گھوڑوں پر سوار ایک سنسان سڑک پر تیز تیز چلے جا رہے ہیں۔ راستہ نہایت دشوار گزار ہے۔ کیونکہ آج تمام رات برف و باد نے وہ رنگ جمایا۔ کہ الامان والحفیظ میدان، ٹیلے، پہاڑ کی چوٹیاں، برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سمندر طغیانی پر تھا۔ اور لہریں جو کنارے سے آ کر ٹکراتیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ جھوم جھوم کر آپس میں ایک ساتھ جھلا دی گئیں۔ انسان کا زہرہ دیکھنے سے آب ہوا جاتا ہے۔ دونوں نے سمندر کی طرف

باگ اُٹھادی۔ اور کنارۂ دریا پر پہنچکر ایک ملاح سے جو سردی کی وجہ سے اپنی چھوٹی سی کشتی کو درخت سے باندھ کر لبادہ اوڑھے سکڑا ہوا پڑا تھا۔ التجا کے لہجے میں کہا۔ "ملاح! ہم تمہارے نہایت ممنون احسان ہونگے۔ اگر تم ہمیں فی الفور اس پار لیچلو جو کچھ اُجرت چاہو لے لینا"

ملاح نے چونک کر ان کی طرف دیکھا "آپ کون ہیں کہاں سے آتے ہیں۔ اور ایسے خوفناک وقت جبکہ سمندر میں تلاطم برپا ہے۔ آپ کس طرح پار جانے کی ہمت کرتے ہیں"

"آہ! یہ نہ پوچھو! ہمیں جرم اُلفت میں سزا ملنے والی ہے خُدا کے واسطے جلدی کرو۔ اگر وہ آگئے۔ تو۔ . . . .

"مَیں تیار ہوں، بالکل تیار، کسی مالی فائدے کی غرض سے نہیں، بلکہ تمہاری محبت کی خاطر، گو سمندر زوروں پر ہے۔ مگر مَیں تمہیں پار پہنچانے کے لئے انتہائی کوشش کرونگا"

جس وقت ملاح نے یہ بات ختم کی، دفعتہً ایک ابر تیرہ و تار اُٹھا، ہوا چلی، آندھی اُٹھی، جھکڑ چلنے لگے، بڑے بڑے درختوں کے گرنے کی آوازیں آئیں۔ مینہ موسلا دھار برسنا شروع ہوا۔ سمندر کی لہریں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔

دفعتہً گھوڑوں کے پاؤں کی آواز آئی۔ روزا پریشان ہوکے چلّا اُٹھی۔ "خُدا کے واسطے، خُدا کے واسطے جلدی کرو۔ وہ آپہنچے۔ آہ! مَیں امواج آتش فشاں کا، خوفناک سمندر کا، مقابلہ، بڑی دلیری، بڑی شجاعت سے کرسکتی ہوں۔ لیکن ایک غضب آلود باپ کا سامنا نہیں آہ ہرگز نہیں کرسکتی۔ جلدی جلدی آہ ملاح جلدی"

کشتی پُرخطر زمین کو پس پشت چھوڑ کر اب اس بحر ذخار کی خوفناک لہروں سے کشمکش میں مشغول تھی۔ اس وقت کشتی کو قابو میں رکھنا قبضۂ انسانی سے باہر تھا۔ ملاح نے پتوار چلانا چھوڑ دیا۔ اور کشتی خود بخود ڈگمگا ڈگمگا کر بہنے لگی تھوڑی دیر میں روزا کا باپ کنارے پر آپہنچا۔ وہ غصّہ میں تھا۔ اس کے مُنہ سے کف جاری تھے۔ اس کا خون کھول رہا تھا لیکن جب اُس نے اپنی بیٹی کو اس بیکسی کی حالت میں دیکھا، کہ کشتی تہ و بالا ہو رہی ہے۔ اور روزا ایک ہاتھ اپنے محبوب کی کمر میں ڈالے دوسرے ہاتھ سے کسی کی مدد تلاش کر رہی ہے۔ تو اُس کا غصّہ مبدل بہ آہ و زاری ہوگیا۔ وہ رویا، پیٹا، چیخا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اور بال نوچتے ہوئے چلّایا۔ "آہ واپس آجاؤ واپس میری نورِ نظر مَیں نے البرٹ کو معاف کیا۔ ارے یہ سمندر یہ طغیانی۔ ہائے واپس پیاری بیٹی واپس" کشتی اسی طرح چکّر کھاتی، ایک بھنور میں جا پڑی۔ اور نظروں سے نہاں ہوگئی۔ روزا کا باپ اسی طرح کھڑا پکارتا رہا۔ لیکن سوائے اس کی صدائے بازگشت کے کوئی جواب نہ ملا۔

(۳)

ٹھیک بارہ بجے جبکہ آفتاب عالمتاب عین سمت الراس پر تھا۔ دریا کی سطح نیلگوں پر دو لاشیں ابھریں، وہ باہم اسقدر پیوستہ تھیں، کہ یہ شناخت کرنا مشکل تھا۔ کہ آیا یہ ایک ہے یا دو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ حُسن و عشق نہایت گرمجوشی کے ساتھ آپس میں بغلگیر ہیں۔ دریا کی متبسم لہریں، اپنی لانبی لانبی، نازک اُنگلیوں سے سازِ محبت کے ان دو شکستہ تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر دوبارہ نغمہ ریز کرنے کی بے سود کوشش کر رہی تھیں۔

حیدر (از اجمیر)

بہارستان کا آسیب

"آجکل کوہ مری میں نہ تو کوئی مکان خالی ہے۔ نہ کسی ہوٹل میں ہی رہنے کی جگہ ہے۔ اس لئے ہم آپ کو بھی مشورہ دیتے ہیں۔ کہ آپ مری میں قیام کرنے کی جگہ براہِ راست کشمیر تشریف لے جائیں۔ ہاں یہاں ایک بنگلہ خالی ہے اور وہ سات برس سے خالی ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی شخص رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی نسبت عجیب عجیب روائتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ آج سے سات سال پہلے کئی لوگوں نے اس میں رہنے کی ہمت کی۔ مگر صبح کو اُن کی لاش برآمد ہوئی۔ اور جو زندہ رہے۔ وہ عقل و ہوش سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بار بار کے تجربے سے مایوس ہو کر اب کوئی شخص وہاں رہنے کا حوصلہ نہیں کرتا۔ اس بنگلہ کو "بہارستان" کہتے ہیں۔ اور یہ مشہور ہے کہ کبھی یہ عجیب فضا اور چہل پہل کا مقام تھا۔"

یہ ایک خط کے الفاظ تھے جس کو لفٹنٹ جہانگیر موٹر میں بیٹھا بار بار پڑھ رہا تھا۔ موٹر مری کی پیچدار اور ڈھلوان سڑک پر تیزی سے جا رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف سرسبز پہاڑیوں کی بلندی تھی۔ اور دوسری طرف شاداب وادیوں کی گہرائی۔ جہانگیر کبھی اس کاغذ سے جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ نظر اُٹھا کر اپنے ارد گرد کے لطیف منظر کو دیکھتا۔ اور اپنے پریشان دماغ کو تسکین دینے کی کوشش کرتا۔ مگر پھر اس خط کی ہولناک جاذبیت سے مجبور ہو کر اس کے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اس نے کاغذ کو تہ کر کے بڑی احتیاط سے لفافہ میں بند کیا۔ اور پھر سگرٹ کیس نکال کر اور اُس میں سے ایک سگریٹ لے کر پینا شروع کیا۔ سگریٹ کا دُھواں سرد اور مرطوب ہوا کی لطافت میں جذب ہو رہا تھا اور وہ بار بار کش لیکر اپنی آنکھوں کے سامنے دُھوئیں کے پُر پیچ بادل بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکلخت اُس نے کسی قدر بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔ "تو میں براہ راست کشمیر ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔ آخر مری میں ایک دو دن قیام کرنے سے فایدہ"؟ مگر پھر کسی اندرونی جذبہ سے مشتعل ہو کر کہنے لگا۔ "یہ حد درجے کی کم ہمتی ہے۔ اگر سات سال تک کسی نے بہارستان میں رہنے کی جُراَت نہیں کی۔ تو یہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کہ میں بھی محض ایک وہم سے ڈر جاؤں۔ بلکہ یہی خطرہ مجھے بہادر بنانے کیلئے ایک زبردست دلیل ہونا چاہیئے۔ سپاہی صرف مرنے اور

بہادرانہ زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہُوا ہے" یہ کہکر وہ پھر زور زور سے سگریٹ کے کش لینے لگا پھر اس نے کاغذ کو کھولا۔ اور غور سے پڑھا۔ اور اس کے منہ سے صرف یہ مختصر جملہ نکلا۔ جس سے اس کا مردانہ عزم اور سپاہیانہ استقلال ظاہر ہو رہا تھا۔ "میں آج بہارستان میں رہونگا۔ اور یا تو کل صبح میری لاش نکلیگی یا بہارستان کی ہولناک فضا میں پھر انسان کے قہقہوں کی بلند آواز گونجیگی"۔

موٹر کارٹ روڈ پر پہنچکر ٹھیر گئی۔ اور لفٹننٹ جہانگیر اُترکر موٹر ایجنسی کے دفتر کے اندر داخل ہُوا۔ ایجنسی کے مینجر نے ایک نوجوان فوجی افسر کو دیکھکر ادب سے سلام کیا۔ جہانگیر نے سلام کا جواب دیکر نہایت بے تکلف انداز سے مُسکراتے ہوئے کہا "مجھے آپ کا خط مل گیا ہے۔ مگر میں مری میں قیام کروں گا۔ اور بہارستان میں ہی رہونگا۔ آپ براہِ مہربانی کسی کو میرے ساتھ کردیں۔ تاکہ مجھے وہاں تک پہنچا آئے۔ اور اگر تکلیف نہ ہو تو بہارستان کا کرایہ بھی طے کر دیجئے"۔

مینجر یہ سنکر کچھ مبہوت سا ہوگیا۔ "کیا یہ نوجوان شخص اپنی زندگی سے اس قدر بیزار ہے۔ کہ ان تمام حالات کی موجودگی میں بہارستان میں رہنا پسند کرتا ہے سچ ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے" بوڑھے مینجر کے دماغ میں کچھ اس قسم کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ آخر اُس نے یہ سوچ کر کہ اگر یہ جان سے ہاتھ دھو چکا ہے تو میں اس کو بچانے والا کون رُکتے رُکتے ہوئے کہا۔ "بہارستان کی مالکہ ایک مُدّت ہُوئی مرچکی۔ اب کسی وارث کی عدم موجودگی میں یہ کوٹھی سرکار کی تحویل میں ہے۔ آپ کرایہ کے متعلق ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں دریافت کر سکتے ہیں۔ بہرحال مَیں یہی مشورہ دُونگا کہ پہلے آپ اس بنگلہ کو دیکھ لیں اور اس کے گردو پیش اور حالات سے واقفیت حاصل کرلیں"۔ جہانگیر نے کسی مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کرکے صرف اتنا ہی کہا۔ "بہت خوب کسی آدمی کو میرے ساتھ کر دیجئے۔ کہ مجھے بہارستان تک پہنچا آئے۔ اور ہاں دو تین قلیوں کا انتظام بھی کر دیجئے۔ کہ میرا سامان وہاں پہنچا دیں"۔ مینجر نے پھر ایک غائر نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اور انتظام کرنے میں مصروف ہوگیا۔

جہانگیر نے بہارستان کے احاطہ میں داخل ہو کر کچھ عجیب کیفیت دیکھی۔ جو ان تمام بیانات کی تردید کر رہی تھی۔ جو اس خوشنما کوٹھی کے متعلق مشہور تھے۔

ایک لہلہاتے ہُوئے چمن کی آغوش میں ایک خوشنما اور شاندار سنگین عمارت اپنی پُر ہیبت تنہائی اور سکوت کے باوجود ایک عجیب لطافت سے معمور ہر گزرنے والے

کو دعوتِ سیر دے رہی تھی۔ کہ مری پر شاید ہی کسی مکان کے اردگرد اس قدر وسیع اور مسطح میدان ہو۔ لفٹننٹ جہانگیر متحیر سا ہو گیا۔ کیا یہی وہ مکان ہے۔ جس سے ایسی ہیبتناک روایتیں منسوب ہیں۔" مگر پھر جب اس کو بچپن کی سُنی ہوئی جنّات اور آسیبوں کی کہانیاں یاد آئیں۔ تو اُس نے دل ہی دل میں کہا۔" اگر اس آسیب کی کہانی میں کچھ بھی حقیقت ہے۔ تو یقیناً اس آسیب کو اس سے بہتر جگہ رہنے کے لئے میسّر نہ آسکتی تھی۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ وہ اس پُر فضا مقام کی ملکیت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔" پھر جہانگیر خود ہی دل میں سوچ کر مسکرانے لگا۔ اور کسی قدر بلند آواز میں کہنے لگا "مگر یہ آسیب ہے بہت پُر مذاق۔ مکان کے باہر رہنے والے مالیوں اور باغبانوں کو دق نہیں کرتا۔ کہ کہیں اس کے منظر کی دلکش خوبصورتی میں فرق نہ آجاتے۔"

ایک اجنبی شخص کو قلیوں اور سامان کے ساتھ دیکھکر مالی اور دوسرے خدمتگار جو اس بنگلہ کی حفاظت اور باغ کی غور و پرداخت کے لئے مقرر تھے۔ آکر اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اور ایک حیرت آمیز سکوت سے جہانگیر کی طرف دیکھنے لگے۔

جہانگیر نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔ "اس مکان کی کنجی کس کے پاس ہے۔"

بُوڑھے مالی نے ذرا بڑھ کر جواب دیا۔" کنجی تو میرے پاس ہے۔ مگر آپ کنجی کا کیا کریں گے۔" جہانگیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" تو ذرا مہربانی سے دروازہ کھول دیجئے میں اس مکان میں قیام کرنے کے لئے آیا ہوں۔" "آپ اس مکان میں قیام کریں گے؟" مالی نے ایک حیرتناک گھبراہٹ سے جہانگیر کی طرف دیکھکر کہا۔" ہاں ہاں۔ چلو دروازہ کھولو۔" جہانگیر نے ذرا سختی سے کہا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے عزمِ صمیم ٹپک رہا تھا۔

مالی نے مجبوراً مکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔" مگر صاحب کی اجازت" جہانگیر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "حاصل کرلی جائیگی۔"

مکان کھُل گیا۔ جہانگیر نے اس میں داخل ہو کر سب کمروں کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی۔" کیا اس مکان میں واقعی کوئی شخص سات سال سے نہیں رہا۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہر ایک کمرہ صاف ہے۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ گرد و غبار بے ترتیبی و بدسلیقگی کا نام و نشان تک نہیں" آخر جہانگیر نہ رہ سکا۔ اور اُس نے دریافت کیا" یہ مکان کتنے عرصے سے خالی ہے۔" مالی نے کچھ سوچکر جواب دیا۔" کوئی سات سال سے۔" "مگر یہ تو اسقدر صاف

اور آباد معلوم ہوتا ہے۔" مالی نے فوراً قطع کلام کیا۔ "حضور ہم لوگ تنخواہ کس بات کی پاتے ہیں۔ مکان کو صاف ستھرا رکھنے کے سوا ہمارا اور کام ہی کیا ہے؟" جہانگیر نے کچھ تعجب اور کسی قدر شبہ سے سوال کیا۔ "مگر کیا تم لوگ اُس آسیب سے نہیں ڈرتے یا وہ تم پر اس قدر مہربان ہے کہ تمہارے آرام و اطمینان میں مخل نہیں ہوتا؟" مالی نے کچھ جھجک کر جواب دیا۔ "صاحب ہم نے تو کبھی کسی آسیب کو نہیں دیکھا۔ ہاں ہم دن ہی دن میں سب کام کر لیتے ہیں۔ اور دن کو تو آسیب کسی کو نہیں ستاتا۔"

جہانگیر نے دل ہی دل میں کچھ سوچ کر ایک فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ "خیر اب رات کو بھی وہ کسی کو نہیں ستائیگا۔"

قلیوں نے سب سامان ایک کمرے میں رکھ دیا۔ خوابگاہ میں بستر بچھا دیا گیا۔ اور جہانگیر نے ایک خط لکھ کر ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر سے اس مکان میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ کرایہ طے ہو گیا۔ مگر آن کی آن میں یہ خبر سارے شہر میں مشہور ہو گئی۔ اور لوگ بے صبری سے دوسری صبح کا انتظار کرنے لگے۔

شام کے کھانے سے فارغ ہو کر جہانگیر سونے کے کمرے میں آیا۔ لمپ کی روشنی سے کمرہ معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ جہانگیر نے ایک بار ایک مبین سراغرساں کی نظر سے کمرے کی ہر در و دیوار ہر سامان آرائش غرض ہر اس چیز کو جو اس کمرے میں موجود تھی۔ دیکھا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ وہ ایک سب لمبے سفر کے بعد کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر آج دن بھر کی تشویش نے اُسے اور تھکا دیا تھا۔ مگر اس نئے تجربہ کے شوق۔ ایک یقینی موت پر غالب آنے کی آرزو۔ اور ایک غیر معمولی قسم کی جدوجہد کے مواقعات کی قربت نے اس کی آنکھوں سے نیند اور دل سے صبر و قرار اُڑا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتا رہا۔ اس وقت اگرچہ اس کی نظریں اپنے چہرے کے عکس پر گڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کے دماغ میں وہ تمام حالات جو اُس نے آج دن بھر میں بہارستان کے متعلق سُنے تھے زندہ اور متحرک تصویر بنکر چکر لگا رہے تھے۔ "اس خوبصورت مکان کی نوجوان حسین مالکہ نو سال ہوتے مر چکی۔ اور اس مکان کا کوئی دعویدار پیدا نہیں ہوا۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی نہ سہی۔ مگر دوسرے رشتہ داروں نے بھی اس قیمتی جائداد سے کنارہ کشی کیوں اختیار کر لی.... مگر وہ تھی بھی کچھ بیوقوف ہی.... دولت، حُسن، جوانی، تعلیم ان چیزوں کے ہوتے ہوئے تنہا زندگی گزارنے کی آرزو! یہ لوگ سچ کہتے ہیں۔ اس کو کچھ اپنے اسقدر جلد مر جانے کا اسقدر یقین ہوگا۔ کہ اپنی آزاد زندگی کو شادی کی زنجیروں میں قید کرنا پسند نہ کرتی ہوگی۔ تو کیا یہ

اسی کی آرزوئے نامراد تمنائے محروم ارمانِ ناکام تو نہیں ہیں جنہوں نے اس آسیب کی صورت اختیار کر لی ہے؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر سے اپنا پستول اٹھایا جس کو اس نے آج بڑی احتیاط سے صاف کر کے چھ گولیوں سے بھر کر رکھا تھا۔ اسے بڑے شوق سے پھر کھولا اور گولیوں کو دیکھ کر بند کر دیا۔ اب وہ پستول لئے اپنے پلنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں کہتا تھا۔ "یہ آسیب اگر کوئی رُوحانی چیز ہے۔ تو نہ اس پستول سے اس کو ڈرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ اور نہ مجھے اس سے کسی خطرہ کا احتمال ہے لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی جسمانیت ہے۔ تو جہانگیر کو ہاتھ لگانے سے قبل وہ کم از کم اس جسمانیت کو تو ہمیشہ کے لئے رو بیٹھیگا۔" یہ سوچتے ہُوئے وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور اپنی کشمیری شال کو اوڑھ کر اور پستول کو دائیں ہاتھ میں مضبوط پکڑ کر آسیب کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ۱۱ بج گئے۔ مگر آسیب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یکلخت وہ چادر کو چہرے سے ہٹا کر ایک بلند آواز سے ہنسا۔ اور پکار کر کہنے لگا۔

"یہ آسیب ہے کسی نہایت محتاط اور دور اندیش فلسفی کی رُوح کہ میرے پستول کی مہلک گولیوں سے چھیڑ چھاڑ پسند نہیں کرتا۔ بالکل وہم ہے۔ کمزور انسان اسی طرح خیالی بُت بنا کر ان سے ڈرنے لگ جاتے ہیں۔ اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے جنّات اور آسیبوں کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔" اب وہ بہت مطمئن تھا۔ کمرے کے دروازوں کو اُس نے خود بند کیا تھا۔ اس لئے اس کمرے میں اب کسی کے آنے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مگر پھر بھی احتیاطاً اس نے پستول کو اسی طرح اپنے داہنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں پکڑے رکھا۔ اور چادر اوڑھ لی۔

کلاک نے بارہ کا گھنٹہ بجایا۔ جہانگیر کی آنکھیں نیند سے بیگانہ تھیں۔ اور اُس کا دل آرام سے ناآشنا۔ وہ آنکھیں بند کئے سو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ یکلخت اس نے اپنے دونوں پاؤں پر ایک آہنی پنجے کی گرفت محسوس کی۔

جہانگیر اتنی ارادی غفلت کے باوجود اس ناگہانی مُلاقات کے لئے بالکل تیار تھا۔ بائیں ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اُس نے چادر کو چہرے سے ہٹا لیا۔ اور دائیں ہاتھ کو اُٹھا کر ایک تجربہ کار نشانچی کے انداز سے اپنے پستول کی نالی کا رُخ اپنے پاؤں کے اُوپر کی فضا کی طرف کر دیا۔

اُس نے دیکھا کہ ایک مہیب اور سیاہ پوش شکل اس کی ٹانگوں پر جُھکی ہوئی ہے اُسنے آہنی گرفت کی سختی کو پہلے سے زیادہ محسوس کیا۔ جہانگیر نے ایک تحکمانہ آواز میں کہا "میری ٹانگوں کو چھوڑ دو۔ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میرے پستول کی گولی کسی دُشمن میں خواہ وہ انسان ہو یا

آسیب فرق کرنا نہیں جانتی" اُس نے یکلخت دیکھا کہ وہ ہاتھ جو اُس کی ٹانگوں کو پکڑے ہوئے تھے۔ اُٹھے اور آگے کی طرف بڑھے۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ اس کی گردن میں پیوست ہو جاتے۔ متواتر گولیوں کے چلنے کی آواز آئی۔ اور ایک چیخ سُنائی دی۔ سیاہ پوش چارپائی کی پائینتی کے قریب گر چکا تھا۔ جہانگیر فوراً اُٹھا۔ اور سیاہ فرغل کو ہٹا کر اس آسیب کو دیکھنے لگا۔

ایک بلند قامت اور مضبوط انسانی جسم جس کے سینہ اور مُنہ سے خون بہہ رہا تھا۔ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ جہانگیر نے گھبرا کر اس کو ہلانے کی کوشش کی۔ اگرچہ جسم گرم تھا۔ مگر حرکت سے قاصر معلوم ہوتا تھا۔

جہانگیر ایک دلی اندوہ و رنج سے کہنے لگا "اگر مجھے معلوم ہو جاتا۔ کہ یہ خطرناک آسیب صرف ایک کمزور انسان ہے۔ تو آج میں اپنا ہاتھ ایسے بُزدل چور کے خون سے نہ رنگتا"

کہنے کو تو جہانگیر یہ الفاظ کہہ گیا۔ مگر جب اس کو خیال آیا کہ تمام دروازے اس نے اپنے ہاتھ سے بند کئے تھے۔ تو دل ہی دل میں کانپ گیا۔ پھر اطمینان کرنے کی غرض سے ایک ایک دروازہ کو دیکھنے لگا۔ سب دروازے بند تھے۔ جہانگیر اسی طرح دائیں ہاتھ میں پستول لئے آخری دروازے سے سہارا لے کر سوچنے لگا۔

"یقیناً جو شخص پستول کی گولی سے زخمی ہو کر گر سکتا ہے۔ جس کے مُنہ اور سینے سے اس نے ابھی ابھی تازہ خون نکلتے دیکھا ہے۔ جس کے جسم کی گرمی کو اُس نے اپنے ہاتھ سے محسوس کیا ہے۔ جسمانیت سے عاری نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ کوئی انسان تھا۔ تو اس کمرے میں بغیر دروازہ کھلے داخل کیسے ہو گیا" یہ خیالات تھے۔ جو جہانگیر کے دل و دماغ کو بیچین کر رہے تھے۔ مگر پھر کچھ سمجھ کر اور کسی فوری خیال کی تحریک سے جوش میں آکر وہ چلا اور ایک بار پھر کمرے کی چار دیواری کو غور سے دیکھنے لگا۔ یکایک وہ رُکا "کیا سنگھار میز کے قریب کی الماری کا دروازہ کھُلا رہ گیا تھا جس میں مَیں نے سونے سے پہلے کپڑے اُتار کر لٹکائے تھے۔ نہیں اچھی طرح یاد ہے کہ مَیں نے اسے خود بند کیا تھا" یہ سوچکر وہ کھُلی ہوئی الماری کی طرف بڑھا۔ مگر . . . . جہانگیر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس میں کوئی کپڑا نہ تھا۔ بلکہ الماری کی پشت کا تختہ جس پر کپڑوں کی کھونٹی لگی ہوئی تھی۔ غائب تھا۔ اور اس کی جگہ ایک اور کھُلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ جہانگیر فوراً چلا اُٹھا "یہی وہ دروازہ ہے۔ جس سے یہ چور مکان میں داخل ہو کر مسافروں پر حملہ کیا کرتا تھا" یہ کہکر اس نے لمپ بائیں ہاتھ میں لیا۔ اور دائیں ہاتھ میں پستول کو مضبوط پکڑے ہوئے آگے کی طرف جھکائے اس دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس قدر چھوٹا کہ اسے شاید کمرہ کہنا بھی

درست نہیں۔ کوئی چار قدم چلکر اس کو ایک زینہ نظر آیا۔ جو نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ جہانگیر نے بڑی احتیاط سے اُترنا شروع کیا۔ یہ زینہ ایک وسیع اور آراستہ کمرے میں جا نکلا۔ جہانگیر نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کمرے کے اردگرد بہت سے دروازے تھے۔ ابھی وہ کوئی دو قدم ہی چلا ہوگا کہ اُس کے کان میں کسی عورت کی آواز آئی۔ "کون ہے" جہانگیر ایک لمحہ کے لئے ہراساں سا ہوگیا۔ مگر پھر حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ اور اس کمرے میں داخل ہُوا۔ جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ یہاں جو نظارہ اس نے دیکھا اسے دیکھنے کی اسے کبھی توقع نہ تھی۔ ایک خوبصورت نازنین جس کے ہاتھ پاؤں لوہے کی مضبوط اور بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ایک نہایت مکلف بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کمرہ ضروری سامانِ آرائش و آسائش سے آراستہ تھا۔ جہانگیر نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔ "آپ کون ہیں۔ اور آپ کو اس مصیبت میں کس نے مبتلا کر رکھا ہے۔" نازنین نے ابرو کے شکن اور آنکھوں کی حرکت سے اسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ ظاہرا طور پر بہت خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔ جہانگیر نے دل ہی دل میں کچھ سمجھ کر ایک بلند اور فاتحانہ آواز میں کہا۔ "وہ آسیب جس سے آپ ڈرتی ہیں۔ اب ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رخصت ہوگیا۔ آپ اب کسی سے نہ ڈریں۔" نازنین کے مغموم چہرے پر ہلکی سی بشاشت ظاہر ہوئی۔ اور اُس نے اپنی زبان کو جسے اب زیادہ تر خاموش رہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ بات کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ "کیا یہ سچ ہے۔ کہ آپ اس زندہ موت پر غالب آگئے تو خدا کے واسطے مجھے اس مصیبت سے رہا کیجئے۔" جہانگیر نے یہ محسوس کر کے کہ کسی قسم کی گفتگو سے پیشتر اس نازنین کو ان زنجیروں سے آزاد کرنا زیادہ مناسب ہے۔ بڑھکر ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش شروع کی۔ یہ کام اس کے اندازے سے زیادہ وقت طلب اور دشوار ثابت ہُوا۔ اور آخر جب سب زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر گئیں۔ تو اس نازنین نے ایک ایسی آواز میں جس میں اس کی رُوح کا تمام خلوص مرکوز ہوگیا تھا۔ کہا۔ "مجھے آزاد کرنے والے اگر میں اب بھی وہی ہوں جو آج سے کئی سال پہلے تھی۔ تو میں اپنے شکریہ کا اظہار کروں گی۔ مگر مجھے بتاؤ۔ کہ وہ خوفناک ڈاکو جس نے مجھے زندہ درگور کر رکھا تھا۔ کیا واقعی اب اس دُنیا میں نہیں ہے" جہانگیر نے اس کو ہاتھ کا سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "آئیے۔ آپ اپنی آنکھوں سے اس کا انجام دیکھ لیجئے۔" نازنین جس کے پاؤں شاید اس قدر مدت تک مقید رہنے کے باعث اب آزادانہ حرکت سے ناآشنا معلوم ہوتے تھے آہستہ آہستہ ایک لڑکھڑاتی ہوئی چال سے چلکر جہانگیر کے ہمراہ اس کمرے میں آئی۔ جہاں وہ بے رحم غارتگر ایک مہیب اور زخمی حیوان کی طرح سسک رہا تھا۔ روشنی اور آواز کو محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اس گرفتارِ بلا کو آزاد دیکھ کر ارادہ شاید اپنے

منظالم سے پشیمان ہوکر فریاد کی "خدا کے واسطے مجھے بچالو"
جہانگیر اس کو ابھی تک زندہ دیکھکر کچھ حیران مگر بہت زیادہ خوش ہوا۔ کہ ابھی تک ان اسرار کو اسی کی زبان سے بے نقاب کرنے کا موقع باقی تھا۔ جہانگیر نے دروازہ کھولا۔ کہ بنگلے کے ملازموں کو آواز دے۔ مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا تو سب ملازموں کو برآمدے میں جمع پایا۔ وہ خبط الحواس دیوانوں کی طرح مبہوت کھڑے تھے۔ اور گولیوں کی آواز سے گھبرا کر آج شب کے حادثات کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے۔
جہانگیر نے زخمی کو ہسپتال پہنچانے کا حکم دیا۔ اور پھر اس واقعہ کی مختصر کیفیت کی تھانے میں اطلاع دی۔
صبح کو تحقیقات شروع ہوئی۔ مجرم نے مرنے سے پیشتر اپنے جرائم کا اقبال کیا۔ یہ وہ انکشافات تھے۔ جنہوں نے ہر شخص کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ پابہ زنجیر نازنین جس کو جہانگیر نے اس مصیبت سے چھڑایا تھا۔ بہارستان کے مالک کی وہی خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کی ناگہاں موت نے آج سے نو سال پہلے مری کے باشندوں کو رنج و قلق میں مبتلا کردیا تھا۔ اور جس کی سفید سنگ مرمر کی قبر بہارستان کے چمن کے ایک گوشے میں ابتک موجود تھی۔ وہ خونی مجرم جو ایک زندہ آسیب کی صورت میں نظر آکر کئی بیگناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا تھا۔ بہارستان کے مرحوم مالک کی جائداد کا منتظم تھا۔ جس نے اپنے آقا کی وفات کے بعد پہلے تو اس کی اکلوتی بیٹی ثروت آرا سے شادی کرنے کے منصوبے گانٹھے۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کے انکار پر غالب نہ آسکا۔ تو اس جائداد پر قبضہ کرنے کی ٹھیرائی۔ اور اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ ثروت آرا کی ناگہاں موت کی خبر مشہور کرکے اس کو اس تہ خانے میں جس کے راز سے صرف وہی واقف تھا قید کردیا۔ پھر ایک جعلی وصیت نامے کی بنا پر تمام جائداد کا وارث بن بیٹھا۔ اور جب سرکار نے اس کے حق کو تسلیم کرنے میں تامل کیا۔ تو باضابطہ قانونی چارہ جوئی میں مصروف ہوگیا۔ اس کا مقدمہ عدالت میں ابتک دائر تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ کوئی شخص بہارستان میں رہ کر اس تہ خانے کے راز سے واقف نہ ہوجائے۔ اس نے آسیب بن کر لوگوں کو ڈرانا شروع کیا۔ جو لوگ ڈر کر بھاگ گئے۔ ہمیشہ کے لئے اس مکان کے قریب آنے سے احتراز کرتے رہے۔ اور جنہوں نے مقابلہ کیا۔ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔
ثروت آرا نے عدالت میں خود حاضر ہوکر اپنے بیانات قلمبند کرائے جس سے مقدمہ بالکل صاف ہوگیا۔ مجرم نے اقبال جرم کرتے وقت کچھ اس احساس پشیمانی سے بیان کیا۔ کہ ثروت آرا اسے معاف کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔ مگر قانون فطرت کا زبردست ہاتھ اپنا انتقام لے کر رہا۔ بہارستان پر پھر بہار آگئی ثروت آرا کو تمام جائداد کا قبضہ مل گیا۔ مگر جس دولت کے ملنے پر اس کو سب سے زیادہ ناز تھا وہ جہانگیر سے بہادر اور حسین شوہر کی محبت تھی۔

ایڈیٹر

عورت کا دل

(۱)

دروپدی ہمارے گاؤں میں سب سے خوبصورت لڑکی تھی بچپن میں مَیں اور وہ برسوں ساتھ کھیلا کئے ہیں۔ کیسے عجیب دن تھے۔ زندگی ایک پُر فضا چمنستان تھی۔ جس میں خزاں کے زہریلے جھونکوں کو دخل نہ تھا۔ دروپدی اُس چمن کا پھول تھی۔ اُسے دیکھکر کسی کو گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ یہ دیہاتی لڑکی ہوگی۔ شکل وصورت سے وہ شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ صاف نکھرا ہوا رنگ، موٹی موٹی بادامی آنکھیں گول آفتابی چہرہ۔ اور اس پر اُس کی شیریں زبانی سونے پر سہاگہ تھی۔ سارے دن مینا کی طرح باتیں بناتی رہتی تھی جن کو سُنکر راہ چلتے مسافر بھی تھم جاتے تھے۔ اور گاؤں والوں کے لئے تو وہ ایک کھلونا تھی۔ ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں ایک امیر آدمی سیر کرتے ہوئے آنکلے۔ اُن کے ساتھ لڑکیوں کی ایک پلٹن تھی۔ اُن کی شان وشوکت امارت اور خوبصورتی دیکھکر گاؤں کے لوگ اُن کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن دروپدی اُن میں اس قدر جلد گھل مل گئی۔ جیسے برسوں کی واقفیت ہے۔ اُن لڑکیوں کی بدولت گاؤں میں چند دن چہل پہل رہی۔ مگر دروپدی کے سامنے آتے ہوئے اُن کی خوبصورتی زائل ہوجاتی تھی جس طرح سُورج کے سامنے تارے ماند پڑجاتے ہیں۔

میری عمر اُن دنوں بہت تھوڑی تھی لیکن دروپدی میں مجھے ایک پُر سحر کشش محسوس ہوتی تھی مَیں اُس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ بچّوں میں کسی کو کھلونے پسند ہوتے ہوتے ہیں کسی کو تصویریں۔ پر میری طبیعت ان میں سے کسی شے کی طرف بھی راغب نہ تھی۔ مجھے دروپدی اور صرف دروپدی کا خیال تھا۔ اگر بچپن میں عشق کا اطلاق قابلِ اعتراض نہ سمجھا جائے۔ تو مَیں بلا پس وپیش کہدونگا۔ کہ مجھے اُس سے ناقابلِ فہم عشق تھا۔ مَیں اُس کے چہرے کو گھنٹوں تکتا رہتا تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ کہ یہ حق صرف مجھی کو حاصل ہے۔ اس خیال سے میری طبیعت چاندنی رات کی طرح شگفتہ ہوجاتی تھی۔ آدمی بچپن میں سینکڑوں غلطیاں کرتا ہے۔ یہ بھی اُن میں سے ایک تھی۔

(۲)

کئی سال گزر گئے۔ مَیں نے مڈل کا امتحان پاس کرلیا۔ اور ہائی سکول میں داخل ہونے کے لئے گھر سے چلا اُس وقت میرا چہرہ اُداس تھا۔ دل رنجیدہ۔ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ

کیا اب درو پدی کا پیارا پیارا چہرہ دکھائی نہ دیگا کیا اُس کی شیریں آواز سُنائی نہ دیگی۔ مَیں ہمیشہ اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اُسے کہانیاں سُناتا تھا۔ تصویریں دکھاتا تھا۔ وہ میرے انتظار میں دروازے پر کھڑی رہتی تھی۔ اُسے دیکھ کر مَیں جھُومنے لگتا تھا۔ وہ اگر نظر نہ آتی۔ تو میری نگاہوں میں دُنیا تاریک ہوجاتی تھی۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ مَیں اس کے بغیر رہ سکونگا۔ پر اب کیا ہوگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔ خیال آیا میرے ساتھ کتنے لڑکے پڑھتے تھے۔ جو فیل ہوگئے ہیں۔ کاش میرا نام بھی اُنہی کی فہرست میں آجاتا۔ تو یہ دِن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اُس وقت مجھے اُن کی بدبختی پر رشک ہو رہا تھا۔ خوشی اور غم دل کی حالت پر منحصر ہیں۔

مَیں سکول میں داخل ہوگیا لیکن آٹھوں پہر رنجیدہ رہتا تھا۔ بورڈنگ ہوس کا انتظام نہایت اعلےٰ تھا۔ دوسرے طلباء اس طرح اُچھلتے پھرتے تھے جس طرح آزاد پرندے پھُولوں کی ٹہنیوں پر کھیلتے ہیں۔ لیکن وہ جگہ میرے لئے جیلخانہ سے کم نہ تھی۔ مَیں چاہتا تھا۔ کہ اگر پر ہوں تو اُڑ کر گاؤں پہنچ جاؤں۔ اور دروپدی کو سینہ میں چھپا لوں لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ دروپدی کسی قدر ہندی جانتی تھی۔ ایک دِن مجھے خیال آیا۔ کہ کیوں نہ اُس کے نام خط لکھ کر آتشِ شوق کو ٹھنڈا کرلوں۔ پانی نے راستہ بند پاکر دوسرا رُخ اختیار کیا۔ مَیں نے خط لکھا۔ اور اُس میں کلیجہ نکال کر رکھدیا۔ ایسی کاوش کوئی طالب علم سالانہ امتحان کے موقعہ پر بھی نہ کرتا ہوگا۔ یہ میری زندگی کا امتحان تھا۔ چند دِن کے بعد میرے باپ کا خط آیا۔ وہ چٹھی اُن کے پاس پہنچ گئی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مَیں فیل ہوگیا تھا۔ اُس رات میری آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ اس طرح تڑپتا تھا۔ جس طرح مچھلی گرم بالو پر تڑپتی ہے۔ کبھی سوچتا۔ باپ کو سخت جواب دوں۔ کبھی خیال آتا۔ چل کر قدموں پر سر رکھدوں۔ آخر باپ ہے کلیجہ پتّھر کا کیسے کریگا۔ کبھی سوچتا خودکشی کرلوں۔ اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔ پھر خیال آیا۔ دروپدی کو تو میرا خیال ہے۔ اگر اُس کے پاس پیغام بھیجدوں تو وہ یقیناً گھر بار چھوڑ کر میرے ساتھ چل کھڑی ہوگی۔ مگر آخر میں سب خیالات حباب آسا تھے جو جس قدر جلد بنتے ہیں۔ اتنی ہی جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ مَیں رو دھو کر چُپ ہو رہا۔ اور دُعا کرنے لگا۔ کہ پرماتما میری مُراد پُوری کر۔

بے بسوں کا اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟

بارے دو سال کا عرصہ قلیل جسے آزارِ عشق نے دو صدیاں بنادیا تھا۔ ختم ہُوا۔ اور مَیں انٹرنس کا امتحان دیکر گھر چلا۔ اس وقت میرے سینہ میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ شوقِ دیدار میں اُمنگوں کے آسمان پر اُڑا چلا جاتا تھا مگر فاصلہ طے نہ ہوتا تھا۔ مَیں بار بار جھنجلاتا تھا۔ کہ گاؤں کا

فاصلہ زیادہ کیوں ہو گیا ہے۔ مگر گاؤں پہنچکر دل بیٹھ گیا۔ جس طرح منزلیں مار مار کر مسافر سٹیشن پر پہنچے اور اُسے معلوم ہو کہ گاڑی نکل گئی ہے۔ اُس وقت اُس کے دل پر کیا کیا گزرتی ہے۔ تقدیر کو گالیاں دیتا ہے۔ اور کلیجہ مل کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح میرے ساتھ ہوا ——— گاؤں پہنچکر سب سے پہلی خبر یہ سُنی۔ کہ دروپدی کی شادی ہو گئی ہے میرے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ کیا کیا اُمنگیں تھیں، کیا کیا خواہشیں سب پر پانی پھر گیا۔ اب میرے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

(۳)

مَیں نہیں کہہ سکتا۔ اس صدمہ کو میں نے کس طرح برداشت کیا۔ مگر اتنا یاد ہے۔ کہ میرے سر پر مہینوں ایک قسم کا جنون سا سوار رہا۔ مجھے وہم ہونے لگا۔ کہ میرا دماغ معطل ہو جائیگا۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا طبیعت ہر وقت افسردہ رہنے لگی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ رات کو نیند نہ آتی تھی بیٹھے بیٹھے چونک اُٹھتا تھا۔ یار دوست کہتے کیسے بیوقوف ہو۔ اب اگر ایک عورت نہیں ملی۔ تو کیا جان کھو دو گے۔ مَیں اُن کے استدلال کی اہمیت کو محسوس کرتا تھا۔ پر دل بس میں نہ آتا تھا۔ اس پر استدلال کا بھی اثر نہیں ہوتا۔

لیکن دروپدی کی حالت مجھ سے مختلف تھی۔ شادی کے بعد وہ بھول سی گئی۔ اور رُوح کی پُوری قوت سے شوہر کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ وہ اُس کی پُوجا کرتی تھی۔ اور اسی کو اپنی زندگی کا تنہا مقصد سمجھتی تھی۔ اُس کی شادی قریب کے ایک گاؤں میں ہُوئی تھی۔ لڑکا نہایت قبول صورت اور تعلیم یافتہ تھا۔ اور اتنا ہی نہیں۔ اُسے دروپدی سے عشق بھی تھا۔ وہ میرا رقیب نہ ہوتا۔ تو مَیں اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ پر اب بھی اُس کی مخالفت کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُس کی خوبیوں نے میری زبان بند کر دی تھی مَیں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اور دل کو دوسری طرف رجوع کرنے کے لئے ساہوکارہ شروع کر دیا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مَیں اپنی دوکان کے سامنے چارپائی ڈالے حساب کتاب کر رہا تھا۔ کہ سامنے سے کوئی لڑکی گزرتی دکھائی دی۔ میری آنکھیں بے اختیار اُس طرف اُٹھ گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ یہ دروپدی تھی۔ لیکن اُس کی حالت میں کیسا انقلاب آچکا تھا چہرے پر وہ سُرخی نہ تھی۔ آنکھوں میں وہ رونق نہ تھی ہونٹوں پر وہ مُسکراہٹ نہ تھی۔ یاس کی تصویر اس سے زیادہ دردناک کسی مُصوّر نے بھی نہ بنائی ہو گی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کبھی وہ بہار شگفتہ تھی۔ پر اب خزاں کی صورت۔ مَیں سوچنے لگا۔ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ شام کو اُس کے بھائی سے پوچھا۔ "پیارے لال تمہاری

بہن کا کیا حال ہے"؟

پیارے لال نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اب تم سے کیا چھپاؤں۔ گیانچند نے دوسری شادی کرلی ہے"۔

میں یہ سنکر اچھل پڑا۔ "کیا کہا۔ دوسری شادی"؟

"ہاں دوسری شادی"

میں نے اُسے چارپائی پر جگہ دیتے ہوئے ازراہ ہمدردی کہا۔ "گیان چند کی آنکھوں پر یہ پردہ کیسے پڑ گیا"؟

پیارے لال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہیں پونچھتے ہوئے بولا۔ "پشاور کے ایک امیر سوداگر نے اُسے اپنی اکلوتی بیٹی بیاہ دی ہے۔ مگر شرط یہ کی ہے۔ کہ دروپدی کو چھوڑ دو۔ گیان چند نے یہ دیکھ کر کہ خسر کی موت پر اُس کی جائداد کا مالک وہی ہوگا۔ یہ شرط منظور کرلی"۔

میں نے آہ سرد بھری اور جواب دیا۔ "اُس سوداگر نے تم لوگوں سے کب کا بیر نکالا"۔

"رام جانے۔ ہم نے تو کسی کا کبھی بُرا نہیں کیا"؟

"تو اب دروپدی کا کیا حال ہے"؟

"جب سے آئی ہے برابر روتی رہی ہے۔ اُس کا چہرہ پہلے کی نسبت آدھا بھی نہیں رہا"۔

"عورت کے لئے اس سے زیادہ مصیبت بھی کیا ہو سکتی ہے"۔

"پرماتما یہ دن دشمن کو بھی نہ دکھلائے"۔

مُنہ سے تو یہ الفاظ کہہ دئے لیکن دِل میں ایسا خوش تھا جیسے کوئی مہم فتح کرلی ہو۔ پیارے لال کے چلے جانے کے بعد میرے چہرے پر سفاکانہ تبسّم تھا۔ سوچتا تھا۔ اب اسے معلوم ہوگا۔ کہ کسی کا دِل توڑا جائے۔ تو کیا ہوتا ہے۔ شکل و صورت پر ریجھ گئی تھی۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ پرماتما کے قوانین اٹل ہیں۔ اب ساری عمر بیٹھی روتی رہیگی۔

(۴)

لیکن کچھ عرصہ کے بعد میری ہمدردی دروپدی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ اب وہ روتی نہیں تھی۔ مدّت اُس کے زخموں کے لئے مرہم بن گئی تھی۔ اکثر کہا کرتی۔ کہ جو مصیبت مجھ پر ٹوٹی ہے۔ جب اُسے برداشت ہی کرنا ہے۔ تو ہنسکر کیوں نہ کیا جائے۔ رونے سے یہ بار ہلکا تو نہیں ہو سکتا۔ وہ دن رات گھر کا کام کرنے میں مصروف رہتی تھی۔ دوپہر کو تھوڑا سا وقت خالی بچتا تو رامائن لے بیٹھتی۔ اور گاؤں کی لڑکیوں کو پڑھکر سُناتی۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ الفاظ میں تاثیر۔ شروع شروع میں لڑکیوں کی تعداد محدود تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھنے لگی۔ اور آخرکار یہانتک نوبت پُہنچ گئی۔ کہ تقریباً گاؤں کی تمام عورتیں جمع ہونے لگیں۔ اور اگر کسی دن دروپدی کتھا نہ کر سکتی تو اُن کا دِن بے لطفی سے گزرتا۔ جیسے نشہ باز کو نشہ نہ ملا ہو۔ دروپدی اب دیوی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر سکون کے آثار تھے۔

آنکھوں میں جھلکتی کا رنگ۔ اُسے دیکھ کر گاؤں کے لوگ جوشِ عقیدت سے جھک جایا کرتے تھے۔ اور مجھ پر تو وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ وہ اب پہلے سے کہیں خوبصورت معلوم ہوتی تھی کیونکہ اُس کی محبت دُنیوی آلائشوں سے پاک ہو چکی تھی جیسے سونا آگ میں پڑ کر کندن ہو جاتا ہے۔ اُسے دیکھ کر لوگ گیان چند کی بدنصیبی پر افسوس کرتے تھے۔ کہ کیسا احمق ہے۔ جو اس کو چھوڑ کر دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ ایسی دیویاں تو خود دولت ہیں۔ مگر اب دروپدی کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنی شادی کو گویا بھول گئی تھی۔ اور دُنیا سے بے پروا ہو کر عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھی۔

اُس کی ان خوبیوں نے میری ہمدردی اُس کے لئے بڑھا دی۔ ایک دن وہ تھا۔ جب میں اُس کی بدنصیبی پر خوش ہوتا تھا۔ مگر اب اُسے تکلیف میں دیکھ کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔

(۵)

ایک دن صبح کے وقت میں کنوئیں پر نہا رہا تھا کہ ایک نوجوان پاس سے گزرا۔ اُس کی شکل و صورت آشنا سی معلوم ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ تو چونک اُٹھا۔ یہ گیان چند تھا۔ مگر کیا امیرانہ شان تھی۔ سر پر بنارسی صافہ۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں۔ کندھوں پر قیمتی چادر۔ اُسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ کوئی شہزادہ ہے۔ میرے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ میں نے بغیر کسی قسم کے تمہید کے کہا۔ "تم ہی گیان چند ہو گیا؟"

گیان چند اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ حیرت سے بولا۔ "جی ہاں! کیا حکم ہے؟"

میں نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور جواباً "کبھی تمہیں دروپدی کا بھی خیال آتا ہے یا نہیں؟"

جو حالت مریض کی ڈاکٹر کے مُنہ سے موت کی خبر سُن کر ہوتی ہے۔ وہی حالت گیان چند کی اس سوال سے ہوئی۔ چہرہ پر مُردنی چھا گئی۔ چند لمحہ تک تو وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "تمہیں اس سوال کا کیا حق ہے؟"

میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے چلّا کر کہا۔ "مجھے اس کا کیا حق ہے؟ تمہیں ایک عورت کی زندگی تباہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن مجھے اُس کے متعلق ایک سوال دریافت کرنے کا حق بھی نہیں؟"

گیان چند کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "تم نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟ بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔"

"غریب کا لڑکا تخت پر بیٹھ گیا۔ اب اُس کی عقل کیونکر بجا رہ سکتی ہے۔"

"میں تمہارا نشہ اُتار دوں گا۔"

"بات کرتے شرم نہیں آتی۔ آدمی ہوتے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے۔ تم نے وہ گناہ کیا ہے۔ جس کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔"

گیان چند اب ضبط نہ کر سکا۔ زیادتی سراسر میری تھی۔ اُس نے آگے بڑھکر میری گردن پکڑلی۔ اور کنپٹی پر دو مُکّے مارے مَیں بچپن ہی سے کشتی وغیرہ کا شوقین رہا ہوں۔ میری جسمانی حالت نہایت عمدہ تھی۔ لیکن گیان چند کے مُکّے کیا تھے۔ ہتھوڑے کی چوٹیں تھیں۔ مَیں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا۔ تو میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور مَیں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ واقعات کو یاد کر کے میری آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ مَیں نے اُسی زخمی حالت میں چلا کر کہا۔ "مَیں اُسے اِس کا مزہ چکھا دُوں گا۔"

چند دن کے بعد مَیں تندرست ہو گیا۔ اُس وقت میرا عہد گاؤں میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل چکا تھا۔ لوگ میرے عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ جب مَیں کوئی عہد کر لیتا ہوں۔ تو پھر اُسے پُورا کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لئے کسی کو حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ کہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرے۔ مَیں تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اِس جوش انہماک سے کسی کمانڈر نے دُشمن کے علاقہ پر فوج کشی کی ہو گی۔ رات کا وقت تھا۔ مَیں ایک خنجر لیکر گیان چند کے گاؤں کی طرف چلا۔ مگر کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ تاہم مَیں آگے بڑھتا گیا۔ اور اُس کے مکان پر جا پہنچا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سارا گاؤں بے ہوش پڑا سو رہا تھا۔ مَیں نے گیان چند کے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ مارا۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھُل گیا۔ مَیں لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولنے والے نے کوئی آواز نہ نکالی۔ اُس کی زبان کو میرے روپیہ نے خرید لیا تھا۔ مَیں پینترا بدلتے ہُوئے اُس کمرے میں پہنچا جہاں گیان چند سو رہا تھا میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ معاً خیال آیا یہی شخص ہے جس نے میری اور میری پیاری دروپدی کی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ ورنہ ہم اس وقت اس حال میں نہ ہوتے۔ گرتی ہُوئی دیوار تھم گئی۔ مَیں نے خنجر کی دھار کی طرف دیکھا حوصلہ مضبوط کیا۔ ہاتھ اُٹھایا اور گیان چند کے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ گیان چند کی آنکھیں کھُل گئیں۔ موت اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "پرماتما کے لئے یہ نہ کرو۔"

میرے غُصّہ کے ایندھن پر تیل پڑ گیا۔ مَیں نے دانت پیسکر جواب دیا۔ "اب کوئی حمایتی ہو۔ اُسے بُلالو۔"

"اوہ پرماتما کے لئے مُجھے نہ مارو۔"

ان الفاظ میں حسرت تھی۔ لیکن مجھ پر اثر نہ ہُوا۔ میرے سامنے صرف ایک خیال تھا۔ کہ اس شخص نے دو زندگیاں تباہ کی ہیں۔ مَیں بہت نرم دل آدمی ہوں۔ لیکن اُس وقت خونخوار درندہ بن رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی منتوں پر توجہ نہ کی اور ہاتھ بلند کیا۔ گیان چند نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا ہاتھ حرکت میں آنے کو تھا۔ کہ معاً کسی نے خنجر کو

پیچھے سے کھینچ لیا۔ مَیں گھبرا گیا۔ گیان چند کے سینہ سے اتر اور خوفزدہ ہو کر بولا۔ کون؟

"دروپدی"

مَیں دم بخود ہو گیا۔ مجھے یکایک یقین نہ ہوا کہ یہ بیداری ہے۔ کسے خیال ہو سکتا ہے۔ کہ اندھیری رات میں ایک عورت اتنا فاصلہ طے کر کے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُس شخص کو بچانے کی ہمت کریگی جس نے بلاکسی قصور کے اس کی زندگی کی ساری خوشیاں ضبط کر لی ہوں۔ مجھ پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہو گیا۔ دُنیا میں انتقام کے پیاسوں کی کمی نہیں خود غرض کمینوں کی کمی نہیں۔ مگر ایسے کتنے ہیں۔ جو اپنے ساتھ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ نیکی پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ مَیں نے جُھک کر دروپدی کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اور کہا۔ دیوی! تُو مُبارک ہے۔"

(۶)

چالیس سال گُذر گئے۔ جوانی کے قلعہ میں بڑھاپا داخل ہُوا۔ مگر دروپدی کے معمول میں فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی اُسی طرح صبح کو مالا سمرن کرتی تھی۔ دوپہر کو رامائن کی کتھا سُنتی۔ اس کی کمر جُھک گئی تھی۔ بینائی میں ضعف آ گیا تھا۔ عموماً سارے دن گھر ہی میں پڑی رہتی تھی۔ اس عمر میں عورتیں گھر والوں کے لئے وبالِ جان ہو جاتی ہیں۔ مگر دروپدی کی ایسی حالت نہ تھی۔ اُس کی روحانیت نے مادیت پر فتح پالی تھی۔ اُس کی عزت گاؤں کے بچّے بچّے کے دل میں تھی۔

ساون کے دن تھے۔ ندی نالوں میں باڑھ آئی ہوئی تھی۔ مَیں کسی ضروری کام سے گیان چند کے گاؤں میں چلا گیا تھا۔ وہاں اُس کی حالت دیکھی۔ تو دُنیا کی بے ثباتی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ نہ اُس کے مکانات تھے۔ نہ کاروبار۔ جو کبھی روپوں میں کھیلتا تھا۔ اب وہ کوڑی کوڑی کے لئے محتاج تھا۔ اور اتنا ہی نہیں۔ اُس کی بیوی اور خُسر کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب وہ تھا اور اُس کا چھوٹا بچّہ جیسے طوفان میں کسی نے کشتی پر وزنی پتھر رکھ دیتے ہوں۔ وہ دن بھی یادگار رہیں گے۔ جب گیان چند اُس ننھی سی جان کو کندھوں پر اُٹھائے پھرتا تھا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر کیسی حسرت تھی۔ آنکھوں میں کیسی بے بسی۔ میرے کلیجے پر برچھیاں چل جاتی تھیں۔ کبھی مجھے اُس سے عناد تھا۔ اُس وقت وہ خوشحال تھا۔ اور مَیں افسردہ خاطر۔ مگر اب وہ بھی تباہ حال تھا۔ دونوں ایک ہی تیر کے زخمی تھے۔ ایک ہی مرض کے مریض۔ مجھے اُس سے ہمدردی سی ہو گئی۔ آخر اُس کی غمناک زندگی کے خاتمہ کا دن آ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ ایک تاریک کوٹھری میں تڑپ رہا تھا۔ مگر جان نہ نکلتی تھی۔ وہ بار بار معصوم بچّے کی طرف دیکھتا تھا۔ اور کانپ کانپ کر رہ جاتا تھا۔ شاید سوچتا۔ کہ میرے بعد اس کا کیا حال ہوگا۔

یکایک دروازہ کھلا۔ اور بڑھی دروپدی لاٹھی لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت اُس کے کپڑے پانی میں شرابور تھے جسم مٹی میں لت پت۔ مگر اُسے اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سیدھی گیان چند کے پاس گئی۔ اور نیچے جُھک کر بولی۔

"کیوں؟ رام کا نام لو۔"

"آواز میں محبت کا لہجہ تھا۔

گیان چند نے کراہ کر کہا۔ "میرا بچہ"

دروپدی نے بچے کو اُٹھا کر چھاتی سے لگالیا۔ اور جواب دیا۔ "یہ میری جان کے ساتھ رہیگا۔"

"ہوں"

"فکر نہ کرو۔ رام رام کہو"

دوسرے لمحہ میں گیان چند کا دم نکل گیا۔ دروپدی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اتنے میں دروپدی کا بھائی پیارے لال غصہ سے کانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور بولا "میں تم سے جُدائی اختیار کرلونگا۔ ورنہ اس بچے کو پھینک دو۔"

مگر دروپدی نے اُسے بھینچکر گلے سے لگالیا۔ اور کہا "یہ نہیں ہوگا۔"

"تو یہ آخری فیصلہ ہے"؟

"آخری"

"اچھا میرے گھر میں نہ آنا۔"

"نہ آؤنگی۔ میرا پرماتما والی ہے۔ جس نے اس بچے کے لئے مجھے بھیجدیا ہے۔ وہ میرے لئے بھی کسی کو بھیج دیگا۔ اور اگر نہ بھیجے گا تو نہ سہی۔ میں بھوکوں مرنا قبول کروں گی۔ مگر اُن کی آتما کو دُکھ نہ پہنچاؤں گی۔"

میری آنکھیں کھُل گئیں۔ عورت کا دل اتنا بلند۔ اتنا فراخ ہوسکتا ہے۔ اس کی اُمید نہ تھی۔ عورتیں عالم شباب میں جان تک قربان کردیتی ہیں۔ اُس وقت اُن کا خون گرم ہوتا ہے۔ مگر بڑھاپے میں خاوند کی ایک نگہ واپسیں کو اطمینان کی حالت میں دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو خطروں میں ڈال دینا مشکل ہے۔ میں روتا ہوا آگے بڑھا۔ اور بولا۔

"دیوی! اندیشہ نہ کر۔ تیرے اور تیرے بچے کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ میری نگاہوں میں اُس کی عزت ایسی کبھی نہ تھی۔

سُدرشن

لیلیٰ

یا

محاصرۂ غرناطہ

مصنفہ لارڈ لٹن — مترجمہ سید امتیاز علی تاج

فصل سوم

سلطان اور الماس

جب بادشاہ اور الماس اکیلے رہ گئے۔ تو بادشاہ نے کہا "میرے رفیق۔ تیری خوشگوار نصیحتیں اکثر میرے دل کی بیتابی و بیقراری کو سکون و اطمینان سے بدل دیا کرتی ہیں لیکن موجودہ وقت میں سکون و سکوت نہایت سنگین جرم ہے۔ میں کیا تدبیر کروں؟ کیسے مقابلہ کروں؟ کیونکر جدوجہد کروں؟ ابو عبداللہ کی پیدائش کے وقت لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ الزغیبی کا لقب ٹھیک ٹھیک کیا تھا قبل اس کے کہ میں بدنصیبی سے رہائی پانے کے لئے کوئی موثر دعا مانگ سکوں سیاہ بختی نے میری پیشانی پر اپنی مہر لگا دی۔ میرے تند مزاج باپ کو جس کی غضب آلود پیشانی ملک الموت کی درشتی سے کچھ کم نہ تھی مجھ سے اس وقت بھی نفرت تھی۔ جب میں معصومیتِ طفلی کے گہوارے میں تھا۔ جوانی میں باغیوں نے میری منشاء کے خلاف میرے نام سے بغاوت کی۔ میرے باپ نے مجھے زندانی کر دیا۔ ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے یہی ہولناک تصور رہتا تھا۔ کہ میرا خوفناک انجام زہر ہلاہل کے ایک جام یا خنجرِ خونخوار کے ایک وار پر ہوگا۔ میری مخلصی صرف میری والدہ کی عقل و فراست کی ممنونِ احسان ہے۔ جب ضعف و ادبار سے بادشاہ کا فولادی عصائے سلطنت ٹوٹ گیا

تو میرے چچا الزغل نے مجھے تخت و تاج سے محروم کر کے میرا وہ حق سلب کر لیا۔ جو دست فطرت نے میرے نام لکھا تھا۔ میں نے علانیہ جنگ اور خفیہ غداری کی حالت میں حصول تاج و تخت کی خاطر کشمکش کی۔ اور آج کہ میں کُل غرناطہ کا بادشاہ ہوں۔ مجھے کس قدر توقع تھی۔ کہ لوگوں کے دلوں سے میرے چچا کی قدر و قیمت مٹ جائیگی کیونکہ وہ عیسائیوں سے مل گیا۔ اور ان کفار کے زیر اقتدار ایک چھوٹی سی ریاست پر قانع ہو گیا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری ناشاد رعایا۔ نے الزغل کا جرم بھی مجھ سے منسوب کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ اگر میں کاہلی اور غیر مستعدی سے کام نہ لیتا۔ تو میرا چچا کبھی عیسائیوں کی اطاعت قبول نہ کرتا۔ جب میں نے حریف کے ہاتھوں سے مخلصی پائی۔ تو میری رعایا مجھ پر لعنت بھیجتی ہے۔ اور مجھ کو اس الحمرا کے قلعے میں نظر بند کر رکھا ہے۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ کہ اپنی افواج کا سپہ سالار بن کر اپنی رعایا کا مقابلہ کروں۔ میری قوت اور ہمت تو خود مجھ سے چھین لی۔ اور اب مجھے بزدل اور متلون مزاج کہتے ہیں۔ جس طرح اس سامنے کی چٹان سے پانی بہا چلا جا رہا ہے۔ اور چٹان میں اس کو روکنے کی قوت نہیں۔ اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ سلطنت کے طوفان کو روکنا بھی میرے بس کا نہیں رہا۔

جب نوجوان سلطان یہ کہہ رہا تھا۔ اُس کی آواز سے درد آمیز جوش اُبل رہا تھا۔ اور وہ اپنی قلبی پریشانی کی وجہ سے حجرے میں نہایت سرعت اور بے چینی سے ٹہلتا جاتا تھا۔ المامن نے اس کی اس حالت کو سرد مہری کے ساتھ دیکھا۔ اس کی آنکھیں ساکن تھیں اور لبوں پر مہر سکوت۔

جب ابو عبداللہ اپنی تقریر ختم کر چکا۔ تو المامن بولا۔ "ضیاء المسلمین۔ کاتب تقدیر نے انسان کی قسمت میں نہ دائمی رنج لکھا ہے۔ نہ دوامی خوشی۔ ہمارے مطلع قسمت کے لئے تاریک بادل اور درخشاں آفتاب دونوں یکساں طور پر ناگزیر ہیں۔ اگر تو بچپن میں مصیبتیں جھیل چکا ہے۔ تو سمجھ لے۔ کہ تیری بدبختی کی رات کٹ چکی۔ اب تیرے شباب کا آفتاب شان و شوکت کے رنگ میں طلوع ہوگا۔ اور تیری پیری عیش و وقار کا پیام لائیگی"۔

ابو عبداللہ نے بیتاب ہو کر کہا۔ "تم تو ایسی باتیں کرتے ہو۔ جیسے فرڈیننڈ کی افواج میری فصیلوں کے نیچے موجود ہی نہیں"۔

المامن نے جواب دیا۔ "مغرب کی افواج بھی تو کثیر التعداد اور طاقتور تھیں پھر اُن کا انجام کیا ہوا"؟

بادشاہ نے متانت سے ایک [illegible] کہا۔ دشمن ہم مسلمانانِ اندلس مشرق کے ستاروں کی طرح

خدرھا ذھب رند ہی دیوانگی میں گرفتار نہیں ہیں ہم پر علوم و فلسفہ کی شعاعیں چمک چکی ہیں۔ اگر ہماری قوم کے عقیل و فہیم لوگ عوام الناس کے من گھڑت افسانے اور دور از قیاس قصے بظاہر مان لیتے ہیں۔ تو یہ محض اُن کی دانشمندانہ مصلحت ہے یضعف اعتقاد کا اس میں ذرا دخل نہیں۔ اس لئے میرے سامنے مذاہب قدیمہ اور اقوام پارینہ کی تمثیلات کا ذکر نہ کر۔ عہدِ حاضر کی دُنیا کے لئے کارکنانِ قضا و قدر صرف انسان ہیں ملائک نہیں۔ اور اگر مَیں اس وقت کا منتظر رہوں۔ کہ فرڈیننڈ کا حشر بھی سنحرب کی مانند ہو۔ تو گویا مَیں اس بات کا انتظار کرونگا۔ کہ صلیبی علم میرے بروج شنجرفی پر لہرائے"۔

المامن نے کہا۔ "اگر جہان پناہ دین کے مجنونانہ جوش کو تسلیم نہیں فرماتے۔ تو کیا ظلم و استبداد کی دیوانگی کو بھی نہیں مانتے ؟ گو آپ عبرانیوں کے عقاید پر ایمان نہیں رکھتے۔ لیکن آپ عرب کی اس قدیم اور قریب النسل قوم یعنی عبرانیوں کو خاک میں ملاتے دیتے ہیں۔ آپ کے قاضی اُن پر فتوے لگاتے ہیں۔ آپ کے جاسوس۔ آپ کے سپاہی اور آپ کی تمام رعایا انہیں ایذا پہنچاتی اور اُن پر جور و ستم روا رکھتی ہے"

ابو عبداللہ نے بلند آواز سے کہا۔ "وہ زر پرست یہودی اسی انجام کے مستحق ہیں۔ سونا اُن کا خُدا ہے۔ اور بازار اُن کا وطن مالوف۔ اس وقت جبکہ قومیں رو رہی ہیں۔ اُن کے چہرے چمک رہے ہیں۔ انہیں صرف یہی فکر دامنگیر ہے۔ کہ تجارت کے عروج و زوال پر کیا اثر پڑیگا۔ وہ زمانے بھر کے چور ہیں۔ جب اُن کا ہاتھ ہر شخص کی جیب کے درپے ہے۔ تو پھر وہ لوگوں کے ہاتھوں کو اپنی جان کے درپے دیکھکر کیوں متعجب ہوتے ہیں ؟ وہ تو قبیلہ حسینہ[1] سے بھی بدتر ہیں۔ جو قحط کے زمانے میں اپنے معبود کو کھاجاتے ہیں۔ یہ موسےٰ کی اُمت ایسی بے حیا ہے۔ کہ ایک کھجور کی گٹھلی کے عوض میں سات آسمان بیچنے کو تیار ہے[2]"۔

المامن نے جواب دیا۔ "تمہارے قوانین ہی ایسے ہیں۔ کہ ان لوگوں میں ہوسِ زر کے سوا اور کسی چیز کی اُمنگ پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جس طرح ایک پودا ٹیڑھا بینگا ہو کر اور اپنے تنے کو ہر طرح کی روک سے بچا کر اپنا سر آفتاب کی جانب بلند کرتا ہے۔ اسی طرح دماغ انسان بھی اپنے لئے راستہ نکالتا ہے۔ اور جب عالی ہمتی کی سیدھی اور جائز راہ اُس پر بند کر دی جاتی ہے۔ تو وہ اپنے عناصر اصلی سے جا ملتا ہے۔ خواہ وہ طوفانِ حکومت ہو۔ یا شعلۂ عزت یہ یہودی جب اپنی پاک مادرِ وطن کے آغوش میں تھے۔ تو تاجر نہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انہوں نے ہمارے ہی آبا و اجداد کی عربی افواج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اور قحط کے عالم میں اپنی ہڈیوں سے گوشت الگ کر دیا تھا۔ لیکن یہ گوارا نہ کیا۔ کہ اپنا کوئی ایسا شہر جو غرناطہ سے زیادہ غیر محفوظ

[1] قبیلہ حسینہ گائے ہوئے آٹے کے بچھڑے کی پرستش کیا کرتا تھا۔ (حقیقت) [2] قرآن کی ایک آیت جس میں صفات حمیدہ یہود ... [illegible]

ہو۔ ان فوجوں کے حوالے کر دیں۔ جو ہسپانیہ کے سیلانی
سرداروں سے بھی بہت زیادہ طاقت رکھتی تھیں۔ مگر خیر
یہ وقت ان قصّوں کا نہیں ہے۔ اگر حضور فرشتوں کی اعانت
سے منکر ہیں۔ تو کیا فانی انسان کی عقل پر اب تک اعتقاد
رکھتے ہیں؟"

ابو عبداللہ نے جواب دیا "بے شک اس لئے کہ
فرشتوں کی نسبت مجھے کچھ علم نہیں۔ لیکن انسانوں کی تدبیر
کو خوب جانتا ہوں۔ اے المامن! میرا آتش مزاج عزیز
موسیٰ آج شام کو میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے
اس بات پر اکسایا۔ کہ میں اپنی رعایا کا خوف دل سے نکال
دوں جس کی وجہ سے میری بے تاب اور شجاع روح ان
دیواروں کے اندر مقید ہے۔ اس نے مجھے اس امر پر آمادہ
کیا ہے۔ کہ وہ سامنے جو تلوار اور ڈھال لٹک رہی ہے۔
اسے باندھ کر سرداران غرناطہ کا افسر بنوں۔ اور دیویرمبلا
کے میدان میں جا پہنچوں۔ ان خیالات سے میرا دل سینے
میں اُچھلنے لگتا ہے۔ بہر حال اگر میں زندہ نہیں رہ سکتا
تو ایک بادشاہ کی طرح مر تو سکتا ہوں۔"

المامن نے بجھے ہوئے دل سے کہا "یہ باتیں تو
نہایت عالی ہمتی کی ہیں۔"

"تو تم میرے ارادے کی تائید کرتے ہو؟"

"بادشاہ کے ہوا خواہ اس کے مرنے کے ارادے
کو پسند نہیں کر سکتے۔"

ابو عبداللہ نے آواز بدل کر کہا "اوہو تو کیا تو یہ سمجھتا
ہے۔ کہ اس جدوجہد اور اس کشاکش میں میری قسمت میں
موت ہی لکھی ہے؟"

"یہ تو ساعت کی سعادت و نحوست پر منحصر ہے کہ آپ
کو فتح ہو یا شکست۔"

"اور وہ ساعت؟"

"ابھی نہیں آئی۔"

"کیا تو ستاروں سے ساعت معلوم کر لیتا ہے؟"

"ایسی بیہودہ سادہ دلی موری نجومیوں کو مبارک رہے
آپ کا خادم تو ان ستاروں میں وہ جہان دیکھتا ہے۔ جو
اس کرۂ ارض سے کہیں بڑے ہیں۔ جن کی روشنی نہ کبھی
معدوم ہو سکتی ہے۔ نہ مدہم۔ خواہ کرۂ ارض کائنات کی
فضائے بے پایاں سے بالکل معدوم ہو جائے۔"

ابو عبداللہ نے کہا "اے پر اسرار شخص۔ یہ قدرت
تو نے کہاں سے پائی۔ اور تجھ کو یہ آئندہ کا حال معلوم کرنے
کا علم کہاں سے حاصل ہوا؟"

المامن بادشاہ کی طرف بڑھا۔ جو اب کھلے جھروکے
میں کھڑا تھا۔ اور ڈارو کی ندی کی طرف اشارہ کر کے بادشاہ
سے کہنے لگا۔

"دیکھ اس ندی میں وہ عنصر بہہ رہا ہے جس میں انسان

نہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اور نہ سانس لے سکتا ہے۔ اور اُدھر دیکھ اس لطیف اور بے پایاں ہوا میں ہمارے قدم جم نہیں سکتے تمام عالم کی افواج قاہرہ بھی اُن پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکتیں لیکن علم کی ایک خاص کوشش سے مچھلیاں اور پرند فضا اور سمندر میں رہنے والی ہستیاں زندگی کی ایک ادنےٰ سے ادنےٰ مسرت کے سرانجام دینے میں کام آتی ہیں۔ یہی حال سحر کے صحیح علم کا بھی ہے۔ کیا تُو یہ سمجھتا ہے۔ کہ زمین کی سطح تو اس قدر زندہ ہستیوں سے بھری پڑی ہے۔ اور زمین کے کشادہ مرکز میں اور اس وسیع فضا میں کوئی جاندار نہیں بستا؟ جس طرح ماہی گیر مچھلیوں کو جال میں پھنسا لیتا ہے جس طرح شکاری پرندوں کو اسیر۔۔۔۔ دام کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنے انسانی فن اور خداداد ذہانت سے ان ہستیوں کو اپنا مطیع و منقاد بنا سکتے ہیں۔ جن کے عالم و عناصر میں اس مادی جسم کے ساتھ داخل نہیں ہو سکتے اور جن کو ہمارے حواس کثیف محسوس نہیں کر سکتے۔ بس یہی میرا فن ہے۔ دوسرے کسی عالم کا حال مجھے معلوم نہیں لیکن اس دُنیا کی چیزوں کے متعلق خواہ وہ انسان ہوں اور خواہ تمہاری روایات کے مطابق جنّات ہوں۔ مَیں نے کچھ علم حاصل کیا ہے۔ آئندہ کی نسبت مَیں خود بے خبر ہوں۔ مجھے علم غیب حاصل نہیں۔ لیکن مَیں اپنے عمل فسونگری سے ایسی ہستیوں کو پیدا کر سکتا ہوں۔ جن کی نظریں زیادہ عمیق اور جن کی فطرت میں خداداد قوتیں زیادہ رکھی گئی ہیں۔"

ابو عبداللہ کے دل پر ان باتوں کا اتنا اثر نہیں پڑا تھا جتنا اس کی خوفناک طرز گفتگو اور پُر رعب چہرے نے ڈالا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "تو مجھے اپنے دعوے کا ثبوت دے۔"

الامن نے جواب دیا۔ "سلطان کا حکم میرے لئے بمنزلہ قانون ہے۔ مَیں حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوں۔ کل رات مَیں آپ کا انتظار کرونگا۔"

"کہاں؟"

الامن نے ایک لمحہ تامّل کیا۔ اور پھر کوئی فقرہ آہستہ سے بادشاہ کے کان میں کہا۔ جسے سُن کر ابو عبداللہ چونک اُٹھا اور اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"وہ تو بہت ہولناک مقام ہے!"

"مگر اے سلطان جبتک فرڈینڈ قلعے کی دیواروں کے باہر اور موسےٰ شہر کے اندر ہے یہی حالت الحمراء کی بھی ہے۔"

"موسےٰ! کیا تُو میرے سب سے بہادر جنگجو پر شبہ کرنے کی جُراَت کرتا ہے؟"

"کسی عقلمند بادشاہ نے کبھی کسی ایسے شخص پر اعتماد کیا ہے جو تمام فوج کا معبود بنا ہُوا ہو؟ اگر ابو عبداللہ کل سو، اتفاق سے ایک تیر کھا کر میدانِ جنگ میں مر جائے تو عمائد سلطنت اور بہادرانِ عساکر کسے تختِ سلطانی پر

بتلائیں گے؟ کیا اس بات کا جواب دینے کے لئے بھی اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ کوئی ساحر چپکے سے تیرے کان میں آکر کہے۔ کہ وہ موت ہی ہے۔ جس کی طرف تمام سلطنت کی نظریں اُٹھ رہی ہیں"۔

ابو عبداللہ بیتابی اور نا امیدی کے عالم میں چیخ اُٹھا "آہ کمبخت سلطنت! مصیبت زدہ بادشاہ! مجھے شفقت پدری کبھی نصیب نہ ہُوئی۔ اب میری کوئی رعایا نہیں۔ اور کوئی دم جاتا ہے۔ کہ یہ ملک بھی اپنا نہ رہیگا۔ ہائے کیا مجھے کبھی کوئی مخلص دوست نصیب نہ ہوگا؟"

المامن نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "دوست! کسی بادشاہ کو کبھی کوئی دوست نصیب نہیں ہوا"۔

ابو عبداللہ کی آنکھوں میں سے اسی آگ کی چنگاریاں برسنے لگیں۔ جو اس کی نسل اور اس کے مرتبہ عالی کی سرشت میں شامل تھی۔ اور وہ بیتاب ہو کر بولا "دُور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جا۔ تیری سرد اور بے درد دانشمندی میری شجاعت کے خون کو رگوں میں منجمد کئے دیتی ہے۔ تیری باتیں کامرانی۔ اعتماد۔ انسانی ہمدردی اور تمام حسیات کو میرے دل سے مفقود کئے دیتی ہے۔ میرے پاس سے چلا جا! مَیں تنہائی چاہتا ہوں"۔

المامن نے نہایت بے پروائی سے اور روکھی سی آواز میں کہا۔ "ابو عبداللہ کل آدھی رات کے وقت پھر مُلاقات ہوگی۔ خُدا بادشاہ کو ہمیشہ سلامت رکھے"۔

بادشاہ نے منہ پھیر لیا لیکن اس کا ناصح اس سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ جس طرح وہ آیا تھا۔ اسی طرح خاموشی سے اور رُوح کی مانند دفعتاً غائب ہو گیا۔

(باقی باقی)

حامد

جستجوئے دید قلب آرزو مسکن میں ہے
مضطرب اِک برق گویا میرے جانِ تن میں ہے

اے خود آرا، نازہی کیا؟ اپنا اپنا ہے نصیب
فرق ایسا کیا، مری جیب اور ترے دامن میں ہے

ظلم کا کس کو گلہ، ذوقِ نظر درکار ہے
یہ پشیمانی عبث چشمِ بُتِ پُرفن میں ہے

پھر جنوں کرنے لگا ہے سلسلہ جنبانیاں
پھر وہ طوقِ حلقۂ گیسو مری گردن میں ہے

دیکھنا حامد ذرا محفل طرازی حُسن کی
ہر شریکِ بزم گویا وادیِ ایمن میں ہے

ساون رین کا سپنا

مصنفہ ولیم شیکسپیئر　　مترجمہ سید امتیاز علی تاج

باب (۲) دوم

فصل اوّل

ایتھنا کے قریب ایک جنگل

(ایک طرف سے پوک اور دوسری طرف سے ایک پری داخل ہوتی ہے)

پوک کیوں بی پری۔ کدھر پھر رہی ہو؟

پری:-

پہاڑیوں اور وادیوں میں
گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں
چمن چمن اور کیاریوں میں
ہر ایک جگہ میری رہگزر ہے
تلاطم بحر خشمگیں پر
تموج سیل آتشیں پر
خرام مہتاب سے سبک تر
میں ساری دنیا میں گھومتی ہوں
ہے وہ جو پریوں کی شاہزادی
سپرد ہے مجھ کو خدمت اس کی
کہ رقص سبزے پہ جب کرے گی
میں حلقے شبنم سے تر کروں گی
یہ اونچے گاؤزبان کے پودے
بنے ہوئے ہیں مصاحب اس کے
لباس پر جن کے پھول بوٹے
سنہری یا لالہ گوں ہیں سارے
تمام پریوں کے ہیں چہیتے
انہیں کی خوشبو بسی ہوئی ہے

اب مجھے جا کر اوس کی بوندیں لانی ہیں۔ اور ہر پھول کے کان میں ایک دردانہ لٹکانا ہے۔ بھونڈے پری زاد رخصت میں اب جاتی ہوں۔ ہماری ملکہ اور اس کی تمام ساتھی پریاں ابھی ابھی یہاں آ رہی ہیں۔

پوک۔ آج رات یہاں بادشاہ جشن منانے کا ارادہ ہے دیکھیو۔ تیری ملکہ اسے نظر نہ پڑ جائے۔ اوبران کا مزاج بگڑ رہا ہے۔ اور وہ غضبناک ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے کسی راجہ کے ہاں سے ملکہ ایک خوبصورت لڑکا اٹھا لائی ہے۔ ایسا خوبصورت آدم زاد۔ کہ پہلے کبھی اسے نصیب نہیں ہوا۔ ملکہ نے اسے اپنے ہمراہیوں میں رکھ لیا ہے۔ اور جبن پیٹا اوبران چاہتا ہے۔ کہ وہ اس کے خدام کی جماعت میں رہے اور اس کے ساتھ ساتھ جنگل بیابانوں میں پھرا کرے۔ مگر ملکہ نے اس

خوبصورت لڑکے کو اپنے پاس رکھ رکھا ہے۔ پھولوں سے اس کو سجاتی ہے۔ اور اپنا دل بہلاتی ہے۔ اب ملکہ اور بادشاہ جنگل میں ملیں یا سبزہ زار میں کسی صاف چشمے کے کنارے یا ڈلکتے تاروں کی روشنی میں۔ ایسی چھڑتی ہے۔ کہ ڈر کے مارے تمام پریزاد بلوط کے پھلوں کے چھلکوں میں گھس کے چھپ جاتے ہیں

پری۔ یا تو میں تیری شکل بھولتی ہوں۔ اور پھر یا تو وہ شوخ اور شریر پریزاد معلوم ہوتا ہے۔ جسے روبن گڈ فیلو کہتے ہیں کیوں وہی نہیں تو؟ جو گاؤں کی لڑکیوں کو ڈرا دیا کرتا ہے۔ دودھ پر سے بالائی اڑا لے جاتا ہے۔ کبھی بلا ضرورت چکی چلانے لگتا ہے۔ گھروالی بلوتے بلوتے ہانپ جائے۔ اور تو مکھن نہیں بننے دیتا کبھی شراب میں خمیر اٹھنے سے روک دیتا ہے۔ رات کو مسافروں کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ اور ان کے دکھ پر ہنستا ہے۔ اور جو کوئی تجھے ہاب گوبلن یا پیارا پوک کہے ان کا کام کاج کر دیتا ہے۔ اور ان کی قسمت سنوارتا ہے۔ کیوں۔ سچ کہنا۔ وہی نہیں تو؟

پوک۔ تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں وہی رات کا منڑگشت کرنے والا خوش وقت ہوں۔ میرا کام اوبران کو اپنے مسخرہ پن سے ہنسانا ہے کبھی تو میں نوجوان بچھیری کی طرح ہنہنا کر کسی موٹے تازے اور تیار گھوڑے کو دھوکا دیتا ہوں۔ اور کبھی عین مین بھنا بھنایا جنگلی سیب بن کر جوگی شراب کے پیالے میں چھپ بیٹھتا ہوں اور جب کوئی بڑی بوڑھی پینے کو ہوتی ہے۔ تو ان کے ہونٹ سے ٹکرا کر ان کی سوکھی مرجھائی گردن پر شراب گرا دیتا ہوں۔ جب کوئی بڑی جہاندیدہ بڑھیا کوئی نہایت دکھ بھری سرگزشت سنانے کو تیار ہوتی ہیں۔ تو مجھ کو غلطی میں گز بھر اونچا اسٹول سمجھ مجھ پر بیٹھا چاہتی ہے۔ میں نیچے سے کھسک جاتا ہوں۔ اور آپ اڑا اڑا دھم کر کے نیچے آ پڑتی ہیں۔ موئے غارت ہو کہہ کر کھانسی کا طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ اور پھر تمام چوپال کا مارے ہنسی کے پیٹ درد کرنے لگتا ہے۔ ہنستے ہنستے چھینکیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور سب قسمیں کھانے لگتے ہیں۔ کہ کبھی اس سے زیادہ مزے کا وقت نہیں گزرا۔ لے اب پرے ہٹ جا۔ اوبران آ رہا ہے۔

پری۔ اور میری ملکہ بھی آ رہی ہے خدا کرے بادشاہ دفع ہو جائے

(ایک طرف سے اوبران اور دوسری طرف سے طیطانیا داخل ہوتی ہے)

اوبران۔ مغرور طیطانیا۔ یہ چاندنی رات میں کہاں صورت دکھائی

طیطانیا۔ کون۔ جلن بیٹا اوبران۔ پریو۔ اڑ چلو۔ میں اس کی صحبت اور بستر ہی ترک کرنے کی قسم کھا چکی ہوں؟

اوبران۔ آوارہ عورت ٹھہر میں کیا تیرا خاوند نہیں ہوں؟

طیطانیا۔ تو پھر میں تمہاری بیوی ہوئی لیکن مجھے معلوم ہے جب تو چھپ چھپ کر پرستان سے نکلا گیا ہے۔ اور گوالا بنکر تمام دن بیٹھا من موہنی فلیدا کے عشق میں جئی کی بنی ہوئی بانسری بجاتا اور عشقیہ گیت گاتا رہا ہے۔ ہندوستان کی دور دراز زمین سے اب یہاں کیوں آیا ہے۔ ہاں ہاں تیری جنگجو معشوقہ

مستعطی ایمیزینی ملکہ جو تھیسیوس سے بیاہی جا رہی تھی ان کے وصال کو مسرت اور برکت بخشنے کو تشریف آئی ہے۔

اوبران۔ طیطانیا تجھے معلوم ہے میں تھیسیوس سے تیری محبت کا حال جانتا ہوں اور تو میرا اور ہپولیتا کے تعلقات کی طرف اشارہ کرتے ڈوب نہیں مرتی۔ جب تھیسیوس نے پیری گینیا کی عصمت زبردستی لوٹی تو رات کی دھندلی روشنی میں تو اس کی رہنما بنی تھی؟ حسین ایگل سے ایریڈین اور انٹی اوپا سے اس کے عہد محبت تو نے نہیں تڑوائے؟

طیطانیا۔ یہ جھوٹی کہانیاں حسد کا نتیجہ ہیں۔ اور گرمیوں کا زور شروع ہونے سے پہلے جب کبھی تو ہم سے ملا ہے۔ پہاڑ پر یا وادی میں۔ جنگل میں یا سبزہ زار میں۔ پتھریلی تہ کے چشموں کے پاس۔ شور مچاتی ہوئی ندیوں کے کنارے۔ یا سمندر کے شکستہ ساحل پر جہاں ہوا کے فراٹوں میں ہم اپنا ناچ کے چکر کاٹتے ہیں۔ تو نے اپنے خرخشوں سے ہمارے کھیل کود کا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ اسی لئے جب ہواؤں نے دیکھا۔ کہ ہم ان کے راگ نہیں سنتے۔ تو انہوں نے گویا انتقام لینے کو سمندر میں سے فاسد کہر چوس لی۔ اور وہ زمین پر برسی تو سوکھے دریاؤں کا دماغ وہ چڑھا۔ کہ وہ اپنے بند توڑ نکلے۔ بیل کے ہل کا بوجھ اٹھانے کی محنت۔ اور کسان کی عرق ریزی ضائع ہوئی۔ اور اس سے پیشتر کہ سرسبز فصل کی جوانی پر بال آئیں۔ وہ گل سڑ گئی۔ سیلاب سے برباد کھیتوں میں ... خالی پڑے ہیں۔ اور بیماریوں کا شکار گلے چیل کوؤں کی خوراک بن رہے ہیں۔ کھیلوں کی گنتیاں کیچڑ سے بھر گئی ہیں۔ اور چلنے پھرنے والوں کی کمی کے باعث لہلہاتی ہوئی گھاس کی پگڈنڈیاں غائب ہو گئی ہیں۔ آدم زاد سرمائی مسرتوں کے خواہاں ہیں۔ کوئی رات حمد کے گیتوں سے برکت نہیں پاتی۔ طوفانوں کے حکمراں چاند کا چہرہ ہماری بے نیازیوں کے باعث غصّے سے زرد ہو رہا ہے۔ اور وہ فضا کو رطوبت سے لبریز کر رہا ہے۔ کہ بیماریوں کا زور ہو۔ اس افراتفری میں ہم موسم تبدیل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ قرمزی گلاب کی تازہ آغوش میں سفید برف گر رہی ہے اور پیر سرما کے مختصر برفانی تاج پر موسم سرما کی شیریں کلیوں کا معطر سہرا مضحک معلوم ہو رہا ہے۔ بہار اور گرما۔ بارآور خزاں اور غضبناک سرما اپنے اپنے لباس تبدیل کر رہی ہیں۔ اور مبہوت دنیا ان کی پیداوار سے معلوم نہیں کر سکتی۔ کہ یہ کون سا موسم ہے۔ اور مصائب کا یہ تمام سلسلہ ہماری لڑائی۔ ہماری نارضامندی کا نتیجہ ہے۔ اس کی جڑ ہم ہیں۔

اوبران۔ تو تم ان کو سنوار دو۔ یہ تمہارے بس میں ہے طیطانیا اپنے اوبران سے کیوں بگڑے؟ میں صرف ایک ننھے سے آدم زاد کو مانگ رہا ہوں۔ کہ وہ میرا خادم بن جائے؟

(باقی باقی)

تاج

معجزاتِ ادارت

ایڈیٹر نے اپنے بالوں کو یا اگر ذرا زیادہ صحیح الفاظ کے استعمال کی ضرورت ہے۔ تو اپنی کھوپڑی کی کھال کو انگلیوں سے کھجاتے ہوئے اور اپنے تمام سرمایۂ غور و فکر کو پیشانی کی شکنوں میں جمع کر کے کہا۔ "جناب ابوالتحریر صاحب آج کیا تاریخ ہے۔

ایک کونے سے آواز آئی "جی یکم ہو گئی نا۔

یکم یعنی پہلی، اُفوہ یہ تو ہماری اشاعت کا دِن ہے۔ اور تم نے پرچا بھی تک نہیں لکھا۔

"جی لکھتا کیا خاک، ایک مضمون تھا۔ وہ بِحَمدِاللہ ہو گیا لکھ چکا۔

"صرف ایک مضمون لکھا ہے؟ یعنی تمام کا تمام رسالہ باقی ہے۔ اور تم نے مجھ سے کہا تک نہیں۔"

"روز تو کہتا ہوں۔ مگر آپ کے پاس مضمون ہوتا۔ تو دیتے۔ اس میں آپ کا بھی کیا قصور ہے۔"

ایڈیٹر نے جائنٹ ایڈیٹر کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔ "جناب ان غریب ہندوستانی ایڈیٹروں کی حالت دیکھئے بیچارے کیا کیا کریں۔ مضمون یہ لکھیں، کاپی یہ دیکھیں، پروف یہ پڑھیں۔ مینجری یہ کریں۔ اشتہاروں کے لئے دربدر یہ پھریں۔ مضامین کے لئے مضمون نگاروں کی خوشامد یہ کریں۔ بھلا ان کو ایڈیٹری کی کہاں فرصت۔ مگر اب یہ تو بتاؤ۔ کہ یہ رسالہ تیار کیسے ہو گا۔"

ابوالتحریر نے ایک دردناک آواز میں جواب دیا۔ "میری حالت آپ سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ کتابت کروں تو میں۔ چپراسی کا کام انجام دوں تو میں۔ جز بندی کروں تو میں۔ آپ کی چلم بھروں تو میں۔ اور پھر مطبع والوں کی گھرکیاں سہوں تو میں"

ایڈیٹر کا چہرہ فوراً کسی بڑے خیال کی تحریک سے تمتما اُٹھا بھئی واہ خوب یاد دلایا۔ بس رسالہ میں جسقدر دیر ہو۔ اس کا الزام مطبع پر تھوپ دو۔ چلو لکھو۔

"مطبع والوں کی سہل انگاریوں اور بے پروائیوں کی چوکھٹ پر ہزاروں اخبار اور رسائل اپنا خونِ زندگی بہا چکے ہیں۔ مگر ان ظالموں کا دِل نہیں پسیجتا۔ کبھی کام کی کثرت کا بہانہ کرتے ہیں کبھی اپنی مشکلات کا عذر کرتے ہیں بس اسی طرح آج کل کر کے ٹال دیتے ہیں۔ جیسے ہمارا کام تو کام ہی نہیں۔ ہماری مشکلیں تو بالکل بے معنی ہیں۔ امید ہے۔ کہ ناظرین کرام ہماری دقتوں کو مدِّ نظر رکھ کر اس مجبوری تاخیر کو محض مطبع کی خود مختارانہ بے پروائی پر محمول فرمائیں گے۔"...... ابوالتحریر صاحب ذرا لکھنا

ایک صفحہ کے لئے کافی مواد ہُوا ہے یا نہیں ؟
ابوالتحریر نے مسودے کو غور سے دیکھ کر اور چشمے کے حلقوں سے اُوپر دیکھتے ہُوئے کہا "جی نہیں"
ایڈیٹر نے ذرا غصّے سے جواب دیا "مَیں نے اپنا خونِ جگر بہا دیا ہے۔ اور تم نے ایک صفحہ بھی نہیں لکھا۔ تم بہت ہی باریک لکھتے ہو۔ آیندہ سے ایسا باریک نہیں ہونا چاہیئے"
.... "ہاں ذرا اس خط کی تبدیلی کے متعلق بھی ابھی ایک نوٹ لکھدو۔" "یہ دیکھکر کہ رسائل کے پڑھنے والے رسائل کو محض تفریح طبع کے لئے پڑھتے ہیں۔ اور بسا اوقات بہت باریک خط سے ان کی بصارت پر ناقابلِ برداشت بار پڑتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ آیندہ سے اس رسالے کا خط زیادہ جلی اور صاف ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس کے پڑھنے میں ناظرینِ کرام کو نہ تو کوئی دقّت پیش آئے اور نہ اُنکا وقت ہی ضائع ہو۔"
ابوالتحریر صاحب، دیکھئے۔ اب صفحہ پُورا ہُوا یا نہیں"۔
ابوالتحریر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "صاحب ابھی کہاں"
ایڈیٹر نے غصّہ کے لہجہ میں جواب دیا۔ "تو اب تم اس صفحے کو خود ختم کر لو۔ جو جی چاہے لکھدو۔" "مگر مَیں لکھوں تو کیا لکھوں"
"مطبع والوں کو گالیاں دیدو۔" "چندہ دئے بغیر رسائل پڑھنے والوں کو بُرا بھلا کہہ دو۔" "مضمون نگاروں کی بے توجہی کی شکایت کر دو۔" "خریداری کی کمی کا رونا رو دو۔" "موسم کی خرابی کا ذکر کر دو۔" "اور کچھ نہیں تو ہماری ناسازیٔ طبع کی اطلاع دیدو۔" بخار۔ درد سر۔ دماغی کمزوری۔ تھکن کثرتِ کار سے گھٹیا ہو جانے کا خطرہ۔ الغرض کوئی بیماری بیان کر دو۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں۔ تو ان ادبی خدمات کا تذکرہ کر دو۔ جو ہم اس رسالہ کے ذریعے انجام دے رہے ہیں۔ اور اس ضمن میں لوگوں کی ناقدری کی شکایت ضرور ہو۔ اور بڑے پُر زور الفاظ میں"۔
ابوالتحریر نے مُسکراتے ہوئے۔ اور شاید اپنے اس نئے کام کی اہمیّت کو محسوس کرتے ہُوئے کہا "لیکن یہ تو ایک ہی صفحہ ہُوا۔ اٹھائیس صفحے باقی ہیں"۔
"اٹھائیس صفحے"؟ ایڈیٹر نے دیوانہ وار استعجاب اور غصّہ سے پُوچھا۔
ابوالتحریر نے آہستہ سے جواب دیا۔ "جی ہاں اٹھائیس صفحے"
"مگر وہ مضمون کیا ہُوا۔ جو تم نے لکھا تھا"۔
"وہ تو تین صفحوں پر ختم ہو گیا ہے۔ ایک صفحہ یہ ہُوا۔ کل چار گویا بتیس میں سے چار لکھے گئے۔ باقی اٹھائیس ہی تو رہے"
ایڈیٹر پر معاملہ کی اہمیّت قضائے مبرم بنکر ظاہر ہوئی مگر پھر کچھ سوچکر اُس نے دریافت کیا۔
"ایک صفحہ تو فہرستِ مضامین کا ہُوا"۔
"جی ہاں"
"تو ایک صفحہ پر صرف رسالہ کا نام لکھدو۔ آجکل یُورپ

کی بہترین کتابیں کچھ ایسی ہی صفائی اور نفاست سے شائع ہوتی ہیں۔"

"بہت بہتر"

"باقی کتنے صفحے رہے؟ چھبیس"

"جی چھبیس ہی تو رہ گئے۔"

"اچھا دیکھو تو ہمارے ہاں کچھ اخبار اور رسائل موجود ہیں؟"

"ہیں تو مگر سب پرانی تاریخوں کے کیونکہ کئی مہینے سے تبادلہ کے اخبار اور رسائل بھی بند ہو گئے۔"

"کچھ پروا نہیں۔ ایک نیا عنوان قائم کرو۔"

"ادب اُردو کے جواہر ریزے"

"اور اس کے نیچے خفی قلم سے ایک دوسری سُرخی لکھو"

"معجزات ادارت کی یاد میں"

"یہ لکھکر جو اخبار اور رسالے تمہارے ہاتھ لگیں۔ ان میں سے صفحے کے صفحے نقل کر ڈالو۔"

"ہاں شروع میں ایک نوٹ اس کے متعلق دے دو۔"

"ہم آج ایک بڑے ادبی فرض کو ادا کر رہے ہیں۔ ان معجزات ادارت کو جو زمانہ ماضی کی تاریک خاکستر میں مدفون ہو چکے ہیں۔ ایک بار پھر منظر عام پر لانے سے ہمارا مقصد یہی اور صرف یہی ہے۔ کہ شائقین ادب کو اس مے قدیم کے کیف سے سرشار کر دیں۔ اور اپنے معاصرین کی خدمت میں وہ خراج تحسین پیش کریں۔ جو اُن کا حق اور ہمارا فرض ہے۔"

"اب کہو بھئی کتنے صفحے لکھ سکو گے۔"

"یہ ترکیب ہے۔ تو بس رسالہ ختم ہو گیا۔ بلکہ اگر آپ چاہیں تو سال بھر کے رسالوں کے لئے مواد مل گیا۔"

ایڈیٹر نے اپنی قابلیت اور معاملہ فہمی کے غرور سے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں اس سے ہماری کمزوری اور ناقابلیت ثابت ہوگی بس دس صفحے کافی ہونگے۔ اب رہے سولہ صفحے....

"خوب یاد آیا۔ ذرا کچھ پرانی کتابیں دیکھو۔ اور اُن میں سے چیدہ چیدہ اقتباسات ڈھونڈھ نکالو۔"

ابوالتحریر نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔ "کس مضمون کے متعلق"؟

ایڈیٹر نے بڑے وثوق اور ایک اندازِ برتری سے کہا۔ "ہر مضمون کے متعلق۔ ادب کی خواہ کوئی صنف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی قدر افزائی ضروری ہے۔ جناب اسی عدم قدرشناسی سے ہی تو یہ جواہر علم و ادب تباہ ہو گئے ہیں۔"

"تو ان کے لئے بھی کوئی خاص عنوان ہوگا۔"

"بیشک عنوان کی شوکت مضمون کے لئے بہت ضروری ہے۔ لکھو۔"

"دفتر پارینہ"

"اور ہاں خوب یاد آیا۔ اس کے نیچے جلی قلم سے اُستاد کا یہ شعر لکھو۔"

"گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را"

"دیکھو ابوالتحریر صاحب محنت کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ آخر آج وہ تمام محنت جو علم ادب کی تحصیل میں کی تھی کام آرہی ہے"

"اور ہاں یہ بھی منفعل ہوگا۔ اس شعر کے نیچے اس سے بھی زیادہ جلی قلم سے یہ مصرعہ بھی لکھ دو"

"آثار پدید است صنادید عجم را"

"اور پھر ایک ایڈیٹوریل نوٹ بھی لگے ہاتھوں لکھ ڈالو"

"ہم ایک اہم قرض کی ادائگی سے قاصر رہینگے۔ اگر ہم اپنے معاصرین کے ادبی معجزات کے ساتھ ساتھ قدماء کے ان محیر العقول اور نادر الوجود نتائج فکر کو بے نقاب نہ کریں ....

(ابوالتحریر سے) تم گھبراؤ مت یہ مشکل الفاظ بہت ضروری ہیں۔ انہی کے استعمال سے تو ایڈیٹر کی لیاقت کا سکہ بیٹھتا ہے اور یاد رکھو۔ کہ ادب اُردو میں اگر ترقی ہوسکتی ہے۔ تو ان ہی تراکیب کے رواج دینے سے۔ ورنہ معمولی الفاظ میں باتیں تو ہر شخص ہی کرلیتا ہے۔ ہاں کیا لکھا تھا؟

ابوالتحریر نے کچھ مرعوب سا ہو کر آخری جملہ پڑھا۔

"محیر العقول اور نادر الوجود نتائج فکر کو بے نقاب نہ کریں"

ایڈیٹر نے ٹہل ٹہل کر خود دارانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"جنہوں نے ادب اُردو کے نشر و توسیع میں وہ وقیع حصہ لیا ہے جس کی اہمیت سے غافل ہونا ایک بڑی ادبی محرومی اور قومی بد قسمتی ہے۔ بدبخت ہے وہ ملک جو اپنے انشا پردازوں کی اس مافوق الفطرت جدوجہد کو بھول جائے جس سے زبان کی نشو و نما اور لٹریچر کے ارتقا کو اسقدر گراں بہا امداد ملی ہے۔ یقیناً اُن شہسوارانِ ادب کا درجہ جنہوں نے میدان قرطاس پر اشہب قلم کو دوڑا دوڑا کر ممالک معانی کی تسخیر کی ہے۔ ان جانباز دلاوروں سے کم نہیں ہوسکتے جنہوں نے اپنے دست و بازو کی ہمت سے توسیع اقالیم میں جانیں قربان کردیں۔ ہمیں امید ہے۔ کہ ہمارے ناظرین ہماری اس جدت کی قدر کرینگے۔ اور ان لآلی آبدار کو جنت نگاہ اور فردوس گوش بنائینگے"

"اس نوٹ کے تحت جو کتاب تمہارے سامنے آئے اس میں سے آٹھ صفحے نقل کر ڈالو"

"ذرا حساب تو کرنا باقی کتنے صفحے رہ گئے"

"ابھی آٹھ صفحے باقی ہیں"

"اوہ اسقدر محنت شاقہ اور ابھی آٹھ صفحوں کی کمی! بھلا آرام کرسی پر بیٹھ کر رسالہ کو پڑھنے والے ہماری اس محنت کی کیا قدر کرسکتے ہیں۔ افسوس ہندوستان میں اس فن کی کوئی قدر نہیں۔ کاش کہ میں یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوا ہوتا۔ تو پھر تم کو دکھا دیتا۔ کہ ایڈیٹری کس کو کہتے ہیں"

"ہاں تو ابھی آٹھ صفحے باقی ہیں"

"یہ تو کہو کوئی کتاب یا رسالہ یا اخبار ریویو کے لئے تو نہیں آیا؟"

"جی ہاں مدت سے کئی کتابیں ریویو کے لئے رکھی ہیں"

اس سے پہلے تو آپ کو فرصت نہیں تھی۔"
ایڈیٹر نے خوشی سے اُچھل کر کہا۔
"تو بس اب کیا ہے۔ رسالہ مکمل ہو گیا۔ ذرا اُٹھ بیٹھو مُردِ خُدا اور کتابوں کو گن ڈالو۔"
ابوالتحریر نے ایک بوسیدہ الماری سے کچھ گرد آلود کتابیں نکالیں۔ اور گن کر کہا "چھیں تو بہت سی مگر اب کوئی چھ ہی نظر آتی ہیں۔"
"صرف چھ اُفوہ غضب ہوا۔ اگر آٹھ نکل آتیں۔ تو رسالہ مکمل ہو جاتا۔ خیر چھ ہی سہی۔"
ابوالتحریر قلم ہاتھ میں لیکر ایڈیٹر صاحب کی گہر افشانی کا انتظار کرنے لگا۔
ایڈیٹر نے اس کو منتظر دیکھ کر کچھ حیرت سے کہا "اب انتظار کا ہے کا ہے۔ بس لکھنا شروع کر دو۔"
"مگر جناب ابھی ریویو کے متعلق تو کچھ ارشاد نہیں ہوا۔"
"اوہو تم اتنے زمانہ سے اس دفتر میں کام کر رہے ہو اور تمہیں ریویو لکھنے کا سلیقہ تک نہیں آیا۔ سچ ہے اگر تم میں یہ عقل ہوتی۔ تو آج میری جگہ کرسی ادارت پر کیوں نہ بیٹھے ہوتے۔ سُنو۔ ریویو کے لئے جو لوگ کتابیں وغیرہ بھیجتے ہیں۔ اُن کا مقصد صرف اشتہار ہوتا ہے۔ یعنی بجائے اشتہار کی نقد اُجرت دینے کے وہ قیمت کتاب کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہی کرنا چاہئے

ہاں اپنا تبحر علمی اور وسعت نظر دکھانے کے لئے یہ فقرے کافی ہیں:-
"کتاب خوب ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ کاغذ ولایتی۔ فلاں تقطیع۔ اس قدر قیمت۔ فلاں جگہ سے مل سکتی ہے۔"
"اور کبھی کبھی یہ بھی لکھدیا کرو کہ مُصنّف نے جو عرقریزی اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں کی ہے۔ ہم اس کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تاہم یہ موضوع اسقدر اہم ہے۔ کہ فقط اس کتاب سے ہی ہماری تشنگیٔ ذوق کو تسکین نہیں ہو سکتی۔"
"بس اس قسم کے چند فقرے ازبر کر لو پھر تم جس کتاب پر چاہو ریویو کر سکتے ہو۔"
ابوالتحریر نے ایک فلسفی کی طرح عبارت کو پڑھتے ہُوئے پوچھا "مگر جناب کتابوں کی تقطیع کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں۔"
ایڈیٹر نے پھر ایک احساس برتری سے متاثر ہو کر کہا۔ "کوئی بھی تقطیع لکھ ڈالو۔ اس کو کون پوچھتا ہے۔ $\frac{۲۷ \times ۱۷}{۴}$ $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ بس ایک سے سو تک کے ہندسوں کا اسی طریق سے استعمال کر ڈالو۔ ہاں آخر میں ایڈیٹر کی طرف سے یہ اعلان کر دینا ضروری ہے کہ
ہم ان بیشمار کتابوں پر جو ریویو کے لئے موصول ہوتی ہیں۔ عدم فرصت و گنجائش کی مجبوری سے اس اشاعت میں

تبصرہ کرنے سے معذور ہیں۔ مگر ہم کتب و رسائل کے تبصرہ و تنقید کو ادارت کا سب سے اہم فرض سمجھتے ہیں اور انشاءاللہ اس کی ادائیگی میں ہم کبھی کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہونگے۔"

"اس کا مطلب بھی سمجھے؟"

ابوالتحریر نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر مایوس ہو کر آخر کار خاموشی سے ہی کام لینا پڑا۔

ایڈیٹر صاحب نے ایک قہقہ لگایا اور کہا۔

"مطلب صرف یہی ہے۔ کہ دُنیا بھر کی کتابیں ہمارے کتب خانے میں جمع ہو جائیں۔ اور سب مُفت۔ رسالے کے صفحات بھی پُر ہو گئے۔ اور ہماری لیاقت کا شہرہ بھی ہو گیا۔ اور کیا چاہیئے؟"

ابوالتحریر نے اس نئی معلومات کے بارِ گراں سے دب کر کہا۔ "درست، مگر ان باقی کے دو صفحوں کا کیا کیا جائے؟"

ایڈیٹر صاحب نے پھر اپنے بحرِ فکر میں غوطہ لگایا اور پھر گویا ایک عظیم القدر احساس فرض سے متاثر ہو کر کہا۔

"بھئی بہت اچھا ہُوا۔ کہ دو صفحے رہ گئے۔ ورنہ غضب ہی ہو گیا تھا۔ تمام کا تمام رسالہ ٹھوس علمی معلومات سے بھر گیا۔ اور ادب لطیف کے لئے ہم نے کوئی جگہ نہ نکالی۔ عام طور پر لوگ ان علمی جواہر کی قدر نہیں کرسکتے۔ ہندوستان میں ابھی مذاق علم و ادب بہت پست حالت میں ہے۔ تو بس ان صفحوں کو جو اتفاق سے بچ رہے ہیں۔ ادب لطیف کے لئے وقف کردو۔"

ابوالتحریر نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "مگر ابھی تو کوئی افسانہ، کوئی نظم، کوئی تخیلات کی چیز موصول نہیں ہوئی۔"

"ایڈیٹر نے فوراً بگڑ کر کہا۔ "تو بلا سے۔ کیا ہمارا دماغ بانجھ ہو گیا ہے۔" پہلے ایک نوٹ لکھو:۔ "اردو میں تخیلات کی بڑی کمی ہے۔ ٹیگور کی طرز پر لکھنے والے اور بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ ایک شخص شہرت کا خواہاں ہو۔ اور دوسرا کنج گمنامی میں ہی رہنا پسند کرے۔"

ابوالتحریر نے پُوچھا "عنوان کیا ہوگا؟"

ایڈیٹر نے آنکھیں بند کر کے گویا اپنے دماغ کے ان ذخائر کو ٹٹولتے ہُوئے جس میں تخیلات محفوظ ہیں۔ کہا۔

"کوئی عنوان لکھ دو۔ تخیلات کسی عنوان کے پابند نہیں ہو سکتے۔ اچھا لکھو۔

"وُہ"

"کیا یہی عنوان ہوگا؟"

ایڈیٹر نے کڑک کر کہا۔ "ہاں یہی یہی۔ میرے تخیّل کی روانی میں تم یوں دخل در معقولات نہ کرو۔ ہاں ذرا الفاظ کی بندش کا خیال رکھنا۔ اس قسم کے مضامین میں تراکیب کی ندرتِ الفاظ کی جدّت ہی فصاحت و بلاغت ہے۔"

ابوالتحریر چپ چاپ لکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"وُہ کھڑکی کھول کر ایک اہتزازِ شادمانی سے جھانکنے

لگی۔ پتے ہوا کی لرزشِ مستعار سے متکیف تھے۔ افق لعل پوش ایک نغمہ پران بنکر درختوں کی شاخوں پر مرتعش تھی"۔

ابوالتحریر نے ذرا گھبرا کر پوچھنے کی جرأت کی۔ "جناب ان فقروں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اور مطلب بھی کچھ خبط سا ہوا جاتا ہے"۔

ایڈیٹر نے ایک نگاہ خشمگین سے ابوالتحریر کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس احساس قلق سے جس سے کوئی شخص اپنے نئے تعمیر شدہ محل کو آن کی آن میں گرتے ہوئے دیکھکر فریاد کرتا ہے۔ کہا۔ "تم نے ان سب فقروں کو ایک ساتھ ہی لکھدیا اس سے زیادہ کیا بدمذاقی ہو سکتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ' بھائی ان کو الگ الگ لکھو۔ ہر فقرہ لکھ کر کچھ نقطے اور ایک بہت لمبی لکیر جو بعض اوقات تین تین چار بلکہ آٹھ آٹھ دس دس سطر لمبی میں پھیلتی چلی جائے کھینچ کر دوسرا فقرہ شروع کرو۔ یہ تخیل کی رعنائیاں ہیں تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں میں کیا لکھا رہا تھا؟

"ایک نغمہ پران بنکر درختوں کی شاخوں پر مرتعش تھی"۔

ایڈیٹر نے کچھ دل ہی دل میں مزا لیکر کہا۔ "ہاں مرتعش تھی۔ اب کھینچ ایک لمبی لکیر اور اس کے بعد لکھو"۔ وہ جھانکنے لگی.... اب ڈالو کوئی سو دو سو نقطے اور لکھو یعنی "وہ" "بہت جلی قلم سے"۔

"بس مضمون ختم ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ رسالہ بھی اب لکھو کیا چاہیئے۔"

"جی بتیس صفحے تو ہو گئے"۔

"چلو یہ کام بھی ہو گیا۔ اُفوہ ستر روپے ماہوار اور کھانے پر ایڈیٹر کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اب ذرا حقہ تازہ کر کے چلم بھر دو میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا"۔

محوی

فرقت میں جگر لہو لہو ہے — اب جینے کی کس کو آرزو ہے

ہر ذرہ میں جلوہ ریز تو ہے — یہ حاصلِ سعیِ جستجو ہے

آوارہ چمن چمن ہے بلبل — گل خوش کہ اسیر رنگ و بو ہے

کیفیتِ اشک خون نہ پوچھو — اب سینے میں دل نہیں لہو ہے

ہے چشمِ حقیقت آشنا شرط — ہر پھول میں ہر شجر میں تو ہے

دل بیچ کے درد مول لینا — یہ شیفتہ ادا کی خو ہے

فانی ہے بہارِ باغ دنیا — کیوں مست شرابِ عیش تو ہے

تم دل کو ابھی مٹا چکے ہو — پھر سینے میں کس کی جستجو ہے

محوی کو مٹا کے کر دیا خاک — یہ بھی کوئی دلبری کی خو ہے

۷۸۶

ہزار داستان

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

جلد ۱ | اشاعت دو ماہ اگست ۱۹۲۲ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

تصویر: شہید عشق کی تربت۔ جناب محمد عبدالرحمن چغتائی

(دکن آرٹ) پریس لاہور میں باہتمام لالہ ... چھپ کر ... سے شائع ہوا

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

مقام مسرت ہے کہ ہزار داستان آہستہ آہستہ ملک کے بہترین انشا پردازوں کی توجہ کرم کو اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ یہی حقیقت میں ہزار داستان کی سب سے بڑی قدر افزائی اور ہماری محنتوں کا سب سے بڑا انعام ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے مخصوص اندازِ تحریر کی عظمت کا سکہ آج ہندوستان کے دل پر ہے۔ ان کے رشحات قلم کو پیش کرتے وقت کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ تاہم یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ "محبت کی پسپائی" سٹائر یا ہجو ملیح کی ایک کامیاب مثال ہے۔ بہت سے حقائق فطرت اس دلکش پیرایہ میں ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اس فن کی طرف کسی صاحب کمال نے توجہ نہیں کی اور یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ یہ صنف ادب اردو ادب میں بالکل مفقود ہے۔ تصویر کے تاریک رخ کو تخیل کی رنگینیوں سے آراستہ کر کے ناظرین کے ذہن نشین کرنا۔ اور معمولی مناظر فطرت سے اہم نتائج عبرت اخذ کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ ہزار داستان کو ناز ہے۔ کہ تفریحی مضامین کے ضمن میں اس کو ایسے ایسے باکمال ماہران فن کی اعانت نصیب ہو رہی ہے۔

جناب "بلشیم" جو ہمیں خوف ہے۔ کہ اس پردہ زنگاری میں بھی مشاق نظر بازوں سے چھپنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اردو صحافت میں وہ پایہ حاصل کر چکے ہیں کہ جو تعریف و توصیف سے بے نیاز ہے۔ ہزار داستان کو اپنے طالع رسا پر ناز ہے کہ آج وہ ادب جیسے بے نظیر رسالے کے نامور ایڈیٹر کے نتائج فکر سے مزین ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ "انتقام" جناب بلشیم کے مسلسل عواطف کی صرف پہلی قسط ثابت ہو گا اور اب ان کی کاروباری مجبوریاں اردو ادب کو ان سعادتوں سے محروم نہ کریں گی۔ جن سے موصوف کی کوششیں ایک غیر فانی نسبت رکھتی ہیں۔

"شیر افضل" مغربی اور مشرقی تخیل اور اندازِ تحریر کا ایک ایسا مرکب لطیف ہے۔ کہ ہم جناب تاثر کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ عورت کے متعلق جن خیالات کا اظہار ابتدا سے افسانہ میں کیا گیا ہے۔ وہ محض قصے کی عجیب اہمیت کا تقاضا ہے۔ شاعر یا افسانہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کے رجحانات طبیعت اور ان حالات گرد و پیش میں جو ان رجحانات کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں۔ اس قدر مستغرق ہو کہ اس کا دماغ ہر ایک دوسرے نقطۂ خیال یا متضاد خاصیت کے ادراک سے خالی ہو جائے۔ شیر افضل اور اس کے مقصد حیات کی اہمیت اسی وقت قابل فہم ہو سکتی ہے۔ جب عورت کی فطرت کا وہی تاریک رخ پیش نظر رکھا جائے۔ جو عالم احساسات پر اتنی آفتیں برپا کر چکا ہے تاہم صنف نازک کا روشن رخ اس قدر نظارہ نواز ہے۔ کہ دنیا کی آنکھیں اس تاریک رخ کو بھول جانا ہی پسند کرتی ہیں ہاں اگر کوئی دل رسیدہ محبت کی اس ٹریجڈی کے احساس سے کراہ اٹھے تو اسے معذور سمجھنا چاہئے۔

"بہار و کوئل" جناب سید آصف علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے تخیل کا ایک حسین اظہار ہے۔ موصوف کی طبیعت کو ادب لطیف سے جو مناسبت ہے اس کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو ان کی صحبت میں چند لمحات لطیف گزارنے کا فخر حاصل ہے۔ افسوس ہے۔ کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں نے ادب کو ان کی خدمات سے محروم کر دیا۔ مگر ہمیں امید ہے کہ یہ وقفہ اس تعطل سے زیادہ دیرپا نہ ہو گا۔ جس نے ملٹن جیسے شاعر کو بھی اپنا ادبی دستور العمل بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نظم میں مغربی اندازِ اظہار زیادہ نمایاں ہے۔ اور یہ اس تبحر کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو موصوف کو ادب مغرب میں حاصل ہے۔ تاہم نکتہ شناس آنکھ اس اظہار کے پردے میں مشرقی ذکاوت احساس دیکھ سکتی ہیں۔ میں اپنے عزیز دوست سید رؤف علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا کا ممنون ہوں۔ کہ انہوں نے آصف کے جواہر طبع کے لئے ہزار داستان کے صفحات کو منتخب فرمایا۔

"تصویر شہید عشق کی تربت" جناب محمد عبدالرحمن صاحب چغتائی کے تخیل اور ان سحر نگار قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کی صناعی کے دو حسین نمونے ہزار داستان میں پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ یقیناً یہ ہندوستان کا ممتاز مصور اس دعوے کی زندہ دلیل ہے۔ کہ ایشیا کے شاعر تخیل کی پرواز کو الفاظ کی وساطت سے ظاہر کرنے میں مشتاق نہیں۔ بلکہ یہاں کے صناع بھی اپنے عجیب و غریب تخیل کو جیتی جاگتی تصویروں میں متحرک کر سکتے ہیں۔

جناب محوی صدیقی کے رشحات فکر ہزار داستان کی ہر اشاعت کو جنت نگاہ بنانے کے ضامن رہے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں اس خاص لطف و مروت کے لئے اپنا دلی شکریہ پیش کرتا ہوں۔

"عورت کی لاش" ایک ایسا افسانہ ہے۔ جو محض واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں شاید تخیل کی کم از کم آمیزش کو بھی روا نہیں رکھا گیا۔ ان مختصر افسانوں کی اشاعت سے میرا مقصد صرف یہی ہے۔ کہ ہمارے ملک کے کامیاب افسانہ نویس ان عجیب واقعات کو اپنے قصوں کی بنیاد بنا سکیں۔ تاکہ تفتیش جرائم کے مسئلہ پر جو مفید روشنی افسانہ نویسوں کا تخیل ڈال سکتا ہے۔ ملک اس سے محروم نہ رہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے واقعات ناظرین کے دل میں تجسس و تحقیق کا شوق پیدا کرتے اور ان طبائع کو جو فطرتاً دقیقہ رس ہیں ایک خاص طرز استنباط پر چلانے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس دفعہ کی گنجائش واقعات کی تفصیل اور غیر ضروری مگر دلچسپ حالات کے بیان کے راستے میں حائل ہو گئی۔ ایڈیٹر

کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اور پھر پوچھا۔ "ٹھیک! آپکی رائے ڈرسٹ ہائے۔ مگر یہ عورت کون ہو سکتا ہے"۔ انسپکٹر صاحب نے لاش کو ذرا غور سے دیکھتے ہوئے اپنے نتیجۂ فکر کو دُھرانے لگے۔ "بالوں میں سیندور ابتک موجود ہے۔ ہاتھ پاؤں پر سرمے کے بیل بوٹے بھی بنے ہیں۔ . . . . کانوں میں بڑے بڑے چھید ہیں۔ جو قطعی وزنی بالیوں کے بوجھ سے بڑھ گئے ہیں"۔ پھر گویا خیال ہی خیال میں کسی فیصلہ پر پہنچ کر کہا۔ "حضور قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ عورت قوم کی پوربیا ہو سکتی ہے"

صاحب نے سوچتے ہوئے دریافت کیا۔ "پوربیا کون؟" انسپکٹر صاحب نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ "حضور یہ ہی لوگ ہیں۔ جن میں سے اکثر دھوبیوں سائیسوں کا کام کرتے ہیں"۔ صاحب نے کچھ سمجھ کر کہا۔ "او ٹھیک ٹھیک ہم سمجھ گیا۔ پوربب کا رہنے والا۔ بیشک ہمارا ڈوبی کے ہاتھ پر ایسا نشان ہوتا ہے"۔ انسپکٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "جی ہاں اسی لئے تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں"۔ صاحب نے بکس کے تختہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر انسپکٹر صاحب یہ باکس ریل کے راستے آیا ہے۔ اس لیبل سے ضرور پتہ لگ جائیگا۔ اس کو حفاظت سے رکھو۔ ام آج خفیہ پولیس میں اطلاع کریں گے اس ضروری مقدمہ میں ان کی امداد سے بوٹ فائدہ ہوگا"۔ یہ کہکر صاحب سپرنٹنڈنٹ گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلدئے انسپکٹر صاحب بھی سب انسپکٹر عبدالکریم کو ضروری ہدایتیں دے کر تھانے کو واپس آگئے۔

لاش اور بکس کو تھانے پہنچادیا گیا۔ لاش کی تصویر لے لی گئی۔ اور بکس کو محفوظ کرلیا گیا۔ سب انسپکٹر عبدالکریم کو بعد میں خیال آیا۔ کہ لاش کی اُنگلیوں کے نشان لے لیں اور حلیہ کا لکھ لینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے یہ ضروری احتیاط بھی کرلی۔ اور لاش کو ڈاکٹری ملاحظہ کے لئے ہسپتال بھیجدیا۔

دوسرے دن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کی درخواست پر محکمہ تفتیش جرائم کی طرف سے انسپکٹر انعام اللہ اس واردات کی تحقیقات کے لئے متعین ہو گئے۔

انسپکٹر انعام اللہ بہت تجربہ کار افسر تھے۔ اُنھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے بہت سے مقدمات کو برآمد کیا تھا۔ اس عجیب وغریب واردات کی نوعیت کی وجہ سے افسرانِ محکمہ نے انہیں خاص طور پر تفتیش کے لئے مامور کیا۔

انسپکٹر انعام اللہ صاحب نے سب سے پہلے بکس کے لیبلوں کو دیکھنا شروع کیا۔ تمام الفاظ مٹے ہوئے تھے ظاہر تھا۔ کہ یہ لیبل تازہ نہیں۔ آتشی شیشہ کی مدد سے اُنہوں نے بدقت اسقدر دریافت کرلیا۔ کہ یہ بکس ماہ ستمبر ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں کسی جگہ سے ریل کے ذریعے کسی دوسرے مقام پر بھی گیا تھا۔ ان کے لئے اسقدر پتہ مل جانا کافی تھا۔ وہ بکس کو لے کر فوراً ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ اور پارسل کرنے والے بابوؤں کو جمع کرکے لیبل کے حروف کو

پہچاننے کی کوشش کی۔

ایک بابو نے کچھ اس فخریہ انداز سے تن کر کہا گویا اس نے ایک نئی دُنیا دریافت کر لی ہے۔ "اجی یہ تو صاف M.U.L لکھا ہے۔ جو ملتان کنٹونمنٹ کے لئے ریل والوں کی اصطلاح ہے۔" انسپکٹر انعام اللہ نے آتشی شیشے کی مدد سے ان حروف کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔

بابو کی اس تشریح نے ان کے دماغ کو ایک اور راستہ پر چلا دیا۔ اُنھوں نے گھر میں آکر خوردبین سے ان حروف کو جانچنا شروع کیا۔ کوئی گھنٹے بھر کی دردسری کے بعد ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ اور وہ بولے۔ "یہ حرف یقیناً M U L نہیں۔ بلکہ J. M.R ہیں" وہ فوراً گاڑی پر سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پر پہنچے معلوم ہوا۔ کہ J. M.R جہلم ریلوے اسٹیشن کے لئے ریلوائی اصطلاح ہے۔ اب کیا تھا۔ انسپکٹر صاحب خوش خوش واپس ہوئے۔ اور دوسرے ہی دن ۲۳ دسمبر کو بکس کو ساتھ لئے جہلم روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے۔ تو ریلوے کے بابوؤں نے انہیں ایک اور خرخشے میں ڈال دیا جبتک ریلوے ٹکٹ کا نمبر معلوم نہ ہو۔ پارسل کا پتہ چلانا مشکل تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ لیبل پر ۹ کا ہندسہ نظر آتا تھا۔ مگر اس کے بعد اور کچھ صاف صاف معلوم نہ ہوتا تھا۔ انسپکٹر انعام اللہ اس مشکل سے مایوس ہونے والے نہ تھے۔ فوراً اجازت حاصل کر کے اُنھوں نے ۱۹۱۷ء کے ریلوے ٹکٹوں کے بنڈلوں کی پڑتال شروع کر دی۔

وہ پڑتال میں مصروف ہی تھے۔ کہ ان کو خیال آیا کہ آخر اس لیبل کو کسی ریلوے کلرک ہی نے تو لکھا ہوگا۔ وہ بکس کو لے اسٹیشن پر جا پہنچے۔ اور اسٹیشن کے تمام عملے کو لیبل دکھا دکھا کر تحقیقات شروع کر دی۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اور جھتاب رائے پارسل کلرک نے اپنا خط پہچان لیا۔ رجسٹروں کی چھان بین کی گئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک بکس وزنی ۲۷ سیر مسمی بابو لال ایک تیسرے درجے کے مسافر نے ٹکٹ نمبر ۲۵۰۱۵ کے ساتھ پارسل کرایا تھا۔ یہ ٹکٹ جہلم سے جالندھر چھاؤنی تک کے لئے تھے۔ انسپکٹر انعام اللہ کو یقین ہو گیا۔ کہ ہو نہ ہو۔ بابو لال کا تعلق اس بکس اور اس لاش سے ضرور ہے۔ بابو لال پوربیوں میں سے بھی ایک عام نام۔ انسپکٹر صاحب نے یہ سوچ کر جہلم پولیس کی امداد سے بابو لال کی تلاش شروع کر دی۔ ساتھ ہی تمام کارروائی کے متعلق لاہور اطلاع کی چار پانچ روز کی تلاش کے بعد انسپکٹر صاحب لاہور کو واپس ہوئے۔ مگر لاہور جہلم اور جالندھر کے تھانوں کی پولیس بابو لال کی تلاش میں برابر سرگرم رہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو انار کلی کے تھانے میں اطلاع موصول ہوئی۔ کہ ایک شخص بابو لال نامی مزنگ میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مگر اس کی شناخت ثبوت جرم اور شہادت

متعلقہ جرم کے متعلق کارروائی باقی ہے۔

یہ سنتے ہی انسپکٹر انعام اللہ بابولال کے پاس پہنچے۔ بابولال نے لاکھ بچنا چاہا۔ مگر انسپکٹر انعام اللہ کا دماغ دور کی کوڑی نکال لانے میں مشاق تھا۔ انہوں نے باتوں باتوں میں دریافت کرلیا۔ کہ بابولال جالندھر کے ایک کارخانہ میں ملازم رہا ہے۔ کارخانہ کا پتہ چلا کر اور بابولال کو زیر حراست کر کے انسپکٹر صاحب جالندھر پہنچے۔ اب کیا تھا۔ دو دن میں ہی کل کیفیت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ بابولال ایک پوربی اپنی بیوی بھگوان دیوی کے ساتھ کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد بابولال کو اپنی بیوی کے چال چلن پر شک ہوا۔ اور اس نے اس کی شکایت دو چار ملنے والوں سے کی۔ بیوی کی ضد سے تنگ آکر اس کو اس کے وطن میرٹھ بھیجدیا۔ مگر وہ تھوڑے دنوں کے بعد خاوند کی مرضی کے خلاف واپس آگئی۔ اب بابولال جالندھر نہ ٹھیرنا چاہتا تھا بیوی کو لیکر لاہور چلا گیا۔ دوران تحقیقات میں ایک گواہ ایسا بھی مل گیا۔ جو بابولال کو اس کے مکان پر لاہور میں ملا تھا۔

انسپکٹر صاحب اس کو ساتھ لیکر لاہور آئے۔ اور اس مکان پر پہنچے۔ معلوم ہوا۔ کہ بابولال کوئی ڈیڑھ مہینہ یہاں رہا۔ اور پھر چلا گیا۔ مکان چھوڑتے وقت اس کی بیوی اس کے ہمراہ نہ تھی۔ ہاں اس کے ہمسایوں نے اسے ایک بھاری بکس ایک اور بوڑھے شخص کی مدد سے اٹھاتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔ انسپکٹر صاحب کب چوکنے والے تھے۔ تاڑ گئے اور مکان کی تلاشی شروع کردی۔ زمین کھودی۔ تو خون کے داغوں سے زنگ آلود ایک استرا اور چند کپڑے مل گئے اب بابولال انسپکٹر انعام اللہ کے ہاتھ سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی انہوں نے دو چار ایسے آڑے ترچھے سوال کئے۔ کہ بابولال کو اقبال جرم ہی کرتے بنی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ اور مجرم کیفر کردار کو پہنچا۔ اسی سال ضلع کی خاص رپورٹ میں اعلیٰ حکام کی طرف سے انسپکٹر انعام اللہ کی حسن کارگزاری کے متعلق یہ فقرہ درج کیا گیا۔ "اس نے اس مقدمے کی تفتیش میں یقیناً ایک خاص قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ ایسی قابلیت جو انگلستان کے خیالی سراغرساں شرلاک ہومز کا ہی خاصہ ہے۔"

کلام الملوک

نوابزادہ عزیزی خورشید علی سلمہ (خلف نواب سر ذوالفقار علی خاں بہادر بالقابہ) نے ہزار داستان کی زینت و فروغ اشاعت کے لئے اپنے محترم ماموں ہز ہائینس نواب صاحب بہادر آف لوہارو' دام اقبالہٗ کی ایک نظم حاصل کر کے ہمارے پاس بھیجی ہے۔ عزیزی موصوف کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کر کے ہم نہایت ناز و مسرت کے ساتھ وہ نظم ذیل میں درج کرتے ہیں۔
نظم نواب صاحب بہادر کے دوران قیام کسولی کا نتیجۂ فکر ہے۔ اور مناظر فطرت کے پیدا کردہ تاثرات وجدانی کے ساتھ حکیمانہ بصیرت و استعبار ظاہر کرتی ہے۔

ایڈیٹر

برسات کا رنگ جم رہا تھا — آئی تھیں چڑھی گھٹائیں کالی
بادل کی گرج بتا رہی تھی — جائیگی گھٹا نہیں یہ خالی
تھے سبزہ و قطرہ ہائے شبنم — تمثال زمرّد و لآلی
سبزے کا وفور تھا زمین پر — گستردہ تھا یہ کہ سبز قالی
فرحت کا ہوا کی کیا بیاں ہو — مُردوں میں تھی جس نے جان ڈالی
موسم کی بہار دیکھنے کو — مَیں نے چھڑی ہاتھ میں سنبھالی
جانکلا چمن کی پٹڑیوں پر — ہر سو جو نظر بہ غور ڈالی
عبرت نے دکھایا کیا نظارہ — پھولوں سے لدی تھی ایک ڈالی
اِک بُلبل زار اس پہ بیٹھا — کرتا تھا گلوں سے خوش مقالی
تھا نغمہ کے ساتھ اس کے نوحہ — تھی وصل میں بات یہ نرالی
تھا کچھ نہ وصال یار سے خوش — ہر چند مخل نہ واں تھا مالی
حیرت سے یہ مَیں نے اس سے پوچھا — ہے وصل میں کیوں یہ خستہ حالی
بولا کہ یہ مانا مَیں نے اعظم — حسرت میرے دل نے کچھ نکالی
دو دن کی بہار ہے یہ گل کی — کل فصل خزاں ہے آنے والی
شیون میرا اس خیال سے ہے — گلشن سے جُدائی پاس آلی
جو اہل نظر ہیں وہ سبق لیں — دُنیا کی بہار ہے خیالی

لاشے ہے سب اُس کی دلفریبی
سمجھے جو رسکے دماغ عالی

خونِ دل

(۱)

شام ہو چلی تھی، ندی کے کنارے دو آدمی بیٹھے باہم بات کر رہے تھے۔ لحظہ بلحظہ روشنی کم ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے جھنڈ اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس جا رہے تھے۔ رجب نے کہا "آخر تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ اس قدر روپیہ ہے اُسے کیا کرو گے؟"

امیر علی نے ہنس کر جواب دیا "روپیہ کا مصرف صرف شادی نہیں ہے"

رجب اپنی جگہ سے قدرے آگے کھسک کر بولا مجھے تعجب تو اس امر کا ہے۔ کہ تم صنفِ نازک کی اسقدر عزّت کرتے ہو۔ گویا دُنیا میں عزّت کے لئے خُدا نے صرف عورتوں ہی کو پیدا کیا ہے لیکن اس کے باوجود تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہو میں سوچتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا کہ اس میں کیا راز مضمر ہے؟

"عورتوں کی عزّت اور صرف عزّت کرنا چاہیئے کیونکہ عورت پاکیزگی کا دوسرا نام ہے۔ جو عورت کی عزّت نہیں کرتا وہ اپنی شیطنت کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ خیال میرے دل پر نقش ہو گیا ہے۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت کوئی ہستی اسے محو نہیں کر سکتی"

"مگر پھر تُم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ بدرالدین کی لڑکی کے ساتھ ہمارا خیال تھا۔ تُم شادی کرنا منظور کر لو گے۔ مگر ہمیں یہ معلوم کر کے کس قدر حیرت ہوئی۔ کہ تُم نے اُس سے بھی انکار کر دیا۔ امیر علی! اس کا باعث گاؤں بھر میں کوئی نہیں جانتا"

امیر علی نے آہ سرد بھری اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں اس طرح دیکھتے ہوئے گویا وہ اُس میں کھویا جا چکا ہے جواب دیا "رجب! ایماندار آدمی ایک ہی دفعہ محبّت کر سکتا ہے۔ اور ایک ہی عورت کو نگہ اُلفت سے دیکھ سکتا ہے۔ باقی سب نفس پرستی ہے"

رجب نے قدرے حیرت سے سوال کیا "تو کیا تُم بھی کسی سے محبّت کر چکے ہو۔ کیا تُم بھی ناکامِ عشق ہو۔ امیر علی! ہمیں یہ شبہ تک نہیں تھا۔ کہ تُم بھی محبّت آشنا دل کے مالک ہو"

"ہاں میں محبّت کر چکا ہوں۔ اور اس آبِ حیات سے اپنا حصّہ لے چکا ہوں یہی وجہ ہے۔ کہ میری آنکھیں اب کسی دوشیزہ کے چہرے کی طرف نہیں اُٹھتیں۔ . . . میں

لسے گناہ سمجھتا ہوں۔"

رجب چونک پڑا۔ جیسے کوئی غیر متوقعہ بات سن لی ہو۔ اور چند لمحے ساکت رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "اگر ہرج نہ ہو۔ تو اپنی محبت کی داستان مجھ سے بیان کرو۔"

امیر علی ندی کے پانی کی کناروں سے ٹکراتی ہوئی لہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ "تم میرے دوست ہو۔ تم سے کیا راز ہے۔ سنو"

(۲)

تاریکی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو چلی تھی امیر علی نے آہ سرد بھری اور اپنی رام کہانی شروع کی۔ رجب ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔

"رجب! یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے۔ جب جنگ افغانستان چھڑی ہوئی تھی۔ اور سارے ہندوستان میں ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ اُس وقت سے پہلے میں محبت کے نام ہی سے آشنا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ اور اس سے آدمی کی حالت میں کیا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی طرح کی شام تھی۔ میں ایک آبشار کے پاس بیٹھا ہوا قدرت کے نظارے دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت میرا دل بھی ایک سرور تھا۔ جس میں شادمانی کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو میں مبہوت سا ہو گیا۔ قدرت کی خوبصورتی ایک مجسم شکل میں سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھولا پن تھا۔ آنکھوں میں شوخی و حجاب کا عجیب و غریب مجموعہ تھا۔ لبوں پر حیرت تھی۔ میں نے اُسے دیکھا۔ گویا سب کچھ دیکھ لیا۔ اُس وقت خیال آیا۔ زندگی کے پہلے دن ضائع گئے۔ وہ کیسی دلکش تھی؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ مجھے اُس دن پہلی دفعہ محسوس ہوا۔ کہ حسن جادو ہے۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ میرے سامنے صرف ایک چیز تھی۔ وہ عورت اور سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ آبشار جنگل۔ شام۔ میں جنگ کا خیال، فتح کی فکر سب اُس شام کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ صرف ایک روشن ستارہ تھا۔ جو میرے پاس، بہت قریب چمک رہا تھا۔ یہ چمک اُس کے لبوں کی مسکراہٹ تھی۔ یکایک اُس نے مجھے دیکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے پاس زمین پر پڑی ہوئی بندوق کو دیکھا۔ اُس پر صورتِ حال روشن ہو گئی۔ وہ بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف مڑی۔ چاروں طرف تاریکی ہو گئی۔ میں نے اُسے بلایا۔ اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔

"تم کون ہو؟"

حسینہ نے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ایک افغان عورت ہوں۔"

میں۔ تمہارا نام کیا ہے؟

اُس نے آہستہ سے کہا۔ مریم۔

میں۔تم کہاں رہتی ہو؟
مریم۔اس آبشار سے کچھ فاصلے پر ہماری جھونپڑی ہے۔
میں وہیں رہتی ہوں۔
میں۔وہاں تمہارے ساتھ کوئی اور بھی رہتا ہے؟
مریم۔میری بوڑھی دادی رہتی ہے۔
میں۔تمہارا کوئی اور رشتہ دار بھی ہے۔
مریم۔صرف ایک بھائی ثاقب ہے۔وہ فوج میں نوکر ہے

یہ گفتگو بظاہر معمولی بات چیت تھی۔لیکن ہماری باہمی محبت کی تمہید ہوگئی۔اُس کے بعد ہر روز شام کے وقت میں آبشار کے پاس جاکر بیٹھنے لگا۔اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی طاقت مجھے اس طرف کھینچ رہی ہے۔یہ حسن کی کشش تھی۔شام کے چند گھنٹے میری زندگی کے روشن ترین لمحے ہوجاتے۔مجھے جنگ سے نفرت سی ہوگئی۔خیال آتا تھا۔وہ آبشار کیسا اچھا ہے؟ چاروں طرف چڑیاں پھدکتی پھرتی تھیں۔درخت جھومتے ہیں پانی نغمہ الاپتا ہے۔اُس دلفریب مقام پر مریم روزانہ آتی تھی۔اُسے دیکھ کر میری روح شگفتہ ہوجاتی تھی۔ہم کئی کئی گھنٹے تک حسن وعشق کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے۔جس میں ہار کر بھی جیت کی سی لذت محسوس ہوتی تھی۔کبھی کبھی جی چاہتا تھا۔کہ جنگ کا کام چھوڑ کر مریم کے ساتھ کسی تنہا مقام میں جا رہوں۔لیکن ... منظور نہ کیا۔اُس نے کہا جب تک میری دادی زندہ ہے۔تب تک میرا گھر سے نکلنا ناممکن ہے۔میری اُمنگوں پر پانی سا پھر گیا۔

(۳)

کئی دن گزر گئے۔میں آبشار پر نہ جا سکا۔میری روح جسم میں اس طرح تڑپتی تھی۔جس طرح پرندۂ اسیر قفس میں۔سوچتا تھا۔مریم کیا کہتی ہوگی۔اُس کے ہاتھ کے انگور کھانے کی خواہش مجھے بیتاب ومضطرب کر دیتی تھی۔مگر چارۂ کار نہ تھا۔جنگی ذمہ واریوں نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت میرے سامنے ایک نوجوان افغان پیش کیا گیا۔جس پر جاسوس ہونے کا الزام لگایا تھا۔یہ لڑکا نہایت خوبصورت تھا۔میرا دل دھڑکنے لگا۔اُس کی شکل وصورت مریم سے مشابہ تھی وہی رنگ وہی آنکھیں۔جب وہ میری طرف دیکھتا تھا۔تو میرے دل کی وہی حالت ہوتی تھی۔جو چاندنی رات میں سمندر کی ہوتی ہے۔میں نے فوراً سمجھ لیا۔کہ یہ ثاقب ہے۔مریم نے مجھ سے بارہا اُس کا ذکر کیا تھا۔مگر ... ہوا۔میں نے محبت کے عذر کو ٹال دیا۔لہذا اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔سپاہی اسے میرے خیمے سے باہر لے گئے۔

رجب اب میرا دل بیقرار و بیتاب ہوگیا۔ مَیں آبشار پر جانے کے لئے تڑپنے لگا۔ نہیں معلوم مریم کا کیا حال ہے؟ مگر کیا اب وہ اپنے بھائی کے قاتل سے محبت کریگی؟ کیا ثاقب اب بھی کسی ذریعہ سے بچایا جا سکتا ہے۔ مَیں نے بہت سوچا لیکن سب راستے بند تھے۔ اب اُس کے لئے صرف موت کا دروازہ کھلا تھا۔ میری پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوتے۔ اتنے میں ایک سپاہی نے آکر کہا۔ وہ قیدی لڑکا آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔

مَیں نے کہا۔ لے آؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مخبر تنہا میرے سامنے تھا۔

مَیں نے پوچھا۔ "کہو کیا کہتے ہو؟"

مخبر۔ آپ مریم کو جانتے ہیں؟

مَیں۔ کیوں؟

مخبر۔ مَیں اُس کا بھائی ثاقب ہوں۔

مَیں۔ پھر؟

مخبر۔ اُس نے آپ کے نام مجھے ایک چٹھی دی ہے۔ وہ میرے کمربند میں ہے۔ جب مَیں قتل ہو جاؤں۔ تو آپ اسے دیکھ لیجئے گا۔

مَیں آبدیدہ ہوگیا۔ قوانینِ فوجی نے مجھے کس قدر سنگدل کر رکھا تھا۔ ثاقب باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بندوقوں کی آواز آئی۔ میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اس وقت مریم کا چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔ فرض پر لعنت ہو۔ یہ مَیں نے کیا کر دیا۔

اتنے میں بادل گرجنے لگے۔ بجلی کڑکنے لگی۔ میں بیتابی سے خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ سپاہی نے مقتول کے کمربند سے چٹھی لاکر میرے ہاتھ میں رکھدی۔ مَیں نے اُس کو پڑھا۔

(۴)

پیارے امیر علی!

اس وقت شرم نہیں روک سکتی۔ خدا گواہ ہے میرے دل میں تمہارے لئے وہی توقیر ہے۔ جو ایک عورت کے دل میں اپنے شوہر کے لئے ہو سکتی ہے......

مَیں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا بھائی ثاقب افغانی لشکر میں ہے۔ میرا چہرہ شرم سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ جب مَیں یہ لکھتی ہوں کہ اُس نے فرض، انسانیت، بہادری اور اپنے مُلک سے غداری کی اور فوج سے بھاگ آیا۔ اُسے جان بہت پیاری ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جو ذلت ایک عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ وُہ اُس کے لئے بھی تیار ہے۔ بزدل، کمینہ، ذلیل، ہمارا خاندان بدنام ہو جائیگا۔ خدا گواہ ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد میں ایسا کوئی نہیں ہُوا۔ ہمارے بزرگوں نے اپنے امیر کے لئے میدانِ جنگ میں ہنستے ہنستے جان دی ہے مگر ثاقب دادی کو لیکر بھاگ گیا ہے مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکیگا۔

اس لئے اس کے لباس میں مخبری کی غرض سے تمہاری فوج میں آئی اور گرفتار کر لی گئی۔ اس کے بعد . . . . .

اب رُخصت ہوتی ہوں۔ پیارے امیر علی! مَیں مر رہی ہوں۔ تاکہ میرے بھائی کو، میرے خاندان کو اور ملک کو لوگ نگاہِ حقارت سے نہ دیکھ سکیں۔ افغان عورت یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

مگر ایک افسوس ہے۔ تمہاری محبّت بھری نگاہیں اس وقت بھی مجھے یاد آ رہی ہیں۔ کاش میرے منہ میں عورت کی زبان نہ ہوتی۔ تو مَیں تمہیں بتا سکتی۔ کہ میرا دل تُمہیں کیسی وارفتگی سے پیار کرتا ہے۔ خدا نے مجھے عورت کا دل دیکر مرد کی زبان کیوں نہ دی۔ مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چُکا ہے۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ . . . . . .

تم رنج نہ کرنا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ اُس کی رضا میں دست اندازی کون کر سکتا ہے۔

پھر ملینگے۔ اگر خُدا ہے۔ اُس کے قوانین ہیں، بہشت ہے، نیکیوں کا اجر ہے۔ تو پھر ملینگے۔ اور اس طرح ملینگے۔ کہ کوئی طاقت ہمیں جدا نہ کر سکیگی۔ ——— اب رخصت . . .

فقط تمہاری

مریم

یہ خط پڑھکر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مریم کا قاتل مَیں تھا۔ اُسے مَیں نے سزائے موت دی تھی۔ کیا اب دوبارہ محبّت کرنا مجھے زیب دیتا ہے۔ رجب؟ رجب کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُس نے صرف ایک دفعہ امیر علی کی طرف دیکھا۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر سر نیچے جھکا لیا۔ اس وقت چاروں طرف تاریکی چھا گئی تھی۔

سوریندر موہن مکرجی (ترجمہ) اندرناتھ

حامد

میری بربادی کا آخر کس کے سر الزام ہے
کیا نگاہِ یار یہ بھی گردشِ ایام ہے

بعد یک عمرِ اسیری کُھل گیا دُنیا کا راز
دام وقفِ صید ہے اور صید صرفِ دام ہے

دور باش اے عقل ہاں ہشیار باش اے بیخودی
بزمِ حسن خود نما میں آج اذنِ عام ہے

ہم تو کچھ ہو ہی گئے بے اختیارِ شوقِ دل
ورنہ امید وفا تم سے خیالِ خام ہے

شوق سے حامد مجھے وہ بیخودی منظور ہے
جو کسی کے دیکھنے کا لازمی انجام ہے

شیر افضل

عورت! ناتواں عورت! میں خدا جانے کیا جادو ہے۔ کہ مرد کو غلام بنا لیتی ہے۔ مرد کی آنکھوں پر خیالی جذبات کی پٹی کچھ اس طرح بندھی ہوئی ہے۔ کہ وہ اس پست قامت غیر متناسب لاغر نسل کو جنس لطیف کہتا ہے۔ علم و ہنر سے بے بہرہ، فنونِ لطیفہ سے ناآشنا جھوٹ کا مجسمہ، فتنہ و فساد کی بُنیاد، عورت نے ہماری جبلّت پر ایسا قابو پا لیا ہے۔ کہ ہم اپنی ذلت کو محسوس نہیں کرتے۔ ہم اس کی دغا بازی کا روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس کی احسان فراموشی کا ہمیشہ تلخ تجربہ اُٹھاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔

زہرہ، میری پیاری زہرہ برسوں کی محبت کے بعد مجھ کو دغا دے گئی۔ سطحی رسموں کے پابند کچھ کہیں مگر وہ میری بیوی تھی۔ ہماری شادی دلی پیمانِ وفا سے ہوئی تھی۔ اور جب مَیں نے اُس کے خفیہ خطوط اُڑا لئے جو عورت کی مکاری کا مرقع ہیں۔ اس نے اپنا سر میرے قدموں پر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ اُٹھا۔ کہ اس ناپاک ہستی کا خاتمہ کر دے۔ مگر مجھ پر میری بزدلی، وہ بزدلی جسے آدمی 'رحم' کہتے ہیں، غالب آ گئی۔

اُس دن سے مَیں دُنیا کی سیاحت کر رہا ہوں ہزاروں انسان دیکھے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی ایسا بہادر نہیں ملا جو عورت کی غلامی سے آزاد ہو۔ مشہور فاتح۔ شیروں سے تن تنہا مقابلہ کرنے والے جوان اس میدان کے مرد نہ نکلے۔ ہاں شیر افضل ایک ایسی ہستی ہے۔ جو مرد کہلانے کا مستحق ہے۔

صحرائے سندھ کے شمال مغربی کنارے پر ایک سرسبز گاؤں درگئی ہے۔ مَیں وہاں ایک سرائے میں ٹھیرا ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ رقاصۂ فلک کے نیلگوں دوپٹہ پر سلمے کی صناعی نمایاں تھی۔ ریت کا سمندر ستاروں کی دُھندلی روشنی میں لہریں مار رہا تھا۔ دور افق میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اونٹ کے کوہان کی طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ سامنے باغ میں گویا ستاروں کی بارش ہو رہی تھی روشنی کے قطرے گر کر اچھل رہے تھے۔ خوشبو سے لدی ہوئی ہوا میں جگنو ناچ رہے تھے۔ جیسے اندر کے اکھاڑے میں رقص آتش ہوتا ہو۔

ساربان تھکے ہوئے اونٹوں کے پاس بیٹھے تھے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حُسن و عشق ان کھلی ہوا میں بسنے والوں میں بہت ہے۔ عورت کی فطرت پر بحث شروع ہو گئی۔ سب

اپنے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے۔ مگر شیر افضل خاموش تھا۔ دو تین بار لب ہلا کے رہ گیا۔ پھر وہ زور سے کھانسا۔ سب چپ ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ کسی غیر معمولی بات کا اظہار ہوگا۔ شیر افضل نے اپنی کہانی شروع کر دی:۔

میرا ایک دوست قتل کے جرم میں گرفتار تھا۔ بالکل بے گناہ بدقسمتی کا شکار۔ تم جانتے ہو عدالت کی پیچ در پیچ کارروائی میں جھوٹ کا فروغ کیا سہل ہے۔

ایک دن وہ جیل سے بھاگ نکلا۔ دو تین دن تین راتیں وہ میں آزاد پھرتا رہا۔ آخر پہاڑوں کی تنہائی چھوڑ کر اسی طرح زنجیروں سے جکڑا ہوا ریتی کی تلاش میں ایک گاؤں میں جا نکلا۔ اسے نے! غریب زنجیروں کے کاٹنے کی امید میں آیا تھا۔ مگر ایک عورت کی ہوس نے رشتہ عمر منقطع کر دیا۔

وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جن کی دُنیا عورت ہے۔ جن کے لئے لطف حیات عورت کی ذات سے وابستہ ہے۔ جن کے نزدیک سُورج کا اگر کوئی فائدہ ہے۔ تو یہی کہ اس سے عورت کی خوبصورتی چمکتی ہے۔ ہوا سانس لینے کے قابل ہے۔ تو اس لئے کہ اس سے عورت کے نرم جسم کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس کے ریشمی بال بکھرتے ہیں۔ چاند خوشنما ہے ہے تو اس لئے کہ اُن کے دل میں محبت کے ولولے پیدا کرتا ہے۔ وہ عورت کو ایک معصوم ہستی سمجھتا تھا جس کی محبت کے قابل کوئی آدمی نہیں۔ اب ایک عورت کے ہاتھوں ہی اس کا خون ہوا۔

اُس خوبصورت لڑکی نے نوجوان کو ہر طرح کی اُمید دلائی۔ آنکھوں نے لفظوں سے بڑھکر مدد کا وعدہ کیا۔ پیارے پیارے ہاتھوں نے اسے جھوٹے اطمینان [illegible] پر سُلا دیا۔ صبح ہوتے ہی سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ [illegible] غاباز عورت کی گردن کی طلائی زنجیر میں، میرے دوست [illegible] قیمت چمکنے لگی۔

مَیں اس کو قتل کر ڈالتا۔ مگر انتقام زیادہ سخت سزا کا مستحق تھا۔

مَیں رباب بجاتا ہوا ان پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں جا پہنچا۔

وہ واقعی خوبصورت تھی۔ بہار کے آغاز میں جب ثمردار درختوں میں پھول اُگتے ہیں۔ اس حسین لڑکی کے دروازے سے بار بار گزرنا ناخوشگوار نہ تھا۔

مَیں نے اُس کے دل پر قابو پا لیا۔ میٹھی میٹھی باتوں سے اُسے پھسلا لیا۔

درختوں پر شگوفے نکل آئے تھے۔ اور اس کی محبت کو خاوند کی واپسی کا خوف تھا۔ وہ مجھ سے منت کرنے لگی "آؤ بھاگ چلیں"۔ ۔ ۔ ۔ مگر مجھے تو انتقام لینا تھا۔

مَیں بھی جوان تھا۔ میں بھی اُسے محبت کر سکتا تھا۔ شفق

کی سرخی میں جب اس کی سرمگیں آنکھیں چمکتی تھیں میرے دل میں بھی اُمنگیں اُٹھتی تھیں۔ مَیں بھی جی رکھتا ہوں۔ مگر جونہی وہ گردن پھیرتی تھی۔ اس کی طلائی زنجیروں چمک اُٹھتی تھیں۔ اور مجھے یاد آجاتا تھا۔ مَیں آتشِ انتقام جس کے شعلے میری آنکھوں سے ٹپکتے تھے۔ چھپانے کے لئے مُنہ پھیر لیتا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف تھا۔ کہ کہیں محبّت میرے دل سے انتقام کو نکال نہ دے۔

آخر خوشبودار درختوں کی گھنی چھاؤں میں ایک دن جب اس کی آنکھیں محبت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میری آنکھیں میرے مقتول دوست کی آنکھوں سے ملیں۔ اس لڑکی کی آنکھوں سے نہیں۔ ہرگز نہیں۔

مَیں تین مہینے وہیں ٹھیرا رہا۔ وہ مجھے بھاگنے پر اکساتی تھی۔ مگر مَیں وہیں ٹھیرا رہا۔ اس کا حسن زرد پڑ گیا۔ اب وہ میرے پاس آتی ہوئی ڈرتی تھی۔

ایک سہانی رات کو مَیں چپکے سے چلدیا۔ پہاڑیاں میری نظر سے غائب ہوگئیں۔ اور مَیں پھر صحرا میں آگیا۔

اس کے خاوند نے جلد ہی کام تمام کر دیا۔ کچھ دن کے بعد جو مَیں وہاں سے گزرا، تو اُس کی ننگی لاش زخموں سے چور لٹک رہی تھی۔

میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ دوستی بہت پیاری ہے محبّت اس سے بھی پیاری ہے۔ مگر انتقام کی لذّت کچھ اور ہی ہے۔ اس میں ایک خاص مزا ہے۔ جو انتقام لینے والا ہی جانتا ہے۔

جب شیر افضل نے یہ کہانی ختم کی میرا دل دھڑک رہا تھا میری آنکھوں میں ایک نئی تمنا چمک رہی تھی۔ مجھے زندگی کا ایک مقصد نظر آنے لگا۔ انتقام، عورت سے اس کی دغا بازی کا انتقام لینا میرا فرض ہو گیا۔ آج میں اسی کام کے لئے زندہ ہوں۔

تاثیر

محوی

کیا کہیں بیخودیِ شوق میں کیا کیا دیکھا — کچھ نہیں دل کو فقط محوِ تمنّا دیکھا
چشمِ خود بیں سے جو دُنیا کا تماشا دیکھا — ذرّہ ذرہ سے نمایاں ترا جلوہ دیکھا
قیس وارفتہ ہوا دیکھ کے محمل میں تجھے — اہلِ ظاہر نے یہ جانا رُخِ لیلےٰ دیکھا
آج تھا لطف کسے ہے ذوقِ نظارہ دل کو — کل اگر حشر میں دیکھا تو تجھے کیا دیکھا
کر دیا چاک محبّت میں لباسِ ہستی — جذبۂ شوق کا دل نے جو تقاضا دیکھا
مٹ گئے خود جو بڑھا ذوقِ تلاشِ جاناں — ہم نے محوی یہی اُلفت کا نتیجا دیکھا

انتقام

(۱)

لاہور کے مٹھی بھر بنگالیوں میں دواکر بابو کا بہت چرچا رہتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُن کی شخصیت کچھ معمولی نہیں ہے۔ تموّل کے لحاظ سے دواکر بابو صرف بنگالیوں ہی میں نہیں۔ بلکہ بہت سے پنجابیوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر بالعموم اُن کی دولت کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی جن باتوں پر خاص طور سے رائے زنی ہوا کرتی تھی۔ وہ خصوصیت کے ساتھ ان کی طبقۂ اناث سے بدظنی، انگریزوں سے منافرت، اور اپنے ابتدائی حالات کو پردۂ خفا میں رکھنے کا رجحان تھیں۔ دواکر بابو بہت ملنسار اور ہردلعزیز تھے خیرات بھی اس درجہ کرتے تھے کہ مشکل سے کوئی اُن کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ جس بے رُخی سے وہ بات چیت کرتے تھے، یا کسی عورت کا نام آجانے پر اُن کے چہرے سے جس غصّہ و نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس کو دیکھ کر لوگ طرح طرح کی خوش گپیاں کرتے تھے۔ جب کوئی شخص اس کے متعلق کچھ استفسار کرتا تھا۔ تو جواب میں یہ خاموشی اختیار کرتے تھے۔ مگر جو بتا رہا تھا کہ اس وقت دواکر بابو کسی واقعہ کو بھول جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لاہور کے بنگالیوں میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو گا جس نے دواکر بابو کے متعلق کوئی تھیوری (نظریہ) وضع نہ کی ہو۔ اور ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی تھی۔ کہ دوسرے لوگ بھی اُس کی تھیوری کو مان لیں۔ ان تھیوریوں میں آسوتوش کی تھیوری بہت مختصر ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی تھی۔ آسوتوش کا یہ کہنا تھا۔ کہ دواکر بابو کنوارے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بیوی کسی انگریز کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر گھر سے نکل گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کو انگریزوں اور عورتوں سے بیحد نفرت ہے۔

اگرچہ اس واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ مگر آسوتوش کو پورا پورا یقین تھا۔ کہ اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو ہی نہیں سکتی دواکر بابو کے عاشق مزاج ہونے میں کسی کو کلام نہ تھا۔ جب کوئی اس قسم کی بات نکل آتی تھی تو وہ سرد آہیں بھرا کرتے تھے۔ جو زیادہ تر اُن کی "ناکامی" بہرحال تھیں جن لوگوں کو اُن سے ربط ضبط رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ دواکر بابو بازارِ حسن کے پختہ کار جوہری ہیں۔ پہاگ کی راگ وہ جس خوبی سے الاپتے ہیں۔ اُس سے اُن کی عاشق مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں گھر کی آرائش و زیبائش، طرزِ گفتگو اور بھگت وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے جانا جا سکتا ہے کہ دواکر بابو

اپنے عالمِ جوانی میں کسی کی محبت کا زخم کھا چکے ہیں۔

(۲)

انگریزی میں ایک مثل ہے۔ کہ بادشاہ کبھی نہیں مرتا۔ مگر ہمارا خیال ہے۔ کہ محبت کبھی نہیں مرتی! اگر کسی کو دواکر بابو کے صحیح حالات معلوم ہوتے۔ تو اُس کو معلوم ہو جاتا کہ دواکر بابو کا دل لڑکپن، یا جوانی میں کبھی خالی نہیں رہا ہے۔ بنکم بابو کے ناول پڑھنے سے بہت پہلے وہ ایک طرح میدانِ محبت میں قدم مار چکے تھے۔ سب سے پہلے اُن کی محبت لکڑی کے گھوڑے سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر چار سال کی تھی۔ ان کے والد نے وہ لکڑی کا گھوڑا انہیں کلکتہ سے لا دیا تھا دواکر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ علی الصبح اُٹھکر اور باغ سے گھاس لاکر اُس گھوڑے کے سامنے رکھی جاتی تھی پھر والدہ سے مٹھائی مانگ کر اُسے دیتا تھا۔ دن بھر گھوڑے کے ساتھ کھیل کر رات کو سوتے وقت اس کو اپنی چارپائی سے باندھتا تھا۔ چھ دن اسی طرح گزر گئے۔ ساتویں دن ایک لڑکے نے اُس سے دریافت کیا "دیوا تیرا گھوڑا تیز جاتا ہے" دواکر نے غرور کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں" بعد ازاں اسی لڑکے کی صلاح سے گھوڑا تالاب میں چھوڑا گیا۔ مگر جب وہ تیر کر واپس نہ آیا۔ تو اُس نے ٹھنڈی سانس بھری، اور اس کے بعد ایک بلی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ بلی کے بعد کتنی [illegible] سے اُس کو محبت ہوئی۔ اور آخر میں اسکول کے ایک لڑکے سے گاڑھی محبت ہو گئی۔ اُسی وقت سے اُس کا دل محبت کی گرمی سے پسیجنے لگا۔ اُسی وقت سے وہ جان گیا۔ کہ جب تک کسی دوسرے دل سے دل نہ ملے۔ اُس وقت تک اُس کا دل نامکمل ہے۔ جبتک دو دل ایک ہی تارِ محبت میں نہ پروئے جائیں۔ اُس وقت تک ہمت میں بلندی، ارادوں میں استقلال، پیدا نہیں ہوتا۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد دواکر کو دوست کی جدائی کا ایسا غم ہوا کہ پاس ہو جانے کی خوشی بھی باعثِ تکلیف بن گئی۔ بالآخر غم غلط کرنے کے لئے کسی ہم مکتب کے مشورہ سے اُس نے ایک ستار خریدا اور رفتہ رفتہ اُس کی دھن میں ایسا مست ہو گیا۔ کہ اُس کے حلقۂ احباب میں اُس پر "فنا فی الستار" کی پھبتیاں اُڑنے لگیں!

(۳)

جوانی سے دوچار ہونے پر کتنی لڑکیوں کی تعریفیں سُنکر دواکر نے اپنے دل کے مندر میں اُن کی پرستش کی؟ یہ بتانا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ آخرکار جب بی۔ اے کا امتحان دیکر وہ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مادھو پور گیا۔ تو اُس کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا۔

یہ واقعہ آج سے چوتھائی صدی پیشتر کا ہے۔ اُس وقت مادھو پور میں موجودہ محل نما مکانات مفقود تھے۔ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے بنگلے تھے۔

دواکر جس بنگلہ میں آکر رہا تھا۔ اُس کے پاس والے بنگلہ میں مسٹر مور نامی ایک انگریز کی رہائش تھی۔ مادھوپور کے قرب وجوار میں مور صاحب کی متعدد کوئلہ کی کانیں تھیں۔ مور صاحب کی عمر ڈھل چکی تھی۔ اس لئے وہ کام کی نگرانی خود نہ کرتے تھے۔ بلکہ مادھوپور میں رہ کر ہی جو انتظامات ممکن تھے انجام دیتے تھے۔

بنگلہ کے برآمدہ میں بیٹھے بیٹھے یا ہوا خوری کو آتے جاتے جب اوّل ہی اوّل دواکر بابو نے جوان مسز مور کو دیکھا تو اس کو مور صاحب کی لڑکی سمجھا تھا۔ اور جوان لڑکی کے ساتھ محبت کرنے میں کچھ بُرائی نہیں ہے۔ یہ وہ خیال تھا جس نے دواکر کے دل کو بے چین کر دیا تھا۔ آخر جب اُس کا دل مسز مور کی نذر محبت ہو چکا تو اب دواکر کے لئے اس کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ کہ رات کے خاموش گھنٹوں میں بیٹھکر بہاگ راگنی الاپے اور جب موقعہ مل جائے۔ تو دور ہی سے اُس کو دیکھکر اپنے دل کی لگی بجھا لیا کرے۔ حالانکہ یہ وُہ لگی نہ تھی۔ جو اس آسانی سے بجھ جاتی!

یہ کہنا نادرست نہ ہوگا۔ کہ مور صاحب کی جوان بیوی سے محبت کر کے دواکر نے اپنی حماقت کا اچھا خاصہ ثبوت دیا تھا جس شے کے حاصل ہونے کی کوئی امید نہ ہو اُس کے لئے تنگ وہ دو کرنا یا ایک ایسی آگ میں پھاند پڑنا جو جلانے کے سوا دوسرا کام جانتی ہی نہیں، اگر یہ جنون نہیں تو اور کیا ہے! لیکن ہمیں جس سے محبت ہو۔ اگر وہ ہماری طرف محبت کی نظریں ڈالے۔ جو ہمیں برآمدہ میں بیٹھا دیکھ کر خود بھی کتاب پڑھنے کے بہانہ سے ہمارے مقابل کے برآمدہ میں آ بیٹھے اور دوران مطالعہ میں حسرت بھری نگاہ سے کبھی کبھی ہمیں بھی دیکھ لیا کرے۔ جب ہم ستار یا دائلن (بیلا) پر کوئی راگ راگنی بجاتے ہوں تو اگر وہ اپنے بائیں پیر سے تال دینے لگے۔ تو ان حالات میں اگر ہم اُس کی محبت میں بے قابو ہو جائیں۔ تو کیا تُم اس کو جنون کہہ سکتے ہو؛ دواکر کو معلوم تھا۔ کہ انگریز خواتین کی رگ رگ میں رومان . . . . بھرا ہوتا ہے۔ اس لئے کچھ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ دواکر مسز مور کی شراب محبت سے بیخود ہو کر ہر روز بلا ناغہ دائلن کی زبانی اپنا پیغام محبت مسز مور کو بھیجتا تھا۔

دواکر کو مادھوپور میں آئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا۔ کہ ایک دن مور صاحب کے بنگلہ میں بہت شور وغل ہُوا۔ بڈھا مور بیطرح ہاتھ پاؤں مار کر دُند مچا رہا تھا۔ سب انسپکٹر پولیس اپنی نوٹ بُک کھولے ایک کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ پولیس کی کارگزاریوں کا تماشہ دیکھنے کے لئے بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ دواکر بابو کی منظورِ نظر مسز مور بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔ مگر چہرہ اُترا ہُوا اور نظریں مغموم!

دواکر نے خیال کیا کہ ان لوگوں سے متعلق

ہونے کا یہ اچھا موقعہ ہے۔ مگر انگریزی سوسائٹی میں بغیر بلائے کسی کے گھر جانا مذموم سمجھا جاتا ہے۔ مجبوراً دوا کر کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن رہ رہ کر یہ سوال اُس کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا؟ اُس نے اپنے ملازم کو بلا کر دریافت کیا۔ کہ [redacted] شور مچا ہوا ہے!

ملازم نے جواب دیا کہ کچھ قیمتی جواہرات اور نقد روپیہ صاحب کا چوری ہو گیا ہے۔ داروغہ جی تحقیقات کو آئے ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس بُری خبر سے دوا کر کے زخمی دل پر اور چوٹ آئی۔ جس وقت دوا کر نے مسز مور کو دیکھا کہ ایک طرف بُت بنی کھڑی ہے۔ تو وہ خود بھی غم کا پُتلا بن گیا۔ محبّت وہی ہے۔ جو دوسرے کے دُکھ درد کو جانے۔ اگر یہ نہیں ہے تو محبّت محض ڈھکوسلا ہے!

(۴)

دن بھر کا تھکا ماندہ آفتاب دامنِ مغرب میں منہ چھپا چکا تھا۔ شام کی دلکش ہوائیں خوشخبریاں سُنا سُنا کر براس کے پھولوں کو کھلا رہی ہیں۔ پھول کی دو ایک پنکھڑیاں ٹوٹ کر عاشق معشوق پر گر پڑیں۔ جو گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے بلبل نے آشیانہ میں جانے سے قبل زور سے اپنا گیت گایا۔ جب بلبل نے [illegible] سورج کو جو گلے میں پنہاں تھی ہوا میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

مسز مور نے کہا۔ "نہیں، کلیری! اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُس بُڈھے کھوسٹ کو اس مرتبہ مجھی پر شک ہوا تھا تم خود جانتے ہو کہ اب میرے لئے وہاں رہنا کس قدر خطرناک ہو گیا ہے۔ [redacted]

جس جوان کے ساتھ مسز مور مخاطب تھیں۔ اُس کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ اُس کا جسم خوب مضبوط اور سڈول تھا۔ چہرہ پر جوانی کی مسرتیں نمایاں تھیں۔ کلیرنس ہل مسز مور کا چچا زاد بھائی ہے۔ کچھ ایسی مشکلات حائل ہو گئی تھیں کہ ان دونوں کی مناکحت نہ ہو سکی۔ لیکن اگرچہ کلارا اب مسز مور تھی۔ مگر وہ کلیرنس ہل کی دبی ہوئی محبّت کی آگ کو نہیں بجھا سکی تھی۔ جب موقعہ ملتا تھا وہ دونوں تنہائی میں بیٹھ کر اپنے پیمانِ محبّت کی تجدید و تکمیل کیا کرتے تھے۔ بُڈھے مور کو اس کا مطلق علم نہ تھا۔

ہل نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ "اگر اس بار تم نے مہربانی نہ کی تو بیطرح ذلیل ہونا پڑیگا۔ اُس دن جو کچھ تم نے دیا تھا وہ سب ضائع ہو گیا۔ اگر کم از کم یکصد روپیہ نہ ملا تو عزت و آبرو میں فرق آجائیگا۔"

کلارا:۔ نہایت افسوس اور تعجب ہے۔ کہ تم قماربازی ترک نہیں کر سکتے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں ایک [illegible] آخر طے یہی ہوا۔ کہ اس مرتبہ کلارا اور [illegible]

دیگی اس کی عزت و آبرو کو بچا لیگی، اور اس کے بعد پھر کوئی اور قسم ہرگز نہ دے گی۔

(۵)

اس واقعہ کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے۔ کہ دواکر بابو اپنے بنگلے کے عقبی میدان میں صبح کے وقت ہوا خوری کر رہے تھے۔ مور صاحب اُن دنوں مادھو پور میں نہ تھے۔ کانوں کا معائنہ کرنے کے لئے باہر گئے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسز مور تنہا چند کتوں کو ساتھ لیکر ہوا خوری کو نکلی تھیں اور بار بار وہ اپنی تیکھی نظروں سے دواکر بابو کے دل کو بھی برماتی جاتی تھی۔

دواکر کو دیکھ کر ایک چھوٹا کتا بھونکنے لگا۔ میم صاحبہ نے اُس کو خاموش کرایا۔ اُس وقت دواکر اور مسز مور کے درمیان میں ۵-۶ گز سے زیادہ فاصلہ نہ ہوگا۔ دواکر نے خیال کیا۔ کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اُس نے میم صاحبہ کی طرف رُخ کرکے نہایت نرمی اور ملائمت سے کہا۔ "اس عنایت کا دلی شکریہ قبول فرمائیے"!

میم صاحبہ مسکرا اُٹھیں۔ دواکر کے خانہ باغ میں آکر انہوں نے گلاب کی تعریف کی۔ دواکر نے فوراً بہت سے گلاب کے پھول کاٹ کر اُن کی نذر کئے۔ میم صاحبہ نے اپنے مخصوص انداز معشوقانہ میں دواکر کا شکریہ ادا کیا بعد ازاں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے انہوں نے کہا۔ "میرا شوہر بہت شکی

واقع ہوا ہے۔ ورنہ میں ضرور آپ کو اپنے یہاں مدعو کرتی"!

نادان دواکر جامہ میں پھولا نہ سمایا۔ پھر ملنے کی امید پر مسز مور اپنے بنگلہ کی طرف چل دی۔

مختلف ذکر اذکار ہوتے ہوتے رات کے دس بج گئے صرف ایک ملازم خدمت میں حاضر تھا۔ دواکر کو آج کے ایسا آرام اپنی زندگی میں کبھی کیوں نصیب ہوا تھا۔ نازنین کلارا طرح طرح کی باتوں سے دواکر کو لبھا رہی تھی۔ رات کے لباس میں ہونے کی وجہ سے اُس کی سادگی آمیز بناوٹ بہت بڑھ گئی تھی۔

کلارا نے ہنس کر کہا۔ "بابو" آپ زمیندار ہیں، اس بڈھے سے مجھے نجات دلائیے ہم دونوں کہیں نکل چلیں تو اچھا ہو"۔

دواکر نے متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ "میم صاحبہ۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے"؟

کلارا۔ "بابو، دولت میں کچھ خوشی نہیں، اسی سے تو.....؟

مسز مور ابھی اپنی بات پوری نہیں کرنے پائی تھی۔ کہ باہر سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ مسز مور نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "بابو! غضب ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ صاحب آ گئے"۔

دواکر سہم کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کلارا نے کہا۔ "کچھ ڈر نہیں۔ آپ میرے ساتھ آئیے"۔

دواکر تاریکی کو چیرتا ہوا ایک کمرہ کے دروازہ پر پہنچا کلارا نے قفل کھولا۔ بعدازاں دواکر کو وہاں چھپا کر کنجیاں اُس کے حوالہ کیں اور کہا۔ "آپ یہاں ٹھیرئیے جب سب لوگ سو جائیں تو آپ نکل جائیے گا۔ اور چلتے وقت دروازہ میں قفل ڈال دیجئے گا مرتا کیا نہ کرتا۔ دواکر نے گردن کے اشارہ سے جواب دیا۔

"بہتر!"

کلارا جاتی جاتی لوٹ آئی۔ گویا کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آگئی۔ "بابو! ہماری ملاقات کی یادگار میں تحفۃً یہ انگشتری قبول فرمائیے۔ اس کو آپ کی اُنگلی میں دیکھ دیکھ کر مجھے ہمیشہ مسرت ہوگی۔"

انگشتری پہن کر دواکر کی مسرت کی حد نہ رہی۔ اُس نے کلارا کو اس طرح گلے سے لگایا کہ گویا بہت پُرانی ملاقات ہے۔ بعدازاں سب کے سو جانے کا انتظار کرنے لگا

(۶)

مور صاحب آتے ہی اپنی عادت کے مطابق اپنے دفتر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُنہیں حیرت تھی کہ یہ خواب ہے کہ بیداری۔ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تو کنجیاں موجود تھیں مگر دروازہ کا قفل کُھلا ہوا ہے۔ وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکے کہ یہ کام کس کا ہے۔ بڈھے نے لیمپ روشن کیا۔ اندر جا کر دیکھا کہ ان کی زندگی بھر کی جمع کی ہوئی پونجی کے پاس ایک کالا آدمی کھڑا ہے۔ بڈھے نے اُس کو دیکھتے ہی زور سے چیخ ماری۔

بڈھے کے ساتھ اُس کا دوست ہیوڈ بھی آیا تھا۔ یہ چیخ سُنکر نوکروں کے ساتھ وہ بھی وہاں پہنچا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ خوف، ندامت، ذلت کے ڈر سے دواکر کے ہوش و حواس گم تھے۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوا۔ تو اُس نے بھاگ جانا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ اُس نے بڈھے کے چیختے ہی بھاگنے کی کوشش کی بھی مگر ہیوڈ نے آکر اُس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اسی اثناء میں آنکھیں ملتی ہوئی مسز مور پہنچی۔ اور دریافت کیا۔ "جوزف ڈارلنگ، تم کب آئے؟ یہ شور کیسا ہے؟"

مور نے جواب دیا۔ "پیاری! ہماری بربادی ہوا چاہتی تھی۔ وہ تو کہو خُدا نے بڑی مہربانی کی ورنہ آج سب مال و متاع جاتا رہتا۔ دفتر میں چور گھس گیا تھا۔"

اس وقت دواکر ٹکٹکی باندھکر کلارا کی طرف دیکھ رہا تھا شوہر کی بات سُنکر عجیب انداز سے اُس نے ایک آہ کھینچی۔

ہیوڈ نے کہا۔ "مسٹر مور! اس آدمی کے ہاتھ کی انگشتری تو دیکھئے۔"

مور (انگوٹھی دیکھکر) خُدایا تیری پناہ! یہ تو میری بہت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ یہ صندوق میں بند تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس نے ہماری تمام دولت اُڑا لی ہے۔"

اس کے بعد ہیوڈ نے دواکر کی جامہ تلاشی لی جیب میں سے

کلاراکا دیا ہوا کنجیوں کا گچھا نکلا۔ بڈھا مور کنجیاں دیکھتے ہی چلا اٹھا۔ "غضب خدا کا۔ یہ تو منشی کنجیوں کا گچھا ہے!"

سب لوگ دواکر کو دیکھنے لگے۔ ایک نوکر نے "حضور یہ بابو بنگلہ کی بغل میں کوئی مہینہ بھر سے آکر رہے ہیں۔"

بڈھے مور پر ایک راز سربستہ کا انکشاف ہوگیا۔ ایک گتھی تھی کہ خود بخود سلجھ گئی۔ اُس کو یقین ہوگیا۔ کہ یہ سفید پوش کالا آدمی ہی جب تب اُس کے یہاں چوری کیا کرتا تھا۔ اگر خدا ہی مہربان نہ ہوتا تو یہ چور کہیں گرفتار ہو سکتا تھا۔

کلارا نے کہا: "جوزف! میں زیادہ باتیں بنانا پسند نہیں کرتی لیکن میں سمجھ چکی ہوں کہ تم کس قدر ذلیل الطبع ہو۔ یہ موذی تو تمہارا مال چُراتا تھا۔ اور تم مجھے خاص اپنی پیاری منکوحہ کو محبت کے ۔ ۔ ۔ ۔"

بڈھے نے آگے کچھ اور نہ کہنے دیا۔ اُس نے کلارا کا ہاتھ چوم کر کہا۔ "پیاری کلارا! میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

بدقسمت دواکر کی اب آنکھیں کھُلیں۔ اسی لئے یہ ڈاین اتنی محبت جتاتی تھی۔ اوہو! کس قدر دغاباز اور مطلب پرست ہے۔ اس ڈاین کی صورت دیکھو کیسی سیدھی اور بھولی نظر آتی ہے۔ مگر ہے یہ۔ گویا زہر میں بجھی ہوئی چھُری۔ توبہ! توبہ!! یہ ایک عورت ہے اور یہی اس کی تہذیب ہے!!!

سب حیران تھے۔ صرف ایک ملازم نظیر خاں جس نے آدھ گھنٹہ پہلے تک دواکر کی خاطر و مدارات کی تھی کبھی کبھی دواکر کی طرف درد بھری نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

(۷)

جیل کے ایک روشندان سے چاندنی کی ایک پتلی اور دھندلی کرن دواکر کے ناچیز بستر پر پڑ رہی تھی۔ جیل سے باہر تھوڑی دور پر، گاؤں میں، ایک کُتّا بھونک رہا تھا۔ اُس کی آواز جھینگروں کی جھنکار میں مل کر بدقسمت قیدی کے ذہن میں بچپن کے اُس زمانہ کی یاد تازہ کرتی تھی جبکہ وہ اپنے گاؤں میں تھا۔ آہ، وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ کہ ہر طرف خوشی اور مسرت نظر آتی تھی۔ وہ سکون اور وہ اطمینان بھلا اب کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔ اس وقت دواکر کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک خیال کے بعد دوسرا خیال اور ایک فکر کے بعد دوسری فکر۔ اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کو رہ رہ کر یہی خیال ستاتا تھا۔ کہ کیسی ذلت و بے آبروئی ہوئی۔ خاندانی عزت و شرافت سب خاک میں مل گئی۔ معلوم عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا۔ کہ جھوٹی محبت کے دام میں گرفتار ہوگیا۔ اور اب بلا قصور سزا بھگت رہا ہوں۔ سزا سے بچ جانا ممکن تھا۔ حاکم عدالت سے سارا کچا چٹھا بیان کر دیتا۔ نظیر خاں میری طرف سے گواہی دینے کو تیار ہی تھا۔ یہ نہ سہی اگر کچھ پہلے ہی کو اطلاع کر دیتا تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ مگر اس واقعہ کی اطلاع کیونکر دیتا۔ یہاں سے چھٹکارا پا کر کسی کو کیسے اپنی صورت دکھاتا۔ خودکشی کے سوا اب کوئی اور چارہ نہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ دواکر کی وضع قطع اور اُس کے بشرہ کو دیکھکر خود حاکم عدالت کو اُس کے بیقصور ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس واقعہ میں ضرور کوئی راز ہے۔ مگر "چشم دید شہادت" اور "برآمدگی مال" یہ دو باتیں ایسی تھیں کہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ اگر دواکر اصل واقعہ بیان کر دیتا تو ضرور اس کی تقدیر پلٹ جاتی

دواکر جب ان حالات وواقعات کا خاموشی کے ساتھ غور بچار کر رہا تھا۔ تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ صرف اس انگریز خاتون کے بغض و حسد کی تصویر ہی اُس کی آنکھوں میں تھی نہیں بلکہ اُس کے خیالات کی رو عجیب ہچکولے کھا رہی تھی۔ ایک اچھے خاندان کے تعلیم یافتہ جوان کے لئے یہ بات کس قدر قابل نفرین ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی غیر عورت کے دام محبت میں گرفتار ہو ایسی ناشائستہ حرکت کسی دوزخی ہی سے سرزد ہو سکتی ہے۔

رفتہ رفتہ یہ باتیں دواکر کے دماغ میں جگہ پکڑنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ یہ خیال کرتا تھا۔ کہ کیا میں بلا قصور سزایاب ہوا ہوں چوری کا الزام اگرچہ بالکل جھوٹا ہے لیکن کیا میں اس سے زیادہ سنگین جرم کرنے پر نہیں تلا ہوا تھا۔ یہ کہنا کہ خدا کے یہاں بھی انصاف نہیں سراسر حماقت ہے! اگر ابتدا ہی ان باتوں پر غور کرتا تو یہ ذلت و رسوائی کیوں ہوتی! افسوس تیر کمان سے نکل چکا۔ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

(۸)

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ بات پرانی ہو کر بھی ہستی ہے۔ دواکر کی میعاد اسیری ختم ہونے پر ہے۔ ایک ہفتہ بعد تین ماہ پورے ہو جائیں گے۔ اور وہ پھر آزادی حاصل کر کے اپنی کھوئی ہوئی عزت پائیگا۔ دواکر قید سے رہا ہو کر کسی اور جگہ چلے جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ مگر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایسی کوششیں کرنے پر بھی گھر والے اس واقعہ سے بیخبر رہیں۔ آئندہ زندگی کیونکر بسر ہوگی۔ یہ فکر ہر وقت دواکر کے دامنگیر رہتی تھی۔

دواکر اس سوچ میں تھا کہ کرم چند نے پُشت کی جانب سے آکر رام رام کی۔ دواکر کسی قیدی سے بات چیت نہیں کرتا تھا۔ صرف دو تین قیدیوں سے اُس نے راہ و رسم پیدا کی تھی۔ اور وہ بھی محض وقت گزارنے کے خیال سے۔ انہیں میں ایک کرم چند تھا۔

کرم چند نے کہا: "بابو صاحب! آپ کی مدت تو پوری ہو گئی۔ ہمیں ابھی پانچ برس اور کاٹنے ہیں۔"

دواکر کے لبوں پر لجاجت کی ہنسی آگئی۔ ایک ڈاکو سے اپنے دُکھ سُکھ کی کہانی کہتے ہوئے اُس کو بہت حیرت ہوتی۔

کرم چند پھر بول اُٹھا۔ "بابو! ناراض نہ ہونا۔ ایک جگہ میرے دس ہزار روپے رکھے ہیں۔ اگر ہرج نہ سمجھو تو قید سے رہا ہو کر اُس روپیہ سے کوئی روزگار شروع کر دینا۔ جب میں چھوٹ کر آؤنگا تو جو کچھ آپ کے پاس ہوگا۔ اُس کا نصف مجھے دیدینا۔ اتنا اقرار کیجئے۔

ان تین ماہ میں جن عجیب عجیب واقعات سے دوا کر کو دوچار ہونا پڑا۔ اُن میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہی تھی۔ سنتے ہی کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ایک طرف خوفِ رُسوائی' قانون کا ڈر' اور اپنی نظروں میں آپ گر جانا۔ اور دوسری طرف طمع زر کا لہلہاتا ہُوا باغ۔ غریب دوا کر عجیب کشمکش اور اُلجھن میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا آئندہ زندگی چوری کے مال سے بسر ہوگی؟ نہیں نہیں۔ چوری مَیں نے تو کوئی کی نہیں۔ مَیں تو صرف قرض لیتا ہوں پھر میرا دل کیوں دھڑکتا ہے۔ کیا دل اب اتنا کمزور ہو گیا۔ اب مَیں اپنے دل کو مضبوط کروں گا لیکن اگر کسی کو معلوم ہو گیا۔ کہ مَیں چوری کے مال پر قبضہ کرنے چلا ہوں۔ تو پھر قید کی مصیبت سامنے ہے۔ نہ بابا' ایسے مال کو دور ہی سے سلام ہے!

دوا کر نے کرم چند سے کہا۔ "نہیں' بھائی مجھے تمہارا روپیہ نہیں چاہیئے"۔

کرم چند خاموشی سے دوا کر پر نظریں جمائے ہوئے تھا اُس نے دیکھا کہ دوا کر جس پیچ و تاب میں ہے۔ اس سے یہ بھی جانا جاتا ہے۔ کہ اُس نے روپیہ لینے سے جو انکار کیا ہے۔ وہ گویا کسی دوسرے کے الفاظ ہیں۔ جو اُس نے دُہرا دیئے ہیں۔ اُس نے دوا کر کو سمجھانا شروع کیا۔ "اگر تم مہاجن سے قرض لو تو کیا کہہ سکتے ہو کہ وہ روپیہ گناہ کی کمائی نہیں ہے۔ اور پھر تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ کرم چند کا وہ روپیہ چوری کا مال ہے۔ اور اگر یہی اندیشہ ہے۔ تو تم اس کا کفارہ بھی کر سکتے ہو۔ مان لو کہ دس ہزار روپیہ سے روزگار شروع کر کے تم لکھ پتی بن گئے۔ تو بیس پچیس ہزار کی خیرات سارے گناہوں کو دھو ڈالیگی"۔ جب دوا کر یہ ارادہ ہی کر چکا ہے کہ وہ گھر نہیں جائیگا تو اس روپیہ کے لیے لینے میں کون قباحت ہے!

دُنیا میں جو ہمیشہ ہوتی آئی ہے' آخر وہی ہوتی۔ بازی شیطان کے ہاتھ رہی۔ بزدل دوا کر نے لالچ کے مذبح پر اپنی کانشنس کو قربان کر دیا۔ فاتح کرم چند نے بتا دیا کہ کس [illegible] اُس کا روپیہ ہے۔

۹

دوا کر کو کرم چند سے دس ہزار روپیہ لینا پہلے تو اچھا نہیں معلوم ہُوا۔ پر جب اُس نے دیکھا۔ کہ لکشمی ماتا خود بخود اُس پر مہربان ہو رہی ہیں۔ تب اُس نے بھی ہاتھ پھیلا دیئے۔ دوچار شہروں میں گھوم کر دوا کر نے لاہور کی سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک سال میں تین ہزار کما لئے۔ مگر سکون حاصل نہ ہُوا۔ آخر کچھ سوچ کر وہ اپنے وطن کو گیا۔ اپنی غمزدہ ماں کی نظروں سے نظریں ملتے ہی ایسا معلوم ہُوا۔ گویا وہ بہشت میں ہے۔ اُس کی واپسی کی خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ عورتیں اور مردوں کے غول کے غول آنے اور اُس سے قسم قسم کی باتیں دریافت کرنے لگے۔ دُنیا میں اگر دس دوست ہیں تو دو چار دُشمن بھی ضرور ہونگے۔ دوا کر اس کلیہ سے مستثنےٰ نہ تھا۔ اُس

کے پرانے دشمنوں نے جب سُنا۔ کہ دوآکر بہت دنوں کے بعد سنتے ٹھاٹھ سے آیا ہے۔ تو دشمنی کی وُہ دبی ہوئی آگ پھر سلگ اُٹھی۔ طرح طرح کی جھوٹی سچّی باتیں اُس کے بارے میں پھیلانا شروع کیں۔ ایک ہفتہ بعد دوآکر اپنی والدہ کو ساتھ لیکر پھر لاہور چلا آیا۔ اس واقعہ کو ۲۰ برس ہوتے اُس وقت سے وہ لاہور ہی میں ہے۔

قید سے رہا ہونے کے پانچ برس بعد دوآکر نے کرم چند کا پتہ لگایا تھا۔ مگر وہ بدقسمت جیل ہی میں مرچکا تھا

× × × × × ×

جس زمانہ میں دوآکر نے لاہور کی سکونت اختیار کی تھی۔ اُس وقت وہاں کوئی اور بنگالی نہیں تھا۔ جسقدر بنگالی اب وہاں ہیں۔ وہ سب دوآکر کے بعد آئے ہیں۔ اس لئے کسی کو اس کے صحیح حالات معلوم نہیں۔ جس کا جی چاہا۔ اُسی نے ایک نظریہ قائم کرلیا۔ مگر اصلیت سے سب کوسوں دور!

ایک دن آسوتوش نے سوچا کچھ ہی کیوں نہ ہو آج تو ضرور ہی دوآکر کے حالات سے واقفیت پیدا کرونگا۔ مگر اتنی بڑی مہم کو اکیلے سر کرنا ذرا دشوار تھا۔ اس لئے وہ ستیش کے پاس پہنچا۔

اُس کی باتیں سُن کر ستیش نے کہا۔ "بھائی! کسی بڑے آدمی سے اس قسم کا سوال کرنا مناسب نہیں ہے۔ دوسرے جب دوآکر بابو صاف اور خالص نظروں سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرے دل کے تمام شکوک رفع ہوجاتے ہیں"

آسوتوش نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا۔ "کیا تم نے مجھے کوئی نادان بچّہ سمجھ رکھا ہے۔ مَیں پہلے ہی ایک بہانہ بنا چکا ہوں"

ستیش :۔ "وہ کیا۔ ذرا میں بھی سنوں تو؟"

آسوتوش :۔ "مَیں کہونگا کہ ہم سے کلکتہ کے ایک اخبار نے لاہور کے سب سے بڑے بنگالی کے حالات زندگی طلب کئے ہیں۔ تُم جانتے ہی ہو۔ کہ ہمارے لاہوری بنگالیوں میں دوآکر بابو دولت میں، عزّت میں، خیرات میں، دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں اور اگر حالات مل گئے تو کسی اخبار میں شائع ہوجائینگے"

ستیش نے آسوتوش کی عقل کی تعریف کی اور تیار ہونے کے لئے فوراً اندر چلا گیا۔

(۱۰)

دن کے کام دھندوں سے فارغ ہوکر دوآکر بابو اپنی نشستگاہ میں بیٹھے ہُوئے وائلن بجا رہے تھے۔ وائلن کی آواز بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اور دوآکر بابو اپنی دُھن میں مست ہیں۔ قدموں کے پاس ایک سیاہ بلّی بیٹھی تھی جس کی نظریں دوآکر پر تھیں۔ کبھی کبھی وہ بھی اپنی آنکھیں بند کرلیتی ہے باہر پنجرے میں ایک بُلبل ہے۔ جو وائلن کی آواز میں اپنی آواز مِلانے کی بیکار کوشش کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بلبل کی آواز نہایت دردناک ہے۔ کہ سُن کر دل پھڑک

اُٹھتا ہے۔ مگر دواکر کے وائلن کی آواز کچھ اور ہی چیز ہے۔ اُس کو سُن کر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ دم کے دم میں تمام فکریں غائب ہو جاتی ہیں۔ آسوتوش اور ستیش خوشی خوشی کمرہ کی طرف بڑھے۔ مگر وائلن سُن کر وہ بھی خود فراموشی اور راز خود رفتگی کی وادیوں کی سیر کرنے لگے۔ دواکر کو معلوم تک نہ ہوا کہ کوئی ملاقی دروازہ پر ہے۔ بلّی نے بھی اس خیال سے کہ کہیں آقا کا مزا کرکرا نہ ہو جائے۔ غرانا مناسب نہیں سمجھا۔ دواکر نے کچھ دیر بعد جب پشت کی جانب نظر کی تو دیکھا۔ کہ دو بھلے مانس ملاقات کی غرض سے باہر کھڑے ہیں۔

دواکر نے جلدی سے وائلن الگ رکھ دی اور ملائمت سے کہا۔ "میری خوش نصیبی ہے۔ کہ ہر دو صاحبان نے ایک ساتھ کرم فرمایا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے آپ کے تشریف فرما ہونے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔"

آسوتوش:- "ہم لوگ آپ کی وائلن نوازی کے مزے لے رہے تھے۔ آپ نے اس کو کیوں رکھدیا؟"

دواکر نے ہنس کر کہا۔ "یونہی وقت کاٹنے کے لئے کبھی کبھی بجا لیتا ہوں۔"

سلسلہ گفتگو شروع ہو گیا۔ دونوں نے بہت ہمّت کی مگر حرفِ مطلب زبان پر نہ لا سکے۔ ستیش نے چپکے سے آسوتوش سے کہا کہ مطلب کی بات کیوں نہیں کہتے ہو؟

دواکر نے ہنس کر جواب دیا۔ "اگر کسی کی دولت بڑھ گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ وہ سوسائٹی میں بھی بڑا آدمی ہو گیا۔ میں کیا اور میرے حالاتِ زندگی کیا؟"

اسی اثناء میں ملازم نے آکر خبر دی کہ کوئی صاحب ملنے کی غرض سے آئے ہیں میم صاحبہ بھی ساتھ ہیں۔

کوئی ایسی ہی ضرورت آپڑتی تھی۔ تب تو دواکر کسی انگریز مرد سے مل لیتا تھا۔ پر آج ۲۰ برس ہو گئے۔ کہ اُنھوں نے کسی میم کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ملازم سے کہا۔ "اگر ضرورت ہے۔ تو صاحب مل سکتے ہیں۔ میم صاحبہ سے میں نہیں ملنا چاہتا۔"

آسوتوش اور ستیش چند نے ایک دوسرے کی طرف خاص نظر سے دیکھا۔ نوکر نے آکر جواب دیا۔ کہ "میم صاحبہ آپ سے ملے بغیر ہرگز نہ جائینگی۔"

دواکر سخت اُلجھن میں پڑ گیا۔ موقع پاکر آسوتوش نے کہا:۔ "کیا مضائقہ ہے، مل لیجئے۔ دیکھئے کیا کہتی ہیں۔" اگر اس وقت یہ لوگ نہ ہوتے تو دواکر کو ہرگز میم صاحبہ سے ملنا منظور نہ ہوتا۔ مجبوراً بلانا پڑا۔

آسوتوش اور ستیش جانے کے لئے اُٹھے۔ تو دواکر نے کہا۔ "مہربان آپ تشریف رکھیں۔ میں ان لوگوں سے تنہائی میں ملنا اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔"

ستیش نے آسوتوش کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آسوتوش نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے ملاقاتی کا انتظار

نظر ڈالی۔ اُس پر لکھا تھا "کلیرنس ہل"۔

کلیرنس ہل نے آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوکر دواکر کو سلام کیا۔ اُس کے پیچھے ادھیڑ عمر کی ایک عورت تھی جس کے خط و خال گواہی دیتے تھے۔ کہ وہ کبھی اچھی قبول صورت رہی ہوگی۔ اس کو دیکھتے ہی دواکر حیران ہوگیا۔ دواکر نے دل ہی دل میں کہا "یہ تو وہی سیاہکار معلوم ہوتی ہے۔ کمبخت ڈاین، ابھی تک اس کے چہرہ پر حُسن کی جھلک موجود ہے۔ دیکھیں آج کس آفت کا سامنا ہوتا ہے۔

کلارا نے دواکر کو نہیں پہچانا۔ گزرے برسوں میں اُس کی یادداشت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ آتے دن کی فکروں نے اُس کے جسم کو گھلا دیا تھا۔ پیشانی پر جابجا شکنیں پڑ چکی تھیں۔ اُس کی آنکھیں مجسّم افسانۂ درد تھیں۔

کلارا کی وہ پُرانی آواز پھر ایک بار دواکر نے سُنی: "بابو، ہم میاں بیوی پریشانی و مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہم نے سُنا ہے۔ کہ آپ دوسروں کے دُکھ درد کو مٹاتے ہیں۔ اس لئے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم آپ سے بھیک مانگنے آئے ہیں۔"

اپنے الفاظ کا اثر دیکھنے کے لئے کلارا خاموش ہوگئی۔ آسوتوش نے دواکر کے چہرہ پر وہ کیفیت دیکھی جس کے دیکھنے کا اس سے پہلے کبھی اتّفاق نہ ہُوا تھا۔

کلارا نے پھر کہنا شروع کیا "میرا شوہر ریلوے میں گارڈ ہے۔ پہلے شوہر کے انتقال پر مجھے کافی دولت ملی تھی۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے۔ کہ میرے موجودہ شوہر کلیرنس ہل نے وُہ تمام دولت قمار بازی میں اُڑا دی۔ اپنی فضولخرچی کے باعث وہ اب اتنا مقروض ہوگیا ہے۔ کہ کہیں سے ایک پیسہ بھی قرض ملنا ممکن نہیں۔ ایک شخص نے عدالت سے پانچسو روپیہ کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ اور اگر صبح ہوتے ہوتے روپیہ ادا نہ ہُوا۔ تو کل جیل جانا پڑیگا۔ ایسی ذلّت و رسوائی سے بچنے کے لئے آپ ایسے شریف الطبع آدمی سے بھیک مانگنا بدرجہا بہتر ہے۔ اسی غرض سے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"

مسز ہل خاموش ہوگئی۔ آسوتوش نے دیکھا۔ کہ دواکر کے چہرہ پر اب وہ رنگ نہیں ہے۔ جو پہلی بار تھا۔ اب بشرہ سے مستقل مزاجی مترشح تھی۔ دواکر نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "آپ کے شوہر کے ذمہ کل قرضہ کتنا ہے؟"

کلارا:۔ "اس کی بابت آپ کیا دریافت کرتے ہیں، سب مِلا کر کوئی تین ہزار روپیہ دینا ہے۔"

دواکر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپکے سے چک بک نکالی اور تین ہزار کا چک لکھ کر ہل صاحب کے حوالہ کیا۔ دیکھنے والے حیران ہوگئے۔

ہل صاحب نے کہا "مَیں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ مجھ پر مہربانی فرمائیں۔ مَیں بڑا گنہگار ہوں۔ اس عورت

کے دام محبت میں پھنس کر میں نے بڑے بڑے گناہ کئے ہیں"
کلارا کا چہرہ فق ہو گیا۔ دواکر نے دریافت کیا: "ان کے پہلے شوہر کا نام مُود تھا نا؟"
کلارا نے حیرت سے کہا: "جی ہاں!"
دواکر: "وہ مادھوپور میں رہتے تھے؟"
ہل نے دریافت کیا: "آپ نے کیونکر جانا؟"
دواکر نے کلارا سے کہا: "میم صاحبہ! آپ شاید مجھ کو نہیں پہچانتی ہیں۔ اپنا گناہ چھپانے کے لئے جس کو تم نے بلا وجہ تباہ و برباد کرنے میں تامل نہ کیا تھا میں وہی بدبخت دواکر ہوں۔ تمہاری ہی برکت سے اب میرے پاس اس قدر دولت ہے۔ تم نے جو بدی میرے ساتھ کی تھی۔ آج اپنی نیکی سے میں اس کا انتقام تم سے لیتا ہوں"

دواکر کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ کلارا غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ دواکر اُٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ کلارا کی نسبت جو شبہات ہل کو تھے اُن میں اور اضافہ ہو گیا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ جلد اس بوجھ سے ہلکا ہوں گا۔ اس کے بغیر سکون و آرام ممکن نہیں ہے۔
آسوتوش اور ستیش نے مل کر کلارا کی غشی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ کلارا کے چلے جانے پر ستیش نے کہا: "یہ کیا معاملہ ہے؟"
آسوتوش نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا: "دواکر بابو اگرچہ کنوارے ہیں تاہم میری تھیوری (نظریہ) قطعاً غلط نہیں ہے ماننا نہ ماننا تمہیں اختیار ہے۔ مگر یہ بالکل درست ہے کہ اس میم سے دواکر بابو کو ضرور محبت ہے۔

"پلشم"

شفق

رشک کا یہ حشر تک احسان مجھ پر رہ گیا
طور پر بجلی گری میں خاک ہو کر رہ گیا

دیکھنے کو شوخیاں اُن کی خرام ناز کے
فتنۂ محشر بھی دو دو ہاتھ اُٹھ کر رہ گیا

آپ نے دل لے لیا جاں قابض ارواح نے
تن بجائے نام اِک اُجڑا ہُوا گھر رہ گیا

تاب نظارہ نہ دیکھی دیکھنے والوں میں جب
اک گھڑی بھر کو چراغ طور جل کر رہ گیا

ایک میں کیا اُن کی بزم ناز میں حیرت نہ تھی
آئینہ بھی نقش پر دیوار ہو کر رہ گیا

رہ نوردانِ منزلِ مقصود دونو تھک گئے
میں زمیں پر رہ گیا نالہ فلک پر رہ گیا

اے شفق ہم بادہ نوشوں کے بڑھے جب حوصلے
ہاتھ میں ساقی کے شیشہ بن کے ساغر رہ گیا

اقبالِ جنون

کیا کہوں میں ہمنفس اب تجھ سے اقبالِ جنون
وہ ادائے نازو تمکین ہے مجھے فالِ جنون

بیخودی کے سامنے کیا ذکرِ عرش و لامکاں
کر لیئے ہیں رُوح نے پیدا پر و بالِ جنون

دِل دکھا سکتے نہیں، ورنہ دکھا دیتے تمہیں
وہ شبیہہِ آرزو، یعنی خط و خالِ جنون

سُننے والے التفات و رحم پر مائل تو ہیں
ہوگیا بارے مطابق حال کے قالِ جنون

ہائے اِس صورت کو کیا آئینہ ایسا چاہیئے
پیکرِ اُلفت میں رکھ دیتے ہیں تمثالِ جنون

واں تکلف یہ کہ محفل کو بھی کہتے بُتکدہ
اور یہاں بے اختیار یہائے احوالِ جنون

اس تعلق پر ہے یہ فرقِ مراتب اے خُدا
حسن سرافرازِ نخوت، عشق پامالِ جنون

ہاں شہما وہ سُن تو لیں اک بار رسوائی قبول
کاش اُن سے کوئی کہہ بھی دے مِرا حالِ جنون

جذباتِ فکری

دُنیا کو بنا دے گی دیوانہ و شیدائی
قاتل تری آرائش ظالم تری رعنائی

ہاں ہاں مرے زخموں پر تم خوب چھڑکو نمک
میں درد کا عاشق ہوں اور یہ ہے مسیحائی

بسمل ہی کے دم تک تھی نالوں کی دہائی بھی
قاتل کو مبارک ہو اب انجمن آرائی

وہ پوچھنے آئے ہیں بیمار سے حالت کچھ
دے کاش خُدا اس کو اب طاقتِ گویائی

وہ تیرا مریضِ غم گھٹ گھٹ کے ہُوا آخر
کیوں دیکھ لیا اب تو انجامِ شکیبائی

پُرلطف گزرتی تھی کیا زندگیٔ غربت
وہ مشغلۂ وحشت وہ عالمِ تنہائی

ظالم کی خوشامد کا حاصل نہیں کچھ فکری
کب کام مرے آئی اُس در کی جبیں سائی

محبّت کی پسپائی

محبوب کی فتحمندی محب کی شکست اور عشق کی لام بندی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ مگر چودھویں صدی کو خدا اس کی سوکن بیسویں صدی سمیت بے قرار رکھے۔ اس کے شروع ہوتے ہی خود محبّت کی ہستی زوال میں مبتلا ہوگئی۔ اور ہوتے ہوتے یہ نوبت آئی کہ آج اس کی عام پسپائی کی اطلاع شائع کیجاتی ہے مغرب میں پسپائی کا لفظ اور مفہوم کچھ برا نہیں ہے۔ اگست ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۹۱۸ء کے اخیر تک آنکھیں یہی پڑھتی تھیں اور کان یہی سنتے تھے۔ کہ فلاں فوج نہایت شان کے ساتھ پسپا ہوئی۔ فلاں جنرل بڑی قابلیت سے بھاگا۔ فلاں لشکر نے فرار ہونے میں ایسی دانشمندی ظاہر کی کہ مہذب ممالک حیرت زدہ ہوگئے۔

پھر اگر محبت کو شکست ہوگئی۔ اور اس کو میدان رزم سے پسپا ہونا پڑا۔ تو مغربی خیال میں یہ کوئی "واقعہ ہائلہ" نہیں ہے۔ اور اس پر کوئی مرثیہ لکھنا "حرکت مذبوحی" ہے لیکن مشرقی احساس تو محبّت کا غلام ہے۔ وہ زندہ ہے۔ تو یہ بھی زندہ ہے وہ میدان حیات میں موجود ہے۔ تو اس کی زندگی بھی سلامت ہے۔ ورنہ یوں سمجھو کہ اس سرزمین پر جینے کا مزا ہی جاتا رہا۔

مجھ کو تو ہمیشہ ان سے یہی شکایت رہی کہ محبّت کی پسپائی پر افسوس نہیں کرتے۔ ان کی اور اُن کی تقریروں اور تحریروں کو الف سے لیکر یے تک پڑھ جاؤ کہیں اس کا ذکر نہ ہوگا۔ کہ مشرق کی سب سے بڑی دولت محبّت میدان ہستی سے پسپا ہوگئی۔ اور اس شکست کا سبب تمدن جدید ہے۔ جس نے یہاں آکر ہم سب کو ایسا بے حس کر دیا۔ کہ محبّت کی امداد سے عاجز ہوگئے۔ اور آخر اس بےکس کو پسپا ہونا پڑا۔

محبّت کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک مجازی اور ایک حقیقی۔ مجازی محبّت بہت بدنام ہے۔ حقیقی کا سب ادب کرتے ہیں۔ میں حقیقی اور مجازی کے معانی پر گفتگو کروں تو ذکر پسپائی ادھورا رہ جائیگا۔ اتنا جانتا ہوں کہ مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ کہا گیا ہے۔ اور زینہ بام حقیقت پر جانے کے ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ ہم لوگ لفٹ کے راستہ سے چھت پر جانے کے عادی نہیں ہیں۔ اس واسطے مجازی محبت ہی کا بیان ہو رہا ہے۔ حقیقی الفت کو خدا جانے اور اس کی اہلیت رکھنے والے جانیں۔ میں نے تو ذات معبود کی طرح ہمیشہ اس کا غائبانہ احترام کیا۔ زیارت کا موقع کبھی نہیں ہوا۔

ایک زمانہ تھا۔ جب محبّت میدان زندگی میں اپنا جھنڈا

مہاتما گاندھی۔ مولانا شوکت علی محمد علی سوبرس

کھڑی رہتی تھی۔ محبوب اُس کے اشارے سے ہتھیار لیکر آگے بڑھتے تھے۔ اور عاشق سینے کھول کھول کران کے وار دل وجگر پر لیتے تھے۔

چار سیر کا گھی تھا۔ من بھر کا آٹا۔ مٹی کے آبخورے میں پانی پیتے تھے۔ گاڑھا گزی پہن کر خوش ہوجاتے تھے۔ جس کو پانچ روپے ماہوار کی آمدنی تھی وہ بھی بے فکر تھا۔ اور فرصت کا وقت عشق بازی میں خرچ کرتا تھا۔

اب چار سیر کا آٹا ہے۔ ڈیڑھ پاؤ کا گھی ہے۔ چار آنہ کا گلاس پانی پینے کو آتا ہے۔ اور تیسرے دن ٹوٹ جاتا ہے پانچ سو روپے ماہوار میں بھی بیفکری میسّر نہیں آتی پھر محبّت کے لشکر میں بھرتی کون ہو۔ اور کیونکر ہو۔

موچی۔ جولاہے۔ لہار۔ بڑھئی۔ معمار۔ مولوی۔ پیر۔ قاضی نواب۔ راجہ پہلے بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ پہلے موچی جوتی ۸ر آٹھ آنہ کو فروخت کرتا تھا۔ اب تین روپے کو بیچتا ہے پہلے دو آنہ گز کپڑا آتا تھا۔ اب روپے گز ملتا ہے۔ پہلے پانچ آنہ بڑھئی کو دئے جاتے تھے۔ اب دو روپے روز کو بھی بمشکل ملتا ہے۔ مولوی صاحب کو پہلے واعظ میں کھانا اور سوا روپیہ دیا جاتا تھا۔ اب پانچ روپے سے کم میں واعظ نہیں ملتا۔ پیر صاحب اگلے زمانہ میں سوا روپیہ کی نذر سے خوش ہوجاتے تھے۔ اب سو روپے سے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ نکاح کے وقت پانچ حد سے حد سوا روپیہ قاضی جی کو ملتا تھا۔ اب وہ بھی پانچ مانگتے ہیں۔ نوابوں اور راجاؤں کو پہلے لاکھ روپے سال کی آمدنی تھی۔ تو اب پانچ لاکھ کی ہے۔

مگر خبر نہیں کیا وجہ ہے۔ کہ کوئی شخص فکر سے خالی نہیں ہے۔ اور محبت کا سودا بازار میں جاکر کوئی نہیں خریدتا۔

ڈاکٹر کہتے ہیں محبّت اعصاب کی قوت اور خون کی صحت و کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ اب اعصاب کی قوت کیوں جاتی رہی۔ خون کی تندرستی کہاں چلی گئی۔ وہ بدن میں زیادتی کے ساتھ کیوں نہیں پیدا ہوتا۔

مَیں تو اپنے دل سے بارہا پوچھ چکا ہوں اور کسی کو خیال ہو تو وہ بھی پوچھ لے۔ کہ اب اس میں محبت کا اثر ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے۔ اور نہیں ہے۔ تو کیا وجہ اس کے نہ ہونے کی ہے۔

مجھ کو تو دل نے یہ جواب دیا کہ روٹی کا فکر کرو۔ کپڑوں کا بندوبست کرو۔ گھر میں کچھ دیسی کچھ ولایتی فرنیچر رکھو۔ انگریزی ساخت اور ہندوستانی طرز دو قسم کے برتن خریدو۔ تاکہ دونوں قسم کے مہمانوں کی مدارات کرسکو۔ محبّت کا خیال چھوڑ دو۔ اس میں سوائے خلجان و کوفت کے اور کیا رکھا ہے۔

● جس جگہ جاؤ لاؤ پیسہ۔ جس سے سُنو لاؤ روٹی جہاں بات کرنے کھڑے ہو جاؤ لاؤ عزّت بس یہی چاروں طرف پکار ہے محبّت کا نہ کسی کو خیال نہ کوئی اس کا طالب۔

اب فرہاد نے پہاڑ کھودنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ کہ ریل

نکلنے والی ہے۔ اور مجنوں محمل کے فوٹو فروخت کرتا ہے۔ رانجھے نے بھینس کی سپلائی ایجنسی کھول لی ہے۔ شیریں ہارڈنگ ہسپتال میں نرسنگ کا کام سیکھ رہی ہے۔ لیلےٰ کھدّر کی اشاعت کے لئے لیکچر دیتی پھرتی ہے۔

ہائے وہ وقت کیسا حسرتناک تھا جب محبت نے آخری بلاوا میدان میں کھڑے ہو کر اپنے فدائیوں کو دیا اور کہا کہ یہی وقت سرفروشی کا ہے۔ اگر آج تم نے ہمت کی تو میدان ہمارا ہے۔ ورنہ ساری عمر سلطنت عشق کی صورت کو ترک کرو گے۔ مگر غریب کی صدائے حمایت طلبی کا ایک شخص نے بھی جواب نہ دیا۔ اور بچاری کو بادل ناخواستہ میدان زیست سے پسپا ہونا پڑا۔ اس کی پسپائی اگرچہ غمناک تھی۔ تاہم وہ پوری شان اور دبدبہ کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی ہٹتی پوشیدہ ہو گئی۔

اب جو لوگ کسی اگلی پچھلی سنی سنائی محبت کا حوالہ دے کر کہتے ہیں۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تو اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جی نہیں مجھے سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ رسالہ کا ڈکلریشن دینے جاتا ہوں۔ ایک عمدہ کاپی نویس کی ضرورت ہے۔ کاغذ بمبئی سے منگاؤں یا دہلی سے لیلوں۔ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا پریس کے لئے عمدہ پریسمین نہیں ملتا۔ کیا آپ سنگ سازی جانتے ہیں۔ مجھ کو سنگ سازی کی بڑی ضرورت ہے۔

وہ حیران ہو کر کہیں آپ کو کیا ہو گیا۔ وہ ریل میں ساری رات لیمپ کی روشنی میں صورت دیکھنا۔ اور کہنا کہ اس دیدۂ ہزار نیند میں قربان ہوں۔ کیا آپ کو بالکل یاد نہیں تو جواب میں گھبرا کر کہنا۔ کیوں جناب پریس ایکٹ کی منسوخی سے سب کو تو فائدہ ہوا۔ مگر ایڈیٹر کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی۔ اب وہ مضمون کو ساری رات دیکھتا رہتا ہے۔ اور رات بھر کی نیند کو احتیاط قانون کی خاطر ایک مضمون پر قربان کر دیتا ہے۔

جو اس مضمون کو پڑھے۔ لکھے۔ چھاپے۔ فروخت کرے۔ اور اس کی بندش پر واہ واہ کہنا چاہیے یا اس کی خرابیوں پر ناک بھوں چڑھائے۔ اس کو چاہیے کہ پہلے محبت کی پسپائی پر مجازی و حقیقی نظر سے غور کر کے آہ سرد کھینچے۔ اور کہے۔

بات تو بالکل سچی ہے۔ کہ محبت کی پسپائی کے بعد جینے کا لطف جاتا رہا۔ زندگی کے اس خاموش فوٹو سے کچھ بھی حاصل نہیں ہے۔

حسن نظامی

ملکہ زباء

سنہ ۲۰۰ عیسوی میں فارس کے دور طوائف الملوکی سے فائدہ اُٹھا کر اس مُلک میں بہت سی خودمختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اردشیر بن بابک ملقب بہ ساسان اول نے ایک مستقل ساسانی حکومت کی بُنیاد سنہ ۲۱۱ء میں ڈالی۔ اسی زمانہ میں جذیمہ شاہ حیرہ (عراق) نے شاہ الجزیرہ (ما بین فرات و دجلہ) عمرو بن ظرب پر حملہ کر دیا۔ اور طول طویل جنگ و خونریزی کے بعد عمرو کو کامل شکست ہوئی۔ اور وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ باستثنائے چند قلعوں کے پورے الجزائر پر شاہ حیرہ کا قبضہ ہو گیا عمرو کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام نائلہ اور دوسری کا زبیبہ تھا۔ جب ان کے باپ کی سلطنت چھن گئی۔ اور وہ مارا گیا۔ تو یہ دونوں یتیم اور ستم رسیدہ لڑکیاں ایک پہاڑی قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئیں۔ اور اب اس محفوظ مقام میں بیٹھ کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ذہنی نقشے بنانے شروع کئے۔ شاہزادی نائلہ کے حُسن و جمال۔ فراست و ذہانت کا دور دور شہرہ تھا۔ اور اُس زمانہ کی عرب خواتین میں کوئی عورت خوبی و رعنائی ذہانت و طباعی میں اس کے مقابلہ کی نہ تھی۔ چونکہ اُس کے باریک اور گھنے سیاہ بال چوٹی سے ایڑی تک پڑے رہتے تھے۔ اس لئے اس کو زباء کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے قلعہ کے گرد و نواح میں ایک چھوٹی سی مستقل حکومت اپنے خُداداد فہم و تدبر سے کام لیکر قائم کر لی۔ ملکہ زباء اپنے باپ کے قاتل جذیمہ سے انتقام لینے کے لئے ہمیشہ تدابیر جنگ سوچا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنی چھوٹی بہن زبیبہ سے اثناء گفتگو میں اپنا ارادہ ظاہر کر کے صلاح لی۔ زبیبہ نے کہا۔ مجھے اختلاف ہے کیونکہ وہ ایک زبردست حکمران ہے۔ ہم اُس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ اگر جنگ ہوئی تو ہمیں شکست و ناکامی نصیب ہو گی۔ اور اُس کے بعد خُدا جانے کیا ہو۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کسی کارگر حکمت عملی سے کام لیا جائے۔ یہ مفید مشورہ زباء کو بہت پسند آیا۔ اور اُس نے کچھ دیر سوچ کر ایک قاصد کے ہاتھ مضمون ذیل کا خط جذیمہ کے پاس بھیجا۔

جلیل القدر فرمانروا

والد کا سایۂ عاطفت اُٹھ جانے کے بعد مع اپنی چھوٹی بہن کے ایک پُر آشوب و پُر ملال بیکسی اور مجبوری کی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ گو خُدائے مناق نے اپنے فضل و کرم سے جو کچھ مجھے اس وقت دے رکھا ہے۔ وہ عمر بسر کرنے

کے لئے کافی ہے۔ اور مجھے نہ زیادہ کی احتیاج نہ عیش و عشرت کی آرزو مگر بوجوہ چند میں سلسلہ ازدواج میں منسلک ہونے کو آمادہ ہوں۔ میرے عقد کے لئے بڑے بڑے رئیس اور امیر کبیر پیام بھیج رہے ہیں۔ لیکن میں نے ابھی تک کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ میری نظر انتخاب سوائے آپ جیسے شجاع۔ لائق اور صحیح النسب فرمانروا کے کسی اور کو پسند نہیں کرتی۔ اب یہ خیال ہے۔ کہ اگر دوسرے رئیسوں کو جن کے پیام آتے ہوئے ہیں۔ جواب نفی دیتی ہوں تو یہ سب میرے مخالف ہوتے جاتے ہیں۔ اور مبادا یہ سب ملکر یا ان میں سے کوئی ایک میری چھوٹی سی ریاست پر حملہ آور ہو تو یقیناً مجھے ناقابلِ برداشت مصیبت اور سخت خطرہ سے دوچار ہونا پڑیگا۔ اور خدا جانے پھر کیا حشر ہو۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ میری استدعا شرف قبولیت حاصل کریگی۔ اور اس تقریب سعید سے الجزیرہ کا باقیماندہ حصہ بھی سلطنت حیرہ سے ملحق ہو کر مزید وسعت کا باعث ہوگا۔ اور میں بھی ایک وسیع سلطنت کی ملکہ بنکر آزاد اور بے خطر زندگی پاسکونگی۔

آپ کی خادمہ

نائلہ المعروف بہ زبانہ

جذیمہ اپنی عمر کی نوے منزلیں طے کر کے سفر کی تکان سے خستہ اور چکنا چور ہو چکا تھا۔ مگر زبا کے خط نے اس کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑا دی۔ خط پاتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جوش مسرت اور فرط شوق میں کئی کئی مرتبہ دلچسپی سے پڑھا اور ہر دفعہ کے مطالعہ نے اس کے آتش شوق کو اور بھی تیز کردیا۔ جب یہ چراغ سحری بھڑک اُٹھا۔ اور اس سے یہ خوشی ضبط نہ ہوسکی۔ تو مسکراتے ہوئے اصل خط درباریوں کے سامنے رکھدیا۔ اور اُن سے پوچھا کہ "اب مجھے کیا کرنا چاہئے" خوشامدی اُمرا نے زبا کی مدح سرائی میں بھاٹیوں کو بھی مات کردیا۔ اور سب نے ایک زبان ہو کر تجویز نکاح سے کلی طور پر اتفاق کیا۔ مگر قصیر نامی ایک جہاندیدہ مصاحب نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ اور صاف طور پر کہدیا کہ "زبا کا پیام کھلا ہوا فریب ہے۔ اور ضرور اس میں کوئی بڑا راز ہے۔ میرے قول کی تائید و تصدیق اس طرح پر ہوسکتی ہے۔ کہ حضور زبا کو پہلے یہاں بلائیں۔ اگر وہ آجائے تو میں جھوٹا ہوں" مثل مشہور ہے۔ کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ جذیمہ نشۂ عشق میں سرشار ہو رہا تھا۔ اُس کے دل میں شوق دید اور ولولوں کا ہجوم تھا۔ دماغ پر جنون الفت کا قبضہ اور آنکھوں کے سامنے جمال یار کی تصویر جلوہ گر اور وصل و وصال کا خیالی نقشہ پیش نظر۔ پھر بھلا غریب قصیر کی وہ کب سُنتا ہے۔ اُس نے نہایت لاپروائی سے قصیر کو جواب دیا۔ کہ "تمہارا خیال قابل توجہ نہیں" اس کے بعد زبا کو یہ خط لکھا۔

"پیاری ملکہ۔ تمہارے خط نے میرے دل کو مسخر کر لیا ہے
میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک
حرف میں کس غضب کی کشش ہے۔ میرے لئے اس سے
بڑھکر اور کونسی مسرت ہو سکتی ہے۔ کہ تم جیسی حسین و جمیل
ماہ پیکر اور حور طلعت شہزادی میرے دل و جان کی مالک
بنے۔ تمہارا پیام میرے لئے نسیم بہار اور روح پرور و
نشاط آفرین نوید ہے۔ میری مسرت بے پایاں کا اظہار الفاظ
میں ناممکن ہے۔ اور میں اس پیام کو نہایت فخر اور شکر گزاری
کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔

پچاس غلام اور کنیزیں۔ سو اسلحہ پچیس اسپ۔
پانچ سیر سونا اور ایک صندوقچہ جواہرات باظہار مسرت
امتنان پیش ہیں۔ یہ ناچیز تحائف قبول فرمایئے میں انشاءاللہ
جلد اور بہت جلد حاضر خدمت ہوتا ہوں۔"

اس خط کو ایک معتمد خاص کے حوالہ کیا۔ اور ضروری ہدایات
اس کو دیکر اور جملہ سامان و خدام وغیرہ ہمرکاب کر کے اُدھر اُسے
روانہ کیا اور ادھر دیار حبیب میں جانیکی تیاریاں شروع کیں۔
ایک ہفتہ کے اندر جملہ سامان سفر مہیا اور درست کر کے اور
ایک سو خدام و ملازمین ہمراہ لیکر تزک و احتشام کیساتھ
شہر سے کوچ کیا۔ قیصر مصاحب بھی مثل سایہ کے ہمرکاب
تھا۔ جب بادشاہ دریائے فرات پر پہنچکر کچھ دیر کے لئے
خیمہ زن ہوا۔ تو قصیر نے پھر سمجھایا کہ اب بھی لوٹ چلنا
مناسب ہے۔ لیکن بمصداق "ناصح کی بات سننے کو یاں
کان ہی نہیں ہیں" جذبیہ نے ایک نہ سنی۔ اسی وقت ملکہ زبا
کی جانب سے ایک قاصد بھی کچھ تحائف اور نامۂ شوق
باظہار تشکر و بہجت اور اضطراب دید و سختیٔ انتظار لیکر آ پہنچا
پھر کیا تھا۔ جذبیہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اور چہرہ سے رنگ مسرت
جھلکنے لگا۔ آرزوئیں بیتاب ہو گئیں اور فوراً کوچ کا حکم دیا
گیا۔ خود ایک تیز گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس موقع پر پھر
قصیر نے سمجھایا کہ جہاں پناہ خطرات قوی ہیں۔ یہ سب
ظاہرداری کی باتیں اور زبانی جمع خرچ ہیں۔ حضور کو
ہرگز وہاں نہ جانا چاہیئے۔ مگر جذبیہ نے پھر بھی نہ مانا۔ اور
"اٹھو دیکھا جائیگا" کہکر ٹال دیا۔ قصیر نے کہا "اگر حضور کسی
طرح مانتے ہی نہیں ہیں۔ تو خدا حافظ شوق سے تشریف
لے جایئے۔ مگر کم از کم میرے ایک مشورہ پر تو ضرور عمل
کیجئے۔ اور وہ یہ کہ جب سواری قلعہ کے نیچے پہنچے تو حضور
کو بغور یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ زبا کی فوج کس طریقہ پر استقبال
کرتی ہے۔ اگر فوج سامنے آکر سلامی دے تو کوئی خطرہ
نہیں۔ اور اگر منتشر ہو کر چاروں طرف سے حضور کو حلقہ
میں لے لے۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ دغا ہے۔ دوسری صورت
اگر پیش آئی تو میں حضور کو عصا نامی گھوڑا دونگا۔ حضور اس
پر بیٹھ کر فوراً مجمع سے نکل جائیں۔" قصیر یہ باتیں کرتا جاتا
تھا۔ مگر جذبیہ زبا کے صبا رفتار خیالات میں ڈوبا ہوا تھا

خوش آیند امیدیں اس کے دل میں موجزن تھیں۔ اور خوشنما تصورات اُس کے دماغ میں آ آکر دلفریب مناظر پیش کر رہے تھے۔ اُس نے قصیبر کا ایک لفظ بھی نہ سُنا نہ سمجھا۔ اور اپنے مرکب کو اور بھی تیز کر دیا۔ آخر کار جب جذیمہ قلعہ کے سامنے پہنچا تو ملکہ زبا۔ نے اپنے محل کی کھڑکی میں بیٹھ کر اُس کی سواری کا تماشہ دیکھنا شروع کیا۔ زبا۔ کی فوج نے استقبال کے موقع پر زبا۔ کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ یہ رنگ دیکھ کر قصیبر نے حسب وعدہ عصا نامی گھوڑا پیش کیا۔ مگر جذیمہ زبا۔ کو کھڑکی میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر اور بھی مبہوت ہو چکا تھا اُس نے مطلق توجہ نہ کی۔ اور اشتیاق دید میں تیز تیز آگے بڑھتا چلا گیا۔ قصیبر یہ حالت دیکھ کر اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ دوڑاتا ہُوا نظروں سے اوجھل ہو گیا اب جذیمہ کی کسی قدر آنکھیں کھلیں۔ اور اُس نے قصیبر کو اس طرح پر جاتے ہوئے دیکھ کر کہ "جس کو عصا لیجائے وہ گمراہ نہیں ہو سکتا۔"

بالآخر جذیمہ قلعہ میں داخل ہوا۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں باجے ہر طرف سے بجنے لگے۔ اور تمام رعایا جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔ بادشاہ اس وقت قصر شاہی میں پہنچایا گیا اور تھوڑی دیر میں ملکہ زبا۔ اس شان سے اُس کے پاس پہنچی۔ کہ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئیں۔ ایک بد نما ریشمی قمیص پہنے ہوئے سر پر مرصع تاج اور ہاتھ میں برہنہ تلوار لئے ہوئے بادشاہ نے کُرسی سے اُٹھ نہایت تپاک سے سلام مصافحہ کیا۔ اور پوچھا کیوں خیر ہے؟ زبا۔ نے کہا "الحمد للہ اچھی ہوں۔ ابھی ابھی کچھ پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ میری ایک ہجولی کو دیوانہ کُتّے نے کاٹ کھایا ہے۔ مَیں نے کُتّے کو ہلاک کر دیا ہے۔" اس کے بعد زبا۔ نے چاپلوسی کی باتیں اور مذاق شروع کر دیا۔ اور اسی اثنا میں شراب کا دور چلنے لگا۔ زبا۔ نے اپنے ہاتھ سے جام بھر بھر کر جذیمہ کو دئے اور جب اس کو کسی قدر مدہوش پایا۔ تو زبا۔ نے کہا۔ کہ "سُنا ہے بادشاہوں کا خون سگ گزیدہ کا بہترین علاج ہے کیا آپ تھوڑا سا خون دے سکتے ہیں"۔ جذیمہ نے کہا "بہزار شادمانی و مسرت" زبا۔ نے فصاد کو بلا کر کہا کہ "دونوں ہاتھوں کی فصد کھول دو" چنانچہ اس نے فوراً تعمیل کی۔ اب جذیمہ کی کلائیوں سے خون کے فوارے جاری ہو گئے۔ مگر وہ شاہانہ استقلال سے بیٹھا رہا۔ جذیمہ شراب کے نشہ میں چور ہو چکا تھا۔ اور خون بہ جانے سے بیدم تھوڑی ہی دیر میں بیہوش ہو کر کرسی سے گر پڑا اور گرتے ہی جاں بحق ہو گیا۔

(ترجمہ و ماخوذ)   شریف فکری

لیلےٰ

یا

محاصرۂ غرناطہ

فصل سوم

عاشق و معشوق

(گذشتہ سے پیوستہ)

الحامن سے رخصت ہوکر موسےٰ نے پہاڑی کا رخ کیا جو بروج الحمرا کی بلندی کے مقابل میں سرافراز تھی۔ اور جس کی چوٹی پر اور جس کے پہلوؤں میں شہر کی عشرت پسند آبادی بستی تھی۔ موسےٰ نے وہ راستہ اختیار کیا جس پر نسبتاً خاموشی زیادہ اور آمد و رفت کم تھی۔ پہاڑی کی نصف بلندی طے کرنے کے بعد وہ ایک نیچی اور وسیع دیوار کے مقابل میں پہنچ گیا۔ جو کسی رئیس شہر کے باغ کی فصیل کا کام دیتی تھی۔ وہ دیر تک مشتاق نگاہوں سے اُدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ اور اس مسلسل سکون و سکوت میں یا تو ہوا کے وہ جھونکے رخنہ انداز ہوتے تھے۔ جو کوہ سیرانوادر کی برفانی چوٹیوں سے آآکر انار اور نارنگی کے خوشبودار پتّوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ یا فوّاروں کی نقرئی آب فشاں تھی۔ جو باغ میں ایک مدھم اور مسلسل موسیقی پیدا کر رہی تھی۔ موسےٰ کا دل زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ چشم زدن میں وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اور دوسری طرف اس سبزے کے نرم اور خوبصورت فرش پر کود پڑا۔ جس پر انواع و اقسام کے تیز رنگ پھول مست خواب تھے۔ اور جس پر درختوں کے سبز پتّے اور سنہری پھل اپنا سایہ ڈالے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک مکان کے قریب جا پہنچا۔ جس کی طرز تعمیر سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کے زمانے سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔ یہ عمارت بھاری بھاری اور پرانے ستونوں کی محراب دار چھتوں پر قائم تھی۔ گلاب کے پھولوں

اور گنجان بیلوں نے اس عمارت کا بہت سا حصہ اپنے آغوش عاطفت میں چھپا رکھا تھا۔ محرابوں کے اُوپر چھجا [illegible] تھیں۔ جس کے روبرو وہ ضوفشاں جھروکے تھے۔ جو مابعد میں موری مذاق کے مطابق ایزاد کر دیے گئے تھے۔ صرف ایک جھروکے میں ایک چراغ روشن تھا۔ باقی تمام عمارت پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس حجرے کے سوا عمارت کے بقیہ ساکنین پر فرشتہ خواب حکمران ہے۔ موسےٰ نے دزدیدہ قدموں سے اس جھروکے کی طرف بڑھا۔ اور ایک لمحہ بھر ٹھیر کر یہ گیت دھیمی آواز سے گانے لگا۔ جو بادنےٰ تغیر کسی عربی شاعر کے فکر لطیف اور خیال نازک کا نتیجہ ہے۔

گیت نمبر ۱

اے جان کی روشنی اب جلدی سے ہو خراماں
ہمجولیوں کو اپنے گردوں پہ کر پریشاں
وہ پیاری پیاری آنکھیں مشتاق ان کی ہے جاں
شب بھی بغیر ان کے ہے غمزدہ و حیراں
ہے آیت مقدس خنجر پہ میرے کندہ
صفحہ پہ دل کے لیکن ہے نام تیرا لکھا
ہیں نور و دین ایماں دونوں کے لفظ یکساں
دونوں کا سچ برابر دونوں ہیں پاک یکساں
ہیں دونوں گو کہ یکساں گو پاک ہوں برابر
سچا ہے دل زیادہ۔ تلوار سے بھی بڑھ کر
اے جاں کی روشنی آ ہو مجھ پہ جلوہ فرما
شب کے ستارے تجھ پر کرتے ہیں رشک کیا کیا
وہ شوخ چشم شہلا ہے جان جس پہ شیدا
انجم کو تاب کیا ہے ہوں اس سے ہم اشاو

جب اس کا گیت ختم ہو گیا۔ تو آہستہ سے جھلملی کھلی اور جھروکے میں ایک نازنین دکھائی دی۔

موسےٰ نے کہا "آہ لیلےٰ! میں تجھے دیکھتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجھ پر خدا کی رحمت برس رہی ہے"۔

لیلےٰ نے جواب دیا "خاموش! آہستہ بولو۔ اور یہاں زیادہ مت ٹھیرو۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری ان خفیہ ملاقاتوں کا راز طشت از بام ہونے والا ہے" ساتھ ہی رقت بھری آواز سے کہا۔ "شاید یہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ہو۔

موسےٰ نے بیقراری سے کہا "یا اللہ! میں کیا سن رہا ہوں۔ آخر یہ راز کب تک پردۂ اخفا میں رکھا جائیگا" تو مجھے اپنے حسب و نسب اپنی اصل و نسل پر کیوں مطلع نہیں کرتی؟ عزیز لیلیٰ! کیا تو خیال کر سکتی ہے کہ غرناطہ میں کوئی ایسا عالیشان دودمان بھی ہے۔ جو موسےٰ بن ابی العزان کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے انکار کرے"؟

اس کی آواز کا مغرور لہجہ [illegible] کے نازک ترین راگ میں
ڈوب گیا۔ اور اُس نے کہا۔ "اگر تو مجھے حقیر و ذلیل نہیں سمجھتی۔
تو ہماری محبت و مناکحت میں کون مخل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ
تیری ہستی کے پھول کا رنگ و بو خواہ کسی کہسار کی پیدائش
ہو۔ یا کسی سبزہ زار کی۔ میرے دل کے لئے یکساں باعث
زیب و زینت ہے۔"

لیلےٰ کے آنسو نکل پڑے اور وہ بولی "آہ جس راز کے
انکشاف کے لئے تو مجھ سے شاکی ہے۔ وہ جتنا تیرے
لئے تاریک ہے۔ اتنا ہی میرے لئے مبہم ہے میں بارہا
تجھ سے کہہ چکی ہوں۔ کہ مجھے اپنی پیدائش یا بچپن کا حال
صرف اتنا یاد ہے۔ کہ وہاں کے بیابانوں اور ریگستانوں
میں سدا بہار پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ننھی ننھی روئیدگی
آتشیں آب و ہوا سے مرجھا کر سوکھ جاتی ہے۔ اُسے اونٹ
چرتے پھرتے ہیں۔ مجھے کچھ اپنی ماں بھی یاد ہے۔ جس کی
پُراشتیاق نگاہیں مجھ پر پڑا کرتی تھیں۔ اور جس کے شیریں
نغمے مجھے لوری دے دے کر سلا دیا کرتے تھے۔"

مور نے محبت سے کہا۔ اب تیری ماں کی روح الفت
میرے جسم میں آ بسی ہے۔"

لیلےٰ نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔ "میں یہاں لائی گئی۔
اور اسی چار دیواری میں بچپن سے شباب کو پہنچی۔ میری ذرا ذرا سی
خواہشات کی تکمیل کے لئے ہر وقت کنیزیں حاضر رہتی ہیں

مجھے [illegible] نہیں لیکن [illegible] اس [illegible] دونوں کا تجربہ ہے
مجھ سے کہتے ہیں۔ کہ مجھ پر اس قدر زر و جواہر لٹایا جاتا ہے
جس پر تاجداروں کو رشک آتے لیکن اپنے عزیزوں اور
رشتہ داروں کی نسبت مجھے بہت ہی کم علم ہے میرے والد
کم سخن اور تند مزاج ہیں۔ اور وہ میرے پاس بہت کم بلکہ
بعض اوقات مہینوں بعد آتے ہیں۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں
کہ وہ مجھے بیحد چاہتے ہیں۔ اور پیارے مور سنے جب تک
میں نے تجھے نہ دیکھا تھا۔ میری روشن ترین ساعتیں وہ تھیں۔
جب میرے کان اس کے قدموں کی آہٹ پر لگے رہتے تھے
اور میں دوڑ کر اپنے اُسی ایک شفیق سے بغلگیر ہو جایا کرتی تھی۔"

"کیا تجھے ان کا نام معلوم نہیں؟"

"نہیں۔" "مجھے کیا کسی خانہ زاد کو بھی ان کا نام معلوم
نہیں۔ ہاں ایک غلاموں کا ضعیف و نحیف سردار زمین۔
جس کی نگاہوں سے مجھ پر دہشت اور سکتہ کا عالم طاری ہو جایا
کرتا ہے۔ شاید والد کے نام سے واقف ہے۔"

مور نے کچھ سوچ کر کہا۔ "تعجب ہے۔ اور پھر تو یہ کیسے سمجھتی
ہے۔ کہ ہماری محبت کا راز ظاہر ہو گیا ہے یا اس میں کوئی رخنہ انداز
ہو گا؟"

"دیکھو آہستہ بات کرو۔ زمین آج میرے پاس آیا اور
کہنے لگا۔ کہ بانو باغ میں کسی مرد کے قدموں کے نشان پائے
گئے ہیں۔ اگر تمہارے والد کو اس کا علم ہو گیا۔ تو غرناطہ پر تمہاری

یہ نظر نگاہ واپسیں ہوگی۔ مجھے کانپتے دیکھ کر اس نے ملامت کے لہجے میں کہا کہ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے۔ آپ کو ایک خونخوار شیر سے شادی کرنے کی اجازت باآسانی مل سکتی ہے۔ لیکن آپ کسی موری امیر سے خواہ وہ کیسا ہی عالی خاندان کیوں نہ ہو شادی نہیں کر سکتیں۔ اس نے یہ کہا اور مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔" اس پر لیلےٰ نے بے چینی سے ہاتھ ملکر کہا۔" ہائے موسےٰ میرا دل بیٹھا چلا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی برا شگون ہے جس کا تاریک انجام میری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

"مجھے اپنے والد کے سر کی قسم۔ یہ رکاوٹیں میری آتش شوق پر تیل کا کام کرتی ہیں۔ بام محبت پر چڑھنے میں مجھے خواہ سینکڑوں دشمنوں کی نعشوں کا پشتہ ہی قائم کرنا پڑے۔ مگر میں ضرور جدوجہد کرونگا۔ اور تیری محبت کی منزل راحت پر پہنچے بغیر نہ رہونگا۔"

پرجوش اور بلند حوصلہ موسےٰ نے بمشکل اپنی جوشیلی تقریر ختم کی تھی۔ کہ درختوں کے جھنڈ میں سے کسی مخفی ہاتھ کا پھینکا ہوا ایک تیر زن سے اس کے پاس سے گزرا اور جب تک وہ ہوا جو تیر کی وجہ سے متحرک تھی۔ تیزی سے اس کے رخسار کے ساتھ ٹکرائے تیر کا الٹا ہوا پر اس کے پیچھے کسی درخت کے تنے میں جا گڑا۔

لیلیٰ چلائی " بھاگو بھاگو۔ موسےٰ اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ۔ الہیٰ۔ تو اس کا حامی و مددگار ہونا" یہ کہکر وہ فوراً حجرے کے اندر غائب ہوگئی۔

موسےٰ نے مہلک نشانہ کی پروا نہ کی۔ لیکن اپنی تیز و غضبناک طبیعت کے اقتضا سے مجبور ہو کر وہ دشمن کی جانب پلٹ پڑا۔ تلوار سونت لی۔ غضب کے جذبے میں دبی ہوئی آواز سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ اس سمت کود کر بڑھا۔ جدھر سے تیر آیا تھا۔ موری جنگ و جدال میں کمین گاہوں سے دشمن کو ڈھونڈ نکالنے کی عادی آنکھیں نہایت جنگی اشتیاق سے تاریک اور خاموش پتوں میں سے اس کی جستجو کرنے لگیں۔ لیکن اس کی نگاہیں کسی زندہ ہستی کا سراغ نہ لگا سکیں۔ اور آخر کار وہ مایوس و مجبور واپس آیا۔ اور اس مقام سے رخصت ہوا۔ لیکن جونہی وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف گیا۔ اسے ایک مدھم لیکن صاف اور تیز آواز نے کہا۔

" تجھے زندہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھ تیرا انجام اس سے بھی زیادہ مصیبت ناک ہوگا

(باقی باقی)

ساون رین کا سپنا

مصنّفہ:- ولیم شیکسپیر　　مترجمہ:- سیّد امتیاز علی تاج

باب (۲) دوم

فصل اوّل

ائینا کے قریب ایک جنگل

(گذشتہ سے پیوستہ)

طیطانیا- خاطر جمع رکھو۔ تمام پرستان مجھ سے بچے کو نہیں خرید سکتا۔ اس کی ماں میرے معتقدوں میں سے تھی۔ اور ہندوستان کی معطر سرزمین میں تمام تمام رات وہ میرے پہلو میں بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ ہم سمندر کی زعفرانی ریت پر بیٹھ کر ردے پھندے جہازوں کو طوفانی سمندر پر رخصت ہوتے ہوئے دیکھتے۔ اور جب چنچل ہوا سے بادبان پھول کر کپّا بن جاتے تو اکٹھے قہقہے لگایا کرتے تھے۔ اور اس وقت کہ میرا یہ ننھا خادم اس کے پیٹ میں تھا۔ وہ تیرنے کے انداز میں نہایت حسن کے ساتھ ان جہازوں کی نقل اتارتی۔ میرے لئے یونہی چھوٹی موٹی چیزیں لانے کو زمین پر تیرتی ہوئی سی چلتی۔ اور پھر یوں واپس آتی۔ گویا کسی سفر پر سے سامانِ تجارت لے کر آتی ہے لیکن چونکہ وہ فانی انسان تھی۔ اس بچے کے پیدا ہونے پر مرگئی۔ اور اسی کی خاطر میں اس کے اس بچّے کو پالتی ہوں۔ اور اُسی کی خاطر میں اسے اپنے سے جُدا نہ کرونگی۔

اوبیران- تمہارا اس جنگل میں کتنے عرصے ٹھیرنے کا قصد ہے؟

طیطانیا- غالباً تھیسیوس کی شادی کے تمام ہونے تک اگر تم ہمارے ناچ کے چکّروں میں ہنسی خوشی شریک ہوسکتے ہو۔ اور ہمارے چاندنی راتوں کے مسرور ہنگاموں کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو ہمارے ساتھ آؤ۔ نہیں تو اپنی راہ لو۔ اور میں بھی تمہارے سیر کے مرغوب مقامات میں دخل دینے نہ آؤنگی۔

اوبیران- وہ لڑکا مجھے دیدے۔ میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔

طیطانیا- تیرے تمام پرستان کے بدلے میں بھی نہ دوں۔ پریو۔ چلو۔ میں کچھ دیر اور ٹھیری۔ تو ہماری باقاعدہ لڑائی ہی ہوجائیگی۔

(طیطانیا اپنے خدم وحشم کے ساتھ جاتی ہے)

اوبیران۔ بہت خوب۔ اس وقت جا۔ لیکن جب تک مَیں اس سلوک کا بدلہ نہ لے لونگا۔ تو اس جنگل سے باہر نہ نکلنے پائے گی۔

میرے اچھّے پوک۔ ادھر آ۔ تجھے وہ وقت یاد ہے۔ جب ایک مرتبہ مَیں ایک راس میں بلند چٹان پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اور مَیں نے ایک دخترِ آب کو جو کسی بڑی مچھلی کی پیٹھ پر سوار تھی گیت گاتے ہوئے سُنا تھا۔ وہ ایسے شیریں اور خوش آہنگ گیت گا رہی تھی۔ کہ طوفانی سمندر تک ساکن ہوگیا تھا۔ اور دخترِ آب کا نغمہ سُننے کے لئے بعض ستارے اپنے گُرّوں میں سے دیوانہ وار ٹوٹ رہے تھے۔

پوک۔ مجھے یاد ہے۔

اوبیران۔ تو نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اسی وقت مَیں نے دیکھا تھا۔ کہ زمین اور سرد چاند کے درمیان کیوپڈ اپنے ہتھیاروں سے آراستہ مصروف پرواز ہے۔ سرزمین مغرب کی تاجدار ایک حسین دوشیزہ پر اُس نے شصت باندھی اور اپنی کمان سے عشق کا ایک تیر اس زور سے پھینکا۔ کہ گویا سینکڑوں اور ہزاروں دلوں کو چھید ڈالیگا۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ نوجوان کیوپڈ کا آتشیں تیر رقیق چاند کی عفیف شعاعوں میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور پاک دامن ملکہ اپنی دوشیزگی کی سوچ میں محبّت کے اثر سے بے نیاز گزر گئی لیکن مَیں نے اس جگہ کا خیال رکھا۔ جہاں کیوپڈ کا تیر گرا تھا۔ وہ ایک ننھے سے مغربی پھول پر گرا۔ جو پہلے دودھ سا سفید تھا۔ لیکن اب محبّت کے زخم سے ارغوانی بن گیا تھا۔ اور دوشیزہ لڑکیاں اسے دلارام کہتی ہیں۔ وہ بوٹی مَیں نے ایک مرتبہ تجھ کو دکھائی تھی۔ اس کا پُھول مجھے لا کر دے۔ اس کا عطر اگر خوابیدہ آنکھوں پر ڈال دیا جاتے۔ تو مرد ہو خواہ عورت پھر جس جاندار ہستی کو سب سے پہلے دیکھ لیں گے۔ اُسے دیوانہ وار چاہنے لگیں گے۔ یہ بوٹی میرے لئے لے آ۔ اور دیکھ۔ نہنگ ایک فرسنگ تیرنے نہ پاتے۔ کہ پھر واپس آ موجود ہو۔

پوک۔ چالیس منٹ میں مَیں دُنیا بھر کا چکّر لگا ڈالوں گا۔

(پوک جاتا ہے)

اوبیران۔ ایک دفعہ یہ عطر مل گیا۔ تو پھر مَیں تاک میں رہوں گا۔ کہ طیطانیا سوتی کب ہے۔ اور بس تب یہ عطر اس کی آنکھوں میں ڈال دُونگا۔ آنکھ کُھلنے پر جس چیز کو وہ سب سے پہلے دیکھے۔ شیر ہو یا ریچھ۔ بھیڑ ہو یا بھینسا۔ شوخ بندر ہو یا مصروف لنگور۔ وہ دل و جان سے اس کو چاہنے لگے۔ اور اس کی آنکھوں پر سے یہ طلسم ہٹانے سے پہلے جو ایک دوسری بوٹی سے ممکن ہے۔ مَیں اس کا خادم اس سے وصول کر لونگا۔ لیکن یہ کون آرہا ہے۔ مَیں انہیں نظر نہ پڑونگا۔ اور ان کی گفتگو سُنتا رہونگا۔

[ڈیمیٹریس اور اس کے پیچھے پیچھے ہیلینا داخل ہوتی ہے]

ذیمیتریوس۔ مجھے تجھ سے محبت نہیں ہے۔ بس میرا پیچھا مت کر۔ لسندر اور حسین ہرمیا کہاں ہیں۔ ایک کو میں مار ڈالوں گا۔ دوسری مجھے مارے ڈالتی ہے۔ تو نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ وہ اس جنگل میں بھاگ کر آتے ہیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔ اور اپنی ہرمیا سے نہ مل سکنے کے باعث اس بیابان میں دیوانہ ہوا جا رہا ہوں۔ جا دُور ہو جا میرا پیچھا نہ کر۔

ہلینا۔ سنگدل تجھ میں میرے لئے تو کشش ہے۔ لیکن لوہے کے لئے کشش نہیں ہے۔ کہ میری محبت میں فولاد سے مستقل دل کو کھینچ لے۔ تو اپنی کشش کی طاقت چھوڑ دے پھر مجھ میں تیرا پیچھا کرنے کی قابلیت ہی نہ رہیگی۔

ذیمیتریوس۔ کیا میں تجھے ورغلاتا ہوں؟ کب میں نے تجھ کو لبھانے والی باتیں کی ہیں؟ بلکہ میں نے سچ سچ تجھ سے نہیں کہا۔ کہ نہ میں تجھ کو چاہتا ہوں۔ نہ چاہ سکتا ہوں

ہلینا۔ اور اس حالت میں بھی میں تجھ سے اور زیادہ محبت کرتی ہوں۔ میں تیرے کُتّے کی طرح ہوں۔ اور ذیمیتریوس جتنا تو مجھ کو مارے گا میں اتنی ہی اور عاجزی کرونگی۔ مجھے اپنے کُتّے کی طرح رکھ۔ مجھے ٹھکرا۔ مجھے مار۔ مجھے بھلا ڈال۔ مجھے کھو ڈال۔ صرف اتنی اجازت دے۔ کہ میں جیسی گئی گزری ہوں۔ تیرے نقش قدم پر چلتی رہوں تیری محبت میں میں اس سے ذلیل اور کس بات کی التجا کروں اور یہ بھی میرے لئے بڑی عزت ہے۔ کہ تو مجھ سے وہی سلوک کرے۔ جو تو اپنے کُتّے سے کرتا ہے۔

ذیمیتریوس۔ مجھے اپنے سے اور زیادہ متنفر نہ کر کیونکہ میں تجھے دیکھ پاتا ہوں۔ تو زندگی سے بیزار ہو جاتا ہوں۔

ہلینا۔ اور میں تجھے دیکھ نہیں پاتی۔ تو زندگی سے بیزار ہو جاتی ہوں۔

ذیمیتریوس۔ اس رویہ سے تمہاری شرم وحیا پر انگلیاں اٹھیں گی۔ کہ شہر سے نکل کر اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں سونپ رہی ہو۔ جو تم سے محبت نہیں کرتا۔ رات کے موقع اور اس اکیلی جگہ کی ترغیبوں میں اپنے کنوارپن کی دولت کو محفوظ سمجھ رہی ہو۔

ہلینا۔ تمہاری خصلت نے مجھے اس کا حق دے دیا ہے جب میں تمہارا چہرہ دیکھتی ہوں۔ تو پھر رات نہیں رہتی۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں۔ کہ یہ رات نہیں ہے۔ اس جنگل میں دُنیا والوں کی بھی کمی نہیں۔ کیونکہ میرے لئے تو تمام دُنیا تم ہو۔ جب یہاں تمام دُنیا مجھے دیکھ رہی ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کہ میں تنہا ہوں۔

ذیمیتریوس۔ میں تیرے پاس سے بھاگ کر جھاڑیوں میں جا چھپونگا۔ اور تجھے وحشی درندوں کے رحم پر چھوڑ جاؤنگا

ہلینا۔ تیرے جیسا دل تو سب سے وحشی درندے کا بھی نہیں ہے۔ جب تیرا دل چاہے بھاگ جا۔ پھر لوگ یوں بیان کیا کریں گے۔ کہ اپالو بھاگتا ہے۔ اور ڈیفنی اس کا

تعاقب کیا کرتی ہے۔ شکرا باز کا پیچھا کیا کرتا ہے۔ اور حلیم ہرنی شیر کے پکڑ لینے کو دوڑا کرتی ہے۔ بے سود تعاقب ہے۔ اگر بہادری بھاگ رہی ہو۔ اور بزدلی اس کا پیچھا کر رہی ہو۔

ذیمترئیس۔ مَیں تجھ سے دلیلیں نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے جانے دے۔ اگر تو نے میرا پیچھا کیا۔ تو یقین آئے نہ آئے سُن رکھ مَیں بری طرح پیش آؤنگا۔

ہلینا۔ مندر، شہر، جنگل ہر کہیں تم مجھ سے بُری طرح پیش آتے ہو۔ شرم کرو۔ ذیمترئیس۔ تمہارا ظلم میری جبین پر داغ لگا رہا ہے۔ مردوں کی طرح ہم محبت کے لئے لڑ نہیں سکتے۔ ہم مطلوب بننے کے لئے ہیں۔ طالب بننے کو پیدا نہیں ہوئے۔

[ذیمترئیس جاتا ہے] مَیں تیرا پیچھا کرونگی۔ اور جس ہاتھ سے محبت کرتی ہوں۔ اس سے اپنی موت کو پُہنچ کر جہنم کو اپنے لئے جنت بنا لوں گی۔ [ہلینا جاتی ہے]

اوبیران۔ حسین دوشیزہ۔ خدا حافظ۔ اس جنگل سے نکلنے سے پیشتر تو اس کے آگے بھاگ رہی ہوگی۔ اور وہ تیری محبت میں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔

[پوک واپس آتا ہے]

آوارہ گرد پوک۔ خوب آیا۔ پھُول تجھے مل گیا؟

پوک۔ ہاں یہ رہا۔

اوبیران۔ لا مجھے دے۔ مجھے ایک جگہ معلوم ہے جہاں جنگل کی سورج مکھی کھلتی ہے۔ اور گاؤزبان اور شرمیلا بنفشہ پیدا ہوتا ہے۔ جہاں عطر عشق پیچان اور نسرین اور مشک بیز گلاب نے ایک سائبان سا بنا رکھا ہے۔ وہاں اکثر رات کو طیطانیا ان پھولوں کے درمیان ناچ اور خوشبوں سے مدہوش ہو کر سویا کرتی ہے۔ اور وہاں سانپ اپنی چمکتی ہُوئی کینچلی اُتارتا ہے۔ جو ایک پری کے لپیٹ لینے کو بہت کافی لباس ہے۔ اس پھول کا عطر مَیں اس کی آنکھوں پر لگا دُونگا۔ اور اُس کا دماغ نفرت انگیز محبت سے بھر دوں گا۔ اس میں سے کچھ تو لیجا اور اس جنگل میں تلاش کر۔ ایک حسین اثینی عورت ایک مغرور نوجوان پر عاشق ہے۔ نوجوان کی آنکھوں پر یہ عطر مل دے۔ لیکن اس وقت جب کہ سب سے پہلی چیز جو اُسے نظر آئے۔ وہی عورت ہو۔ تو مرد کو اثینی لباس سے پہچان لے گا۔ احتیاط سے اس حکم کی تعمیل کر۔ تاکہ جتنا وہ اُسے چاہتی ہے۔ مرد اس سے بھی زیادہ اس کا گرویدہ ہو جائے۔ اور دیکھ مرغ کی پہلی اذان سے پیشتر میرے پاس واپس آجانا۔

پوک۔ بے فکر رہئے۔ میرے حضور۔ غلام ایسا ہی کرے گا۔

[دونوں جاتے ہیں]

"بہار و کوئل"

بہار

اِدھر بہار نے آکر چمن میں پاؤں دھرا
اِدھر نسیم نے اک سبز آگ دھکا دی
اِدھر نو کونپلوں میں زرد سُرخ آگ لگی
جو آئی رات تو شبنم نے آکے چھینٹا دیا
چنگیریں بھر کے صبا کلیاں رولانے لگی
ہر ایک بزم چمن میں ہے آج مست بہا
خمِ نسیم سے صہبائے رنگ ڈھلنے لگے
ہر ایک پھول کی پتّی ہے ساز کا پردہ
تمام تارِ نظر ہو گئے رباب کے تار
نگہ کا تار ہے گر جادۂ سرِ منزل
چراغِ ساحلِ دریائے حُسن ہیں پھول

اُدھر نقوشِ قدم سے تھا چپہ چپہ ہرا
اُدھر شمیم نے محفلِ صبا کی مہکا دی
ہوا سے بھڑکی تو پتّوں کے مُنہ پہ سبزی کھڑی
بھڑکتی آگ پہ گویا کہ تیل چھڑکا یا
صبا اُٹھا کے انہیں گود میں کھلانے لگی
ہر ایک دیدۂ گل سے ٹپک رہا ہے خمار
مئے شمیم اِدھر ساغروں میں چلنے لگے
ہے جوئبار کی ہر موج مرأتِ نغمہ
کہ نغمہ ریز ہوئے جن سے زخمہ ہائے بہا
چراغِ گل ہے ہر ایک سمت رہبرِ راحل
سبوئے مستیٔ صہبائے حُسن ہیں یہ پھول

کوئل

شرر سے پھول کے کوئل کا کوئلہ دھکا
یہ کوک گیا ہے کہ بن دیکھی تارِ برقی ہے
بس ایک کوک نے سب کوئلوں کو کوک دیا
صدا میں اس کی بھڑک ہے تڑپ ہے بھڑکن ہے
بھنور ہے زور کا چڑھتا ہوا بگولہ ہے۔
سروں کی موج ہے طوفان ہے بہاؤ ہے
ہے گھاٹ تیغ کا تلوار کی لچک ہے یہ
ہے اس کا کوکنا بوچھاڑ ایک تیروں کی
لہک کے کوکنا اس کا جھڑی ہے ساون کی

اور اُس کی کوک سے چنگاریوں کا تار بندھا
کہ پیڑ پیڑ میں کوئل بڑی بھڑکتی ہے
لگائی آگ کسی نے کسی کو پھونک دیا
لہر ہے بجلی کی آواز کی یہ ناگن ہے
سروں میں پڑتا ہے آواز میں جو اُٹھتا ہے
بڑی تھپیڑا دل پہ آواز کے یہ ناؤ ہے
زبانِ شعلۂ آواز کی لپک ہے یہ
کمان سے چونچ کے جو صیدِ دل پہ ہوتی
جو دھیمی بولے تو بالکل بھرن ہے بھادوں کی

چراغِ نغمہ کا جسم اس کا گویا سایہ ہے
یہ وہ چراغ ہے جس کے تلے اندھیرا ہے

سُویدا یہ تو گلستاں بہار کا دل ہے
جو جسمِ طور ہے آواز اس کی بجلی ہے
سیاہ رات بدن۔ چاندنی کھلی آواز
شبِ سیہ میں کلی تاروں کی چٹکتی ہے

مگر یہ عارضِ حسنِ بہار کا تل ہے
کہ جس نے سرمہ کیا گویا وہ تجلّی ہے
سحابِ خامشی میں غرفۂ ترنم باز
گلِ عدم کی مہک ہستی میں بھٹکتی ہے

سیاہ پتلی کا تارِ نظر ہے نغمہ صفات
رواں ہے چشمۂ ظلمات سے یہ آبِ حیات

آصف

غزل

ہم آں داغے کہ بردل از تو دارم حرزِ جانم شد
ہم آں چشمے کہ نامندش سخنگو راز دارم شد

دلے بود و در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم از سرگزشت و آسمانم شد

بپرس اے داورِ محشر چہ مے پرسی چہ میپرسی
نگاہِ حسرت آلایم کہ مے بینی بیانم شد

نگہ دزدیدہ افگندی بدل چوں رازِ جاں دارم
نظر کردی بہ بیباکی و فصلِ داستانم شد

دگر قدحِ جنوں در دہ کہ ہم در منزلِ اوّل
خیالِ وحشتم وا ماند و گردِ کاروانم شد

(پطرس)

ہزار داستان

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

جلد ۱ | اشاعت اوّل ماہِ ستمبر ۱۹۲۲ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

صفحۂ جمیل:۔ کلام پطرس

دریا بحباب اندر

(صفحۂ ادارت)

اگر اُن رسوم و عوائد کی تقلید کروں۔ جو ایسے مواقع پر اربابِ صحافت کے یہاں ناگزیر سے خیال کئے جاتے ہیں، تو موجودہ اشاعت کی ترتیب کے ضمن میں مجھے عرض کرنا پڑیگا۔ کہ ایڈیٹر صاحب ہزار داستان، چونکہ بعض ضرورسات کی بنا پر شملہ تشریف لے گئے ہیں۔ اگر صاحب موصوف شملہ تشریف نہ لے جاتے۔ تو اس اشاعت کی زیب و زینت میں کوئی نہ کوئی فروغ ضرور پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ میں بہر نوع اپنے عزیز و محترم ایڈیٹر کا تفوق تسلیم کرتا ہوں +

جناب سید امتیاز علی تاج بی۔ اے جو آجکل دو ہفتہ وار رسائل کو تنہا ایڈٹ فرمانے سے بہت کم فرصت ہوگئے ہیں، اس مرتبہ ساون رین کا سپنا عنایت فرمانے میں معذور ہیں اور اس انقطاع تسلسل کی تلافی موصوف نے اس طرح فرما دی ہے۔ کہ ایک ایکٹ کا ڈراما موسومہ "گلابی ساڑی" اس اشاعت کیلئے عنایت فرمایا ہے۔ مضمون مذکور کی شوخیٔ عنوان ہی ناظرین کی نگاہوں کو شاداب بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھی تلافی ہے +

اُردو رسائل میں، فارسی کلام، اگر مجھے نظر آتا ہے۔ تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر آج میرا ذوق مجھے مجبور کر رہا ہے، کہ جناب "پطرس" کی ایک فارسی غزل ہزار داستان میں شائع کرتا ہوں۔ اور یہ اس کلام ہی کا سحر و اعجاز سمجھنا چاہئے۔ تا دلیں تو ترمیم اصول کے لئے بہت ہو سکتی ہیں لیکن میں اس حقیقت تاثر ہی کو کیوں نہ بے نقاب کر دوں، جو اس غزل اور اس غزل کے اس شعر

دلے بود، در آغوشم نگنجید و جہانم شد
خیالے داشتم، از سر گذشت و آسمانم شد

سے میرے قلب میں روشن ہو گئی ہے۔ جناب "پطرس" جن کا مخصوص احترام، میری نگاہوں میں ہے۔ دماغ نہیں بلکہ جوہر قابل رکھتے ہیں۔ اور ادبیات میں زیادہ تر مزاحی مضامین کے حجاب میں جلوہ فرما ہوا کرتے ہیں۔ آج اس غزل سے تغزل کی تجلیات میں، ناظرین اُن کا نظارہ فرمائیں اور دیکھیں، کہ بیدل اور غالب کے بعد بھی، قدرت نے عالی خیال اور پُر جوش وجدان کے لوگ پیدا کرنے بند نہیں کئے۔

اس کلام کی صفحۂ جمیل سے کوئی عزّت و داد مقصود نہیں، بلکہ یہ کلام "صفحۂ جمیل" کے لئے جمال ہے +

اب کی اشاعت میں جناب سید عابد علی صاحب اور جناب حکیم یوسف حسن صاحب کے افسانے، ہزار داستان کے لئے نئے ہیں۔ ہم دونوں حضرات کے ذوق کی داد اور دلچسپی کا شکریہ پیش کرتے ہیں +

جس طرح عشاق کو محبوب کی ستم رانیوں کا گلہ کبھی فراموش نہیں ہوتا، اُسی طرح ہمارے رسائل، کتابت و طباعت کی مشقِ ستم سے شاید ہی کبھی محفوظ رہ سکیں۔ اور اب یہ داستان اسقدر طویل اور کثیر الذکر ہو گئی ہے کہ اردو شعراء کا افسانۂ زلف غالباً اس سے مختصر تر ہے۔ اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکی گرفت ہی نہ ہو۔ لیکن مصنفین اور مضمون نگاروں کو جو تکلیف ان غلطیوں سے ہوتی ہے۔ اُس کا کچھ اندازہ، عام ناظرین نہیں فرما سکتے۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کا مضمون "محبت کی پسپائی" جو ہزار داستان کے چوتھے نمبر میں شائع ہوا ہے کتابت کی غلطیوں کا فریادی ہے جسکی تصحیح حسب ذیل ہے۔ صفحہ ۳۱ کالم ۱ آخری سطر مولانا محمد علی جیسا سو برس۔ صفحہ ۳۱ کالم ۲۔ ۱۳ ویں سطر بجائے الفت سلطنت۔ صفحہ ۳۳ کالم ۱ ۔ ۱ ویں سطر بجائے ترک "ترسا"۔ اگرچہ ہمارے کاتب منشی نور احمد صاحب سے اس قسم کی غلطیوں کا کبھی گمان نہیں کیا جا سکتا [illegible]

جائنٹ ایڈیٹر

عورت کی دُنیا

مرد کی دُنیا کیا ہے؟ تمام کُرّۂ ارض! انہیں اس سے بھی زیادہ، آسمان کی تمام ستاروں کی دُنیا! انہیں وہ کچھ اس سے بھی سوا چاہتا ہے۔ وہ جنت الفردوس لیکر بھی مشکل ہی سے صبر کریگا۔ اسی لئے وہ خدائی بھی کبھی کبھی کر بیٹھتا ہے۔ مرد کی دُنیا میں ہر ایک چیز شامل ہے وُہ قارون کا خزانہ چاہتا ہے، مضبوط جسم مانگتا ہے کھانے کو انواع و اقسام کی چیزیں طلب کرتا ہے عیش و عشرت کے لئے بہترین لوازمات دُنیاوی کا طالب ہے۔ عورتیں، تھیٹر، ناچ گھر، تماشے، کتابیں۔ اخبار۔ موٹر گاڑیاں، الغرض وہ بہت کچھ چاہتا ہے۔ اس قدر زیادہ کہ اس جگہ اُن کی تفصیل محال ہے۔ یہ مرد کا دائرۂ عمل و دورِ حیات ہے۔ یہ مرد کی دُنیا ہے لیکن کبھی اس بات پر بھی غور کیا گیا ہے کہ عورت کی دُنیا کیا ہے؟

گھرر گھرر ررر . . . . . .

ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجتی ہے۔

ایک خوبصورت لیڈی جو ریشمی لمبا چوغہ پہنے ہوئے تھی۔ جلدی سے آرام کرسی سے اُٹھی۔ اُس کا بوٹ قالین میں گھسا جاتا تھا۔

”کون ہے؟ اچھا آپ۔ میرے . . . جلد ہی۔ چار بج چکے ہیں۔ مَیں انتظار کرتے کرتے تنگ آگئی ہوں۔

خُدارا جلدی آؤ۔ بہت جلدی مَیں ہوں آپکی ایلن“

ایلن نے اطمینان کا سانس لیا پھر وہ جلدی جلدی سنگار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ آئینہ میں ایک عورت سبز ریشمی فراک میں نظر آئی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور ناک لمبی تھی۔ چہرہ پر جھرّیاں نہ تھیں۔ اور جوان معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ سُرخ و سپید تھا۔ اور بال خلاف معمول سیاہ تھے۔ اُس نے دل میں کہا۔ اس وقت میری عمر پچیس سال سے کم معلوم ہوتی ہے۔

ابھی اس کے پیارے ہملٹن کے آنے میں دو گھنٹہ کا وقفہ تھا۔ یہ وقت کٹتے تو کیونکر۔ وہ کتاب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہوگئی لیکن کتاب کا مضمون اس کی توجہ کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا اُس نے کتاب بند کر دی۔ اور کھڑکی میں کھڑی ہو کر موسم بہار کی رنگینیاں دیکھنے لگی۔ اُس کے مکان کے سامنے ایک سبزہ زار تھا جس میں کئی قسم کے رنگین پھول موسم بہار کی شباب آرائیوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ ایلیا آہستہ آہستہ ان پھولوں کو دیکھتی ہوئی اُس کے مکان کی طرف آرہی ہے۔

ایلن ایملیا کو دیکھکر خوش ہُوئی اور کہنے لگی۔ کہ اس نوخیز
چھوکری کو مَیں آج چند ضروری باتیں بتلاؤنگی مَیں اسکو اپنی
محبت کا قصہ سُنا کر اپنے آج ہونے والے نکاح سے
خبردار کرونگی۔ اور جب یہ میرے پیارے خوبصورت ہملٹن کو
دیکھے گی۔ تو ضرور مجھ کو مبارکباد دیگی۔

"آہا ہا۔ ایملیا تم آج بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہو تُمنے
کیا خوبصورت نیا جوڑا زیب بدن کیا ہے"

ایملیا۔ اور ایلن تُم بھی تو آج دُلہن بنی ہُوئی ہو۔

ایلن۔ آؤ میرے پاس بیٹھو مَیں تُم کو ضروری خبر سُناؤنگی۔

ایملیا۔ کیا دوسرے خاوند کی تلاش میں کامیابی ہوگئی۔

ایلن۔ شادی ایک قسم کا جنجال ہے۔ مرد صرف عورتوں کو تباہ
کرنے کے لئے شادی کرتے ہیں۔ ایملیا تم کو معلوم ہے۔ کہ میرا
پہلا خاوند جس کو مرے ہوئے آج . . . . . .

ایملیا۔ دو سال ہو چکے ہونگے۔

ایلن۔ ہاں دو سال ہو چکے ہونگے۔ اس عرصہ میں کم و بیش
تیرہ مردوں نے محبت کی ہے۔ اور مَیں اُن سے محبت کرتی
رہی ہوں۔ لیکن جب شادی کا وعدہ کیا۔ تو پھر کوئی بھی پُورا
نہ کر سکا معلوم نہیں۔ کہ مردوں کو شادی سے کیوں نفرت ہے

ایملیا۔ آخر اس کا بھی کوئی سبب؟

ایلن۔ اصل میں بات یہ ہے۔ کہ جبتک مرد محبت کا اظہار
کرتا ہے۔ عورت کو دوسرے محبت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے
جونہی عورت نے محبت کا اظہار کیا۔ بس مردوں کی حالت ہی
بدل جاتی ہے پھر وہ عورت پر فتح سمجھکر اُن کو اپنا غلام سمجھتے
ہیں۔ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے۔ اور اُن کو خراب کرتے، دھوکہ
دیتے اور تمام دُنیا کی مُصیبتیں نازل کرتے ہیں۔

یہ شادی اور محبت مجھے تو ایک قسم کی جہالت معلوم ہوتی
ہے۔ یہ مرد ہمارے حسن کو زبانی جمع خرچ سے خریدنا چاہتے
ہیں۔ لاکھوں عورتیں ان ظالموں کے حرص و آز پر قربان
ہو چکی ہیں۔

ایملیا کے سرخ سرخ ہونٹ اور گلابی رُخسارے زرد
ہوگئے۔ اُس کی آنکھوں کی شوخی و شرارت مدھم پڑگئی۔ وہ
کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ لیکن پھر کچھ خیال آنے پر بولی۔

"تو تُم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب شادی نہ کروگی"!

ایلن۔ نہیں خلاف معمول یہ تیرھواں دوست میرے
اظہار محبت پر بھی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور آج چھ بجے
کا وقت مقرر ہے۔

ایملیا۔ مَیں تمہاری کامیابی پر تم کو مبارکباد کہتی ہوں۔

ایلن۔ اور مَیں تم کو مشورہ دیتی ہوں۔ کہ تُم کبھی ایسی غلطی نہ کرنا
ورنہ کامیابی مشکل ہوگی۔

ایلن۔ کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔ میری ننھی تیتری۔

ایملیا۔ اور اگرچہ مجھے اپنے پیارے سے عشق ہے لیکن
مَیں نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا۔

ایلن۔ گویا تم نے دُنیا کو جیت لیا ہے۔ لیکن تمہارے پیارے کا نام۔

ایملیا۔ پہلے تم اپنے ہونے والے خاوند کا نام لو۔

ایلن۔ اس کا نام مسٹر ہملٹن ہے۔

ایملیا کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے۔ آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگے۔ اور اس کے برف کی طرح سے سفید چہرہ کے گرد ہالہ بن گئے۔ اُس نے ایک دفعہ ایلن پر مضطربانہ نظر ڈالی اور بجلی کی طرح سے کمرہ سے باہر نکل گئی۔

گاؤں میں ایک ہی ہملٹن تھا۔ دوسرا نہیں تھا ایملیا سمجھ گئی۔ کہ اس سے محبّت کرنے والا ایلن سے شادی کرنے والا ہے۔ وہ اس صدمہ سے دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر پہنچکر بستر پر بیہوش گر پڑی۔

جب اُس کو ہوش آیا تو رات بہت جا چکی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بے ترتیبی سے بکھر رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بستر سے اُٹھی۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے حسن کو دیکھنے لگی۔ اُس نے اپنے قیمتی لباس کو اُتار کر رکھ دیا۔ جو اُس کے پیارے ہملٹن نے اُس کے لئے خاص طور پر تیار کروایا تھا۔ اُس نے ایک سفید چوغہ پہنا۔ مُنہ دھویا۔ اور اپنی خادمہ کو بلا کر پوچھا۔ کہ کیا آج مس ایلن کی شادی کسی سے ہوئی ہے۔

خادمہ نے کہا کہ نہیں۔ ایلن کی ایک ملازمہ نے مجھ سے کہا ہے۔ کہ جس شخص سے شادی کا وقت مقرر ہو چکا تھا ٹھیک وقت پر اس کا رقعہ پہنچا۔ کہ وہ شادی نہیں کر سکتا۔

ایملیا نے بے چینی سے پوچھا۔ کیا کیا تم سچ کہتی ہو۔

خادمہ۔ جی حضور مَیں نے اور سب لوگوں سے ایسا ہی سُنا ہے۔

مسٹر ہملٹن۔ اور مَیں خود یہ خوشخبری سُنانے کے لئے آیا ہوں میری اچھی ایملیا۔

ایملیا۔ دوڑ کر ہملٹن سے لپٹ گئی۔

اور زار و قطار رونے لگی۔

ہملٹن۔ دیکھو پیاری اس رونے دھونے کو بند کرو۔ مس ایلن مجھ سے محبّت کر رہی تھی۔ اور مَیں نے آج تک اس کا دل نہیں توڑا تھا لیکن اب مجبوراً صاف صاف کہنا پڑا۔ میری پیاری دیکھو مَیں تمہارے سوا اور کسی سے شادی نہ کرونگا مَیں تم کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ جونہی کہ مَیں اپنے موجودہ عہدہ پر مستقل ہو گیا۔ تو مَیں تم سے ضرور شادی کرونگا۔

اس کے بعد ہملٹن اس ماہ شیرہ کو منا تا رہا۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے قطرے جو اس کے رُخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔ خشک ہو گئے۔

اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا لیکن ابھی تک ہملٹن نے

ایملیا سے شادی نہیں کی۔ آج کا دن گویا اُن کے پیار و محبت کے دوسرے سال کا اختتام اور تیسرے سال کی ابتدا کا تھا۔ ایملیا شادی کے تقاضوں سے تنگ آ چکی تھی۔ آج اُس نے محسوس کیا کہ نتیجۂ آلودگی سے اس کے پیٹ میں زندہ بار ہے اور وہ اپنی عصمت کو برباد کرنے کا مستقل نشان حاصل کر چکی ہے۔ وہ رات بھر روتی رہی۔ اور خدا کے سامنے سر بسجود ہو کر دُعا مانگتی رہی۔ کہ اس کا پیارا اب اُس سے جلدی شادی کرے تاکہ وہ لوگوں کی طعن و تشنیع سے محفوظ و مامون رہے۔

آج کی صبح ہولناک تھی۔ آسمان پر ایک ابرِ غلیظ چھایا ہوا تھا۔ آفتاب عالمتاب کا چہرہ نقاب پوش۔ شاید وہ دُنیا میں مردوں کے مظالم کے نتائج دیکھنے سے متنفر ہو گا۔ لندن پر ایک گلیم لپٹی ہوئی تھی۔ اور طوفانی موسم کی آمد کا ہر لحظہ انتظار کیا جا رہا تھا۔ ایملیا رات بھر دُعاؤں میں مصروف رہنے کی وجہ سے آج صبح تک سوتی رہی۔ اس وقت دس بج چکے تھے۔ اس کا پیارا ہملٹن روز دس بجے اُس کی ملاقات کو آیا کرتا تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اُس کو خواب سے جگانے کی تدبیر کی۔ چنانچہ ایملیا بیدار ہوئی۔ اور ہملٹن سے فرطِ محبت سے لپٹ گئی۔

ایملیا۔ اوہو۔ آج میں بہت دیر سے جاگی ہوں، دس بج چکے؟

ہملٹن۔ تم آج اتنی دیر تک کیوں سوتی رہی ہو؟

ایملیا۔ میں رات بھر دعا مانگتی رہی ہوں۔ کہ خدا تم کو جلدی مستقل کر دے۔ تاکہ ہم شادی کر لیں۔

ہملٹن کا سینہ اُبھرا اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ ایملیا کے سچے الفاظ نے اُسکے دل پر تیر و نشتر کی طرح سے چرکا لگایا۔ اُس نے تھرتھراتی آواز سے کہا۔ یہ تمہاری سچی محبت کا ثبوت ہے! اب ہملٹن کے ہونٹ ایملیا کے ہونٹوں میں پیوست ہو چکے تھے۔ کہ عین جوش کی حالت میں ایملیا نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ پیارے ہملٹن اب ہمیں فی الفور شادی کر لینی چاہیئے۔

ہملٹن۔ پیاری تھوڑا اور انتظار کرو۔

ایملیا نے باہیں ہملٹن کے گلے میں ڈال دیں۔ اور تمام اُلفت و پیار کو یکجا کر کے نہایت لجاجت سے کہا۔

"پیارے ہملٹن تم یہ سُنکر خوش ہو گے۔ کہ میں پیار و محبت کی زندہ نشانی کی حامل ہوں۔ اور اس مسرت و شادمانی کے موقع پر ہمیں فی الفور شادی کر لینی چاہیئے۔ تاکہ . . . آنیوالی رُوح کا ہم اور تمام عالم عزت کے ساتھ استقبال کر سکیں"۔

اس وقت ہملٹن کے ہونٹ ایملیا کے رخساروں پر جمے ہوئے تھے۔ ایملیا نے محسوس کیا۔ کہ ہملٹن کے ہونٹ جو جوشِ محبت سے گرم تھے۔ اب برف کی طرح سے یخ ہو گئے ہیں۔ وہ گھبرا گئی

اور اُس نے اپنی کلائیاں اُس کی گردن سے نکال کر اپنی زلفوں کو اپنے چہرے سے ہٹا کر اپنی پرنم آنکھوں کو جبراً کھول کر اُس کے چہرے کی طرف پورے غور و توجہ سے دیکھا۔

ایملیا رحم و التجا کی مجسم تصویر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محبت اپنی آخری بھیک مانگ رہی ہے۔

لیکن افسوس ہے۔ کہ ایملیا نے محسوس کیا۔ کہ اس کے سامنے ایک دوسرا ہملٹن کھڑا ہے۔ تمام عشق اُس کے جسم سے رُوح کی مانند رخصت ہو رہا ہے۔ اور وہ بے جان لاش کی طرح سے تنا کھڑا ہے۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ وہ ایملیا سے علیحدہ کھڑا ہو گیا۔

ایملیا دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اور جس طرح سے جانکنی کے وقت موت اور زندگی میں جنگ ہوتی ہے۔ انسان ہچکیاں لیتا ہے۔ ٹھیک اس طرح سے ایملیا کی محبت اپنے آخری سانس لیتی ہوئی امید و بیم کی حالت میں ظالم انسان کے سوئے ہوئے رحم و انصاف کو جگا کر اپیل کر رہی تھی۔

ایملیا نے کہا "تم خاموش کیوں ہو گئے ہو"۔

ہملٹن۔ مجھے اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ تم حاملہ ہو۔

ایملیا۔ لیکن اب شادی سے آپ کو کیوں انکار ہے۔

ہملٹن۔ ایملیا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مَیں تم سے شادی نہیں کر سکتا میں کسی بڑے خاندان میں شادی کرونگا۔ البتہ مَیں تم سے تعلقات رکھونگا۔ اور تمہاری ضروریات کو فراخدلی سے ہمیشہ پورا کرتا رہوں گا۔

ایملیا کے کانوں میں ایلین کی باتیں گونجنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ ایلین اور اُس میں کچھ بھی فرق نہیں۔ اور فرق ہے بھی ایلین نے کئی مردوں سے شادی کے لئے محبت کی لیکن ایملیا نے ہملٹن سے تعلق پیدا کیا تھا۔ ایملیا پر اس صدمہ سے پوری دیوانگی چھا گئی۔ اُس نے غم و غصّہ سے چیخ کر چاہا کہ ہملٹن کے رُخسار نوچ ڈالے۔ اُس کا گلا پکڑ کر دبائے لیکن وہ کچھ سوچ کر بیٹھ گئی اور ہملٹن کی طرف مُنہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور رحم کے لئے خدا سے دُعا مانگی۔

اُس وقت ایملیا کی حالت زار پر آسمان بھی آنسو بہا رہا تھا۔ بارش زور سے ہونے لگی۔ جس کے ساتھ آندھی کا ایک طوفانِ شدید ملا ہُوا تھا۔

آخر ایملیا نے دیوانوں کی طرح سے ایک قہقہہ لگایا اور مُنہ پھیر کر ہملٹن سے کہا۔

رُخصت۔ میری دُنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ کیا تُم سُنتے ہو؟

ہملٹن۔ ہاں۔ مگر خدانخواستہ تمہاری دُنیا کا کس طرح خاتمہ ہو گیا؟

ایملیا۔ عورت کی دُنیا صرف اُس کا مرد ہے۔ اُس کا خاوند ہے۔ اس سے محبت کرنے والا ہے۔ مَیں نہ تُم سے محبت کر سکتی ہوں۔ نہ تم میرے خاوند بن سکتے ہو۔ بس میری دُنیا یہی تھی۔ عورت کی دُنیا یہی ہوتی ہے۔ اُس کو

نہ کسی روپیہ سے محبت ہے۔ نہ کسی لباس سے۔ نہ زیور سے نہ عیش و آرام سے اُس کو صرف اپنے پیارے خاوند سے مطلب ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی دُنیا ہے۔ آج دُنیا مجھ پر ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے مجھے دُنیا سے رُخصت ہونا چاہئے

اب ایملیا کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ وہ اُسی لباس میں ہوا کے زور اور بارش کے طوفان کی پروا نہ کرتے ہوئے سیاہی و تاریکی میں تڑپ کر باہر نکلی۔ وہ ایک آزاد ہرن کی طرح سے دوڑتی اور چھلانگیں مارتی ہوئی دریائے ٹیمز پر جا پہنچی۔ ہملٹن اُس کے پیچھے بھاگ رہا تھا لیکن وہ اُس کی گرفت سے باہر تھی۔ وہ جنگلے پر چڑھ گئی۔ اور ہملٹن پر ایک آخری نظر ڈال کر کہا۔

"اے ظالم مرد۔ اے میری دُنیا میں تجھ سے رُخصت ہوئی۔ گڈ بائی۔"

پانی میں کودنے کی آواز آئی پھر پانی کی موجوں نے اُس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ جس کو اُس کی دُنیا آغوش میں لینے سے انکار کرتی تھی۔ (ماخوذ)

یوسف حسن

لطفِ کلام

خموش و افسردہ، سر جھکاتے ہیں دست افسوس مل رہے ہیں
ہمارے ارماں تو کیا نکلتے تمہارے ارماں نکل رہے ہیں

یہ اپنی پستی کی ہے بلندی، خرابیوں کا بناؤ دیکھو
کہ لامکاں تک پہنچ رہے ہیں جو دل سے نالے نکل رہے ہیں

شرابیوں کی سی لغزشیں بھی، نسیم کی سی روانیاں بھی
بڑے قیامت کے ہیں یہ فتنے جو تیرے قدموں میں پل رہے ہیں

اُدھر جو گوشوں میں دل کے دیکھو تو کتنے آتشکدے ہیں روشن
اِدھر جو آنکھوں کو دیکھئے تو ہزار دریا اُبل رہے ہیں

ذرا سے "لطفِ کلام" نے سب بھلاتے اندیشہ ہائے فردا
کچھ اس بلا کے ہیں اُن کے فقرے کہ ہم پہ جادو سے چل رہے ہیں

ابھی تو ہم منہ ہی دیکھتے تھے کہ وہ جو چُپ ہوں تو کچھ کہیں گے
ابھی سے تیور چڑھا لئے ہیں ابھی سے پہلو بدل رہے ہیں

فنا کے آغوش میں ہے ہستی، خزاں محیطِ بہار یعنی
چراغ جل تو رہے ہیں لیکن ہوا کے جھونکوں میں جل رہے ہیں

ہوتے ہیں چپ ایسے نام سُنکر کہ جانتے ہی نہیں سہا کو
بلا کی بے اعتنائیاں ہیں، ستم کے پہلو نکل رہے ہیں

گل فروش

[illegible]

علی الصباح آفتاب دلستر سکیئر کے ہجوم بوقلموں پر چمک رہا تھا۔ جن میں یا تو اجنبی تھے یا شائقین سیرِ گل ایک نوجوان بنچ پر بیٹھا ہُوا تماشائے چمن میں مصروف تھا۔ قریب ہی ایک دوشیزہ گلدستے بنا رہی تھی۔ بار بار وہ ہم نشین کے بستہ لب اور کشیدہ ابرو دیکھ کر متحیّر ہُوئی۔ اگرچہ وہ حسین نہ تھی لیکن اس کے چہرہ پر شباب کا حسن اور عفت کی دلنوازی تھی۔ لیکن اس نوجوان نے ایک مرتبہ بھی اسے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر حیا اور کم سنی مانع تھیں عقل نے خاموشی مصلحت سمجھی۔ اور وہ چُپ بیٹھی رہی۔

وہ نوجوان اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات کا موازنہ کر کے کرلہ رہا تھا۔ اگرچہ ایک وضعدار اور خوشنما کوٹ اس کے زیب تن تھا۔ لیکن اس کا پیٹ قوت لایموت کو ترس رہا تھا۔ نقد جان کو بچانے کے لئے اُس کے تمام کپڑے بک چکے تھے۔ اب ایک جوڑا رہ گیا تھا۔ اور بھُوک اور خودداری کی کشمکش تھی۔ کوٹ زیادہ سے زیادہ ایک وقت کے کھانے کا کفیل ہو سکتا تھا۔ لیکن آہ! اس کے بغیر زندگی کی ذلیل ترین پستی میں اُترنے کا اندیشہ دامنگیر تھا۔

وہ گلفروش لڑکی آہستہ سے بولی "شکر ہے کام ختم ہو گیا"۔ اس نوجوان نے مڑ کر دیکھا۔ اور "بہت خوب" کہا۔ اور مزید استفسار کی خاطر کہنے لگا۔ "آپ یہ گلدستے ابھی بیچیں گی؟"

"کھانے کے وقت تک یہ سب بک جائینگے۔ تو کیا آپ ایک بھی نہیں خریدینگے؟" بڑی متانت سے اس نے جواب دیا۔ "مَیں آج پھُول نہیں خرید سکتا۔"

لڑکی نے یہ سُنکر سرد آہ کھینچی۔ "تو آپ نہیں خریدینگے۔ بھلا ایک پینی بھی کوئی بات ہے۔"

وہ بصد مشکل مُسکرا کر کہنے لگا۔ "صرف یہی کہ ایک پینی کو دو خُشک روٹیاں آتی ہیں۔"

وہ بے اختیار ہنسی اور تعجب سے پُوچھنے لگی "خُشک روٹی' ہیں۔ آپ خُشک روٹیاں کھانے والے ہیں!"

اس استفسار سے اس کے دُبلے رُخسار سُرخ ہو گئے۔ لڑکی نے سمجھا۔ یہ بھی مزاج کا ایک رنگ ہے۔ "آپ چھیڑ رہے ہیں۔"

'نہیں تو'

'آہ! بھُوکا رہنا کس قدر جانگداز ہے' یہ کہکر وہ چُپ ہو گئی۔ کیونکہ جوش ہمدردی نے اسے سخت بیقرار کر دیا تھا۔ پھر اعتماد پیدا کرنے کی خاطر پوچھنے لگی۔ اب کیا ارادہ ہے۔

جواب میں اس کے دونوں آغوش کی جنبش عجب بیچارگی کی تصویر تھی۔

"کیا آپ کے والدین زندہ ہیں؟"

"نہیں"

لڑکی نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اور اُس کے نازک خدوخال۔ نرم بال۔ نفیس و نازک جسم اور چمکدار آنکھوں سے مسحور ہو گئی۔

"تو کیا آپ کے دوست مدد نہیں کرتے۔ خاصکر اگر وہ" ......

"اگر وہ کون؟"

"اگر وہ ... آپ سمجھتے ہیں۔"

"مَیں تو نہیں سمجھ سکتا۔"

"اگر وہ صنف نازک سے ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو ان کے منظور نظر ہوتے ہیں۔" اس نے کرخت سی آواز میں شکریہ تو ادا کیا۔ لیکن بھوکے آدمی کو مزاح آفرینی سے کیا کام وہ کہنے لگا۔ "مَیں ان کی مالی امداد سے مستغنی ہوں۔"

"غرور۔ ہیں!"

"ہرگز نہیں"

شرمیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر وہ آہستہ سے کہنے لگی۔ "اگر آپ فی الحقیقت بھوکے ہیں تو آپ میرے ساتھ تناول ماحضر فرمائیں۔"

اگرچہ اُس نے دعوت دینے میں دلبری کی۔ لیکن شرم سے اُس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا۔ کہیں ترحم کا احساس اسے ناخوش نہ کر دے۔ اس نوجوان نے پہلے تو ذرا تامل کیا۔ پھر خوشی سے کہنے لگا۔ "مَیں مشکور ہوں۔ ایسی دعوت سوائے کم ظرف شخص کے اور کون رد کر سکتا ہے۔"

یہ سُنکر وہ نہایت شادمانی سے کہنے لگی۔ "خدایا تیری دُنیا کیا ہی اچھی ہے۔"

عالم خیال میں وہ نوجوان بھی اس کا ہمزبان تھا۔ اگرچہ ایک ساعت پیشتر وہ تمام عالم سے سخت متنفر تھا۔ اپنا نام اینتھونی ولیم بتا کر وہ پوچھنے لگا۔ "آپ کو کس نام سے یاد کروں"

"لیلیٰ" "اب آپ میرے ساتھ چلیں۔ تاکہ مَیں اپنا کام بھی کر لوں۔" مُسکراتی ہُوئی وہ جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگی۔ ولیم اس کے پیچھے ہولیا۔ اس خندہ پیشانی گلفروش کو کئی ایک نے مڑ کر دیکھا۔ اتنے میں ایک یہودی نے ایک گلدستہ ایک شلنگ کو خریدا۔

دو قدم جا کر یہودی سودے سے پشیمان لیلیٰ کے پیچھے بھاگتا ہُوا آیا۔ اگر ایک نظر وہ اس لاغر نوجوان کو دیکھ لیتا۔ تو شاید سنبھل جاتا۔ لیکن عجلت اسے آتش زیر پا بنائے ہوئے تھی۔ یکلخت اس نازک گل فروش کا بازو اس ترشرو یہودی کی سخت گرفت میں آگیا۔ اسی وقت جلدی سے انتھنی نے

یہودی کا کالر پکڑ لیا۔ اور جاکر ایسی ٹھوکر لگائی۔ کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر جارہا" لیلیٰ نے شرمیلی نگاہوں سے شکریہ ادا کیا۔ اور خوش و خرم ایک معمولی ہوٹل کے پاس پہنچی۔ جہاں دونوں نے ماحضر خوب سیر ہو کر کھایا۔ لیلیٰ نے جب یہ مختصر حق مہمان نوازی ادا کیا۔ تو اینتھنی نے شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر شرم سے اس کی زبان لال ہو گئی۔ لیلیٰ اب اپنی کہنیاں میز پر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ ہوٹل خالی تھا۔ اور باتیں کرنے کا موقعہ۔

"آپ انگریز تو ہیں نہیں۔ اپنے حالات مجھے سنائیے" لیلیٰ کے موثر انداز نے اسے مائل گفتگو بنا دیا۔ "میں فرانسکو میں اخبار نویس تھا۔ ہوس فراوانی نے مجھے اپنی معقول آمدنی سے آزردہ خاطر کر دیا۔ اب یہاں (لنڈن میں) قسمت آزمائی کے لئے آیا ہوں۔ میرے اچھے دن تو ضرور آئینگے۔ تب آپ میری شریکِ طعام ہوا کرینگی نا! اب آپ کہاں رہتی ہیں؟" پتہ لکھنے کو اُس نے جیب سے پنسل اور نوٹ بک نکالی۔ لیکن جب پردہ داری اور حیا سے اس نے لیلیٰ کو مجبورِ انکار پایا۔ تو اس کا شوق دوبالا ہو گیا۔ اور اُس نے تمام طاقتِ گویائی لیلیٰ کو منانے میں صرف کر دی۔ بالآخر وہ کہنے لگی "میں سوہو میں ایک سستے سے مکان میں رہتی ہوں" لیکن جب اینتھنی کی آنکھوں میں اُس نے پنہاں ارادہ کو مطالعہ کیا۔ تو نگاہیں نیچی کر کے رخصت ہو گئی۔

سیر شکمی سے اس کی بصیرت روشن ہو گئی۔ اس نے ایک دولتمند ہموطن سے اُدھار مانگنے کی ٹھانی۔ جو کبھی اینتھنی کی طرح بے مایہ تھا۔ اس نے ایک نوٹ اینتھنی کو دیدیا لیکن اُس کے خندۂ بے مہر نے اس نوجوان کے جذبۂ تشکر کا دل ہی دل میں فشار کر دیا ظرافت سے زخمِ دل کیونکر چھپ سکتا تھا کم مائیگی کا احساس اینتھنی کے لئے طوقِ گرانبار ہو گیا لیکن اسے لیلیٰ کے قریب مکان لینے میں خوشی ہوئی۔ اور لیلیٰ کی ملاقات نے یہ احساس جانگداز محو کر دیا۔ اب ان کے تعلقات ایسے گہرے ہو گئے۔ گویا وہ پُرانے دوست تھے۔ وہ بے تکلف ایک دوسرے کو زندگی کا ہمراز بنانے لگے۔ لیلیٰ نے فوراً سمجھ لیا۔ کہ اینتھنی ذاتی ہما پرندہ ہے۔ اگرچہ اس کا غرور خاک میں مل چکا ہے اسی ملاقات میں اس کے وسیع مطالعۂ حیات کے آگے وہ سر نیاز خم کرنے لگا۔ اسی رات لیلیٰ کی والدہ سے اینتھنی کی ملاقات ہوئی۔ جس کے سوانح حیات' افسانۂ میونوشی تھے۔ اس عورت نے اچھے ایام بھی دیکھے تھے۔ جن کی یادگار اُس کے خاوند کا فوٹو کمرے کی تنہا آرائش تھا۔ پہلی ہی ملاقات نے لیلیٰ کو حیرت میں ڈال دیا۔ "یہ نوجوان اور لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ میرے چہرے کو بار بار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے کے باوجود میرے نسوانی جذبات سے بالکل بے بہرہ ہے۔ اور اس کی تواضع کیوں مجھے پریشان

کردیتی ہے۔ آخر کیا شوق اسے یہاں [illegible] ہے۔ اس کے فریب وہ تبسم کے جواب میں [illegible] سے [illegible] بیارہنس دیتا۔ اور کہتا۔ "مجھے قسمت یہاں لائی ہے۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ تم"

اور جب وہ اندازِ استعجاب میں "میں!" کہتی تو عورت کی تمام دلفریبی اس کی آواز میں منعکس ہوجاتی تھی۔

"میں آپ کے مطالعہ حیات سے دستگیری کا مشتاق ہوں۔ مجھے رموزِ حیات سے آشنا کردو۔ اگر آپ کا دستِ فیض دستگیر ہو۔ تو میں گلفروش لڑکیوں پر ایک مضمون قلمبند کرلوں"

وہ مضمون مقبول ہوا۔ اور معقول قیمت پر بک گیا۔ مگر تقدیر سنگدل تقدیر اور ٹھوکریں لگانے سے کب رکنے والی تھی۔ اور کوئی مضمون نہ بک سکا۔ پھر تنگدستی نے اندازۂ حیات کو زیر و زبر کردیا۔ اور لیلیٰ کا دستِ شفقت موجبِ حیات و نجات ہوا۔ جب وہ لیلیٰ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا۔ تو بس اتنا ہی کہتا۔ "کہ میرا اشتیاق اظہارِ تشکر سے کم نہیں ہوسکتا۔"

بڑی محنت و استقلال کے بعد اس کے افسانہائے افلاس، مقبولِ عام ہوئے۔ اس کی لیاقت کی ایڈیٹروں میں شہرت ہونے لگی۔ دورِ افلاس کے خاتمہ کا جشنِ اختتام اس نے لیلیٰ کی صحبت میں بہت خوشی سے منایا۔ لیکن لیلیٰ کی ماں جب کبھی انہیں ایک جگہ دیکھ پاتی۔ تو ناک بھوں چڑھاتی۔ اور اس کی بیزاری بات بات میں مترشح ہوتی۔ اگرچہ ان کے ارتباط میں آمیزش گناہ کا شائبہ تک نہ تھا۔ اب وہ سیر کرنے بلکر جاتے۔ اور بے تکلف رازِ دل ایک دوسرے کو سناتے۔ لیکن بالعموم اپنی باتیں کرتا۔ اور وہ ہمہ تن گوش سنتی رہتی۔ وہ اپنے مستقبل کی شاندار کامیابی کے منظر دکھاتا۔ اور شہیرِ فن ہونے کی باتیں کرتا۔ لیکن ہمیشہ ہی اس لڑکی کو یہ خیال پیدا ہوتا۔ کہ اس مستقبل کی شاندار وسعت میں میرے لئے کوئی منزلِ آسائش نہیں ہے۔

اس کی گفتگو میں دلاویزی ضرور تھی۔ لیکن اس کا اکثر حصہ لیلیٰ کے لئے مہمل ہوتا۔ وہ ایک تصنیف میں مشغول تھا۔ جس کا موضوع افسانۂ محبت تھا۔ کتاب کے فقرے اکثر وہ لیلےٰ پر چسپت کیا کرتا۔ لیکن جیسا وثوق اسے مردوں پر تھا۔ عورتوں پر ہرگز نہ تھا۔ اپنے ہیرو کو وہ پیچیدہ واقعات میں بھی پورا پورا سمجھ لیتا۔ لیکن آخر میں اس ناول کی ہیروئن اسے اکثر حیران و پریشان کردیتی۔ اپنی بے بسی ظاہر کرکے وہ لیلیٰ کے مشورہ سے اکثر مستفیض ہوتا۔ جس کے مسرت اندوز جواب سنکر وہ عموماً بے خود ہوجاتا۔ ایک روز عالمِ سرخوشی میں پوچھنے لگا۔ "آپ کے کوئی عاشق بھی ہیں؟"

"کئی ایک" آخر بڑی رد و کد کے بعد معلوم ہوا۔ کہ ایک شخص ایلفریڈ ڈیوک لیلیٰ کا فداکار عاشق ہے۔ اور حال ہی میں لیلیٰ ایک مرفہ الحال عاشق کو رد کرچکی ہے

[illegible] کا شوق مطالعہ بڑھتا گیا۔ بڑی دلیری سے اس نے

پوچھا "مرد تو عشق کی بیخودی میں بھی بیگانہ راز نہیں ہوتا۔ جنس لطیف پر کیا گزرتی ہے"۔ لیلیٰ اس بے باکی سے شرما گئی۔ جب اس نے کہا "اس سے کہیں زیادہ"، تو اس کی آواز میں ایک درد تھا۔ جسے دیکھ کر ایتھنی نے جرأت استغفار کی۔ لیکن وہ ہنس کر خاموش ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکیِ غم نمودار ہوئی۔

ایتھنی کا شوق اپنی تصنیف سے بڑھتا گیا۔ اس کے ناول کے تمام مرد و زن اسکے خیال کی تصویر تھے۔ وہ سب کے سب تربیت یافتہ۔ خوش گفتار۔ نیک باطن اور خوش مذاق تھے۔ ان کی صحبت ایتھنی کے لئے بہت دلنواز تھی۔ اس شغف میں اس کے لئے فرصت قلیل ہو گئی۔ اور اس غریب رفیقہ سے مسرت ملاقات کم ہونے لگی۔ ایک روز وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگی۔ "یہ محبت تجھے مار ڈالیگی۔ ذرا تدبر کے بعد وہ بولا" شاید میں سعی مسلسل سے لاغر ہو رہا ہوں۔"

اب سردی بھی آ رہی ہے' لڑکی کی آواز میں بے سرو سامانی کے خوف سے لرزہ تھا۔ ایتھنی یہ سنکر چونک پڑا۔ لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "تم سرد کیوں ہو رہی ہو؟

اگر تم اپنی کتاب کو آگ لگا کر جلا دو۔ تو میں اس کی تپش سے گرم ہو جاؤنگی"۔

جب اس نے خمدار ابرو اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ کہنے لگی۔ "مجھے تمہاری کتاب سے نفرت ہے سخت نفرت ہے۔"

"گویا تمہیں مجھ سے بھی نفرت ہے"۔

فوراً ہی وہ نادم ہو گئی۔ اور اپنی غیر مانوس محبّت کا اُسے یقین ہو گیا۔ ایتھنی نے جب یہ دیکھا۔ تو اس اندیشۂ باطل کی پُر جوش مخالفت کر کے کہنے لگا۔ "تمہاری دوستی میرے لئے سرچشمۂ فیض ہے۔ میری کلکِ سحرکار تمہارا دستِ اعجاز ہے۔ میرے تخیل کی جدت طرازی اسی کے دم سے ہے۔ اور اسی سے میرے دل و دماغ حسن و عشق کی دولت سے مالامال ہیں"۔

(۲)

جنوری کے وسط میں ذات الصدر نے اسے وقف بستر کر دیا۔ لیلیٰ شب و روز اس کی خدمت میں مصروف رہی۔ رو بصحت ہو کر اسے لیلیٰ کے پیہم احسانات نے مبہوت کر دیا۔ لیکن خدا جانے کیونکر اس نازک خیال لڑکی نے اپنی فطری سادگی سے سمجھا دیا۔ کہ خاموشی اظہار تشکّر سے کہیں زیادہ دلنواز ہے۔ اس سحرکاری سے اس کی جمعیت خاطر مبہم خیالات سے دست و گریباں ہونے لگی۔ اب لیلیٰ اس کی نگاہوں کو اپنی طرف مشغول تماشا دیکھ کر شرما جاتی۔ وہ ان کم فہم لوگوں کی ایک مثال تھا۔ جو عالم حیرت میں جرأتِ استفسار نہیں رکھتے۔ اسے یہ گمان تک نہ گزر سکتا تھا۔ کہ اور کوئی بھی اس کیفیت سے آشنا ہے آخر

جب لیلیٰ کی ماں نے اس راز کی پردہ دری کی۔ تو اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ "لیلیٰ کو تم سے محبّت ہے۔ ورنہ وہ الفرڈ ڈیوک سے شادی کر لیتی"۔ اس بات کو اس نے اپنے وحشت انگیز، سوفیانہ رنگ میں کئی مرتبہ دہرایا۔ اینشٹی پر ایک گونہ غشی طاری تھی۔ اور اس عورت کی آواز صدائے دہل کی طرح وحشت خیز تھی۔ تھوڑی دیر بعد لیلیٰ یخنی کا پیالہ لیکر آئی۔ تو بشرہ سے پہچان گئی۔ کہ اینشٹی بھی واقفِ راز ہوگیا ہے۔ افشائے راز سے اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اینشٹی نے اس کی افسردگی دیکھی۔ تو اسقدر آزردہ خاطر ہوا۔ کہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا۔ جراحتِ دل کو چھپانے کی خاطر وہ کہنے لگی۔ "آج رات ہی اپنا ناول لکھنا پھر شروع کر دو"۔ اس کتاب کو ہاتھ لگائے تین ہفتہ گزر گئے تھے۔ وہ غصّہ سے کہنے لگا۔ "کتاب پر خاک ڈالو۔ اس کا ذکر ہی کیا"۔

دوسرے روز اس نے ناول کو پڑھا۔ جو اب قریب الاختتام تھا۔ وہ ایسا اعلیٰ تھا۔ کہ اب اسے یقین نہ آسکتا تھا۔ کہ یہ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ یہ گمان بے وجہ نہ تھا۔ اگرچہ اس کے خون کا ایک ایک قطرہ اس میں دورہ کر رہا تھا۔ لیکن لیلیٰ کی زندگی کا بہترین حصّہ بھی اس میں رگ جان کی طرح منسلک تھا۔ اب جب وہ لکھنے کو بیٹھا۔ تو ایک فقرہ بھی ذہن آیا۔ وہ ننھّی جادو دیدہ ہستی اس ناول کی کٹ پتلیوں میں حائل ہو رہی تھی۔ چار گھنٹے کی مسلسل سعی بلیغ کے بعد بھی ناکامی نظر آئی۔ تو اس نے مسودہ کو صندوقچہ میں بند کر کے قفل لگا دیا۔

اس کے بعد دو ہفتہ تک انہیں بہت کم مسرت صحبت حاصل ہوتی۔ دونوں آمدنی کی کمی پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لیکن لیلیٰ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ اینشٹی نے جب یہ دیکھا۔ تو بارِ منت اس کے لئے طوق سلاسل سے زیادہ گرانبار ہو گیا۔ جس خاندان سے وہ تھا۔ انہوں نے اپنے عقیدہ کی خاطر سوائے ناموس سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ ادائے احسان ان کا ادنےٰ شیوہ تھا۔ لیکن یہ آخری نونہال ایک گلفروش کا زیر بارِ منت تھا۔ جس سے سبکدوشی عدم تک محال تھی۔

بہت کاوش اور عرق ریزی سے ناول جب اس نے مکمّل کر لیا۔ تو اسے ایک مشہور پبلشر کے پاس بھیجا۔ جس نے بڑے پُر تکلف جواب کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔ ایسا ہی اور جگہ سابقہ پڑا۔ صرف ایک نے کسی قدر تواضع سے جواب دیا۔ تو اینشٹی بذات خود اس کے ہاں گیا۔ آخر بصد منت جب وہ راستگوئی پر مجبور ہوا۔ تو کہنے لگا۔ "اس ناول کی آخری چھ فصلیں بالکل ناقص ہیں"۔

"مجھے معلوم ہے"۔ اور اینشٹی کی آواز میں انتہا درجہ کی یاس و افسردگی تھی۔ اس پبلشر نے یہ نصیحت کی۔ کہ اگر تم

آخری چھ فصلوں کو دوسری مرتبہ لکھو۔ تو میں اس کی طباعت پر غور کرونگا۔ اینشنی نے بار بار کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مگر کسی غیر معلوم طریقہ سے لیلیٰ نے سمجھ لیا۔ کہ کیا ہو گیا ہے ایک مرتبہ یہی کتاب اینشنی اور اس کی زندگی میں حائل ہوئی تھی۔ اب وہ خود اینشنی اور اس کی تصنیف کے درمیان حائل تھی۔ اور اس کی بصیرت پر پردہ ڈالے ہوئے تھی۔ اس لئے وہ اس راز کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ آخرکار ایک رات وہ کہنے لگی: "یہ سب کچھ میری وجہ سے ہے۔ لیکن میں بے اختیار ہوں اور شرمندہ بھی۔ جی چاہتا ہے۔ کہ ڈوب مروں"

"خاموش رہو۔ تم تو نادانوں کی سی باتیں کرتی ہو"

"میں تمہاری ممد حیات ہونے کے عوض مخل ہو رہی ہوں"۔ اینشنی نے کبھی لیلیٰ کی غلط انگریزی درست کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ غالباً وہ یہ امتیاز قائم رکھنا لابدی تصوّر کرتا تھا۔ باوجود اس کے وہ دونوں ایک ہی رو میں بہے جا رہے تھے۔ وہ ایک پرکاہ تھی۔ لیکن سیلِ حوادث میں ایک دوسرے کے سہارے دونوں کنج عافیت میں آ پہنچے۔ اور بس۔

"آؤ۔ ہم دونوں مل کر یہ گتھی سلجھائیں"۔ جب اس نے یہ کہا۔ تو اس کا رنگ [illegible] تھا۔ اس کی آواز میں بے اختیار لرزہ "جس قدر تم خود فراموش ہو۔ اسی قدر میں خود غرض ہوں لیکن میرے تصوّر سے یہ انجام مخفی رہا۔ میرا تخیل اسے نہ سمجھ سکا"۔ وہ کامل سکون کے لہجہ میں بولی "تخیل ایک وقت میں ایک کام ہی کر سکتا ہے۔ تمہارا تخیل مشغول کار تھا"۔ بہت زیادہ' اس وقت وہ اپنے ذہن میں ایک ارادہ استوار کر رہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔ 'لیلیٰ۔ ادھر آؤ' لیلیٰ نے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ لیمپ کی روشنی میں دونوں کی ایک دلکش تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس نے جب لیلیٰ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ تو اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ شاید اس نے یہ سمجھا کہ اس بوسہ میں شاہدِ خیال کو الوداع کر رہا ہوں۔ وہی نازنین جس کو ناول میں اس نے زندہ جاوید کر دیا تھا۔ وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ "میں تم سے فوراً شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

کتنی دیر تک وہ اس کے آغوش میں لیٹی رہی۔ ہر ایک زندگی میں کچھ ساعتیں بدنما ہوتی ہیں۔ جب وہ اس کے آغوش سے جدا ہوئی۔ تو ہنس رہی تھی۔

'شادی مجھ سے! ہرگز نہیں'

وہ اپنا سر میز پر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ ایسے انداز میں جس سے استغنا نہیں۔ بلکہ عجز مترشح تھا۔ یہ ایک استدعائے خاموش تھی۔ وہ اس کے اوپر جھک گیا۔ اور کہنے لگا "میں تم سے شادی کرونگا۔ وہ زندگی جسے تم نے بچایا ہے۔ تمہاری ہی ہے۔ اسے لے لو۔ میں بخوشی اسے تم پر نثار

کتا ہوں۔"

اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ قریب وہی کتاب پڑی تھی۔ اس کے گرد کاغذوں کا ایک بے ترتیب انبار تھا۔ اس کی طرف وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ شوق سے پکار اُٹھا۔ "ہاں۔ جب مجھے سکون کامل میسّر ہُوا۔ مَیں اسے لکھ سکونگا۔"

"یقیناً" تو اسے فوراً ہی شروع کر دو۔ کتاب کے خاطر خواہ مکمل ہونے کے بعد اگر تمہیں میری ضرورت ہُوئی۔ تو مَیں تُم سے شادی کرونگی۔ لیکن اب تکمیل کتاب کے لئے ضروری ہے۔ کہ شہر کی شورش انگیزیوں سے یکسو ہو کر کسی گوشۂ تنہائی میں چلے جاؤ۔" بطریق تمثیل اس نے اینگ فورسٹ کی تعریف کی۔ وہ بڑھتے ہُوئے شوق سے مُستنا رہا۔ اور متعجب بھی تھا۔ کہ بالآخر اس لڑکی کے فہم رسا نے سبیل نجات نکال لی۔ اب اس پر آزادی کا جذبہ غالب ہو رہا تھا۔

دوسرے روز جب وہ مرخص ہُوا۔ تو اپنی سلامت روی کے زعم پر نازاں تھا۔ یہ اعتماد کامیابی دلیل راہ بن گیا نہ صرف یہی بلکہ عشق کی سحر کاری کا اس پر اثر تھا۔ اور پیشتر ناول کا انجام شہر کے تنگ و تاریک مکان میں متصوّر ہوتا تھا۔ اب خوشگوار جنگل کی تنہائی میں بہار قدرت اس کے دِل میں جلوہ گر تھی۔ باقی مسودہ جب لکھا گیا۔ تو خود اینشٹی اس پر دنگ تھا۔ اب یہ کتاب ایسی قیمت کو بِک گئی کہ اس پر شہرتِ عام کی امیدیں بندھنے لگیں۔ عالم خود فراموشی میں اس نے یہ سمجھا۔ کہ مَیں اپنی کامیابی کے لئے کسی کا شرمندۂ احسان نہیں۔

(۳)

جب وہ واپس آیا۔ تو اس کے چہرہ پر مایوسی کا اثر تک نہ تھا۔ مسرت اس کے رُخسار اور آنکھوں سے نمایاں تھی۔

اس نے ٹرین سے اُترتے ہی سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ گردو پیش غربا کے تنگ و تار مکانات کا منظر اس کی رُوح منقبض کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک مخمور عورت سوقیانہ راگ الاپتی ہُوئی بصد لغزش پا ایک میخانہ سے باہر نکلی۔ اس نظارہ نے لیلیٰ کی ماں کی یاد تازہ کر دی۔ اور وہ آہستہ آہستہ بالکل ساکت ہوگیا۔ اس کا دماغ بارِ تخیّل سے دب رہا تھا۔ اب بھی بچنے کے لئے کافی وقت تھا۔ خود غرضی نے کئی عذر سوچے۔ حافظے نے کئی مثالیں پیش کیں۔ یہانتک کہ کامیابی کی شاہراہ پر تاریک گھٹا چھا گئی۔ جب وہ ہوش میں آیا۔ تو اس کا بدن پسینہ سے شرابور ہوگیا تھا۔ وہ بے اختیار چلّایا۔ "میرے خُدا کیا مَیں بُزدل ہوں۔" اب اس کے آباؤ اجداد کا بہترین خون رگِ حمیّت میں جوش مارنے لگا۔ اور اس کی نبض بہت زیادہ تڑپنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس ہیجان سے اس کی زندگی کا اخلاقی معیار رونما ہُوا۔ اور وہ

بالکل قائل ہوگیا۔ کہ عشق ابدی ہی اس کی حیات اور کامیابی کا ضامن ہوتا تھا۔ جس سے وہ پیشتر بے بہرہ تھا۔ لیکن لیلیٰ کی آنکھوں نے اسے پہلی مرتبہ آگاہ کیا۔ ارادہ بدل کر اب وہ لیلےٰ کے مکان پر گیا۔ لیلیٰ کے تصور سے اس کی رُوح مسرت اندوز تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا۔ تو سامنے لیلےٰ کی ماں نظر آئی۔ جس کے چہرہ پر استعجاب اور نفرت کے آثار نمودار تھے۔ وہ جذبہ سے بولی ' میرے خدا! تم ؟

' لیلیٰ کہاں ہے '

' غالباً تم اس سے شادی کرنے کو آئے ہو '

یہ کہا۔ اور اُس نے ایک جگر خراش قہقہ لگایا۔ یہ ناموس سوز آواز سنکر اس میں تاب تکلم نہ رہی۔ مگر وہ استہزا کی خاطر اُونچی آواز سے پکارنے لگی۔ ' لیلیٰ۔ جلدی آؤ۔ ایک نوجوان تم سے شادی کرنا چاہتا ہے '۔

لیکن اینتھنی میں اس عورت کی پُر غضب اور نفرت آمیز نگاہوں کی تاب مقاومت نہ رہی۔ جلدی سے یہ درخواست کر کے کہ لیلےٰ کو میرے ہاں بھیجدو۔ وہ چلا گیا۔ بہت دُور تک اس عورت کا رُوح فرسا قہقہ اس کے دل و دماغ پر تازیانہ لگاتا رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اپنا بیگ ایک طرف پھینکدیا۔ اور لیلیٰ کی انتظار میں کھڑا ہوگیا۔ اسے یہ یقین ہو رہا تھا۔ کہ کوئی امر نادیدنی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ اتنے میں لیلےٰ کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ تم نے کیا کیا ہے '

اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ مَیں نے ایلفرڈ ڈیوک سے شادی کر لی ہے۔ مَیں نے تم سے ذرا اخفا نہیں کیا۔ اب وہ میرا رازدار ہے۔

' وہ ناول ختم ہو آیا نہیں '

' لیلیٰ . . . . . .

' کیا وہ کتاب مکمل ہو گئی ہے ؟

' ہاں۔ لیکن تم؟ مَیں مَیں . . . . لیلیٰ نے اپنی آنکھوں سے کچھ کہا اور وہ خاموش ہوگیا۔ وہ ناخواندہ لڑکی جو زندگی کے ادبی مشاغل سے ہی آشنا تھی۔ اب سمجھ گئی۔ کہ گفتگو وقعت ایثار کم کر دیگی۔ اینتھنی نے لیلیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر ایک بوسہ دیا۔ اور آنسوؤں کا تار اس کے ساعدِ سیمیں سے لپٹا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چلی گئی۔

یہ ان کی آخری ملاقات تھی!

سید محمد شاہ

نغمۂ مغموم

مری زندگی ہدفِ بلا، مری جان ہے ہدفِ ستم
ہوسِ فراغ نہیں مجھے، مَیں ہوں آشنائے مذاقِ غم
نہیں پھر بھی ہوشِ مگر تجھے

مجھے کیا خوشی ہو جو روز و شب، مَیں اٹھاؤں صدمۂ متّصل
نہیں پھر بھی فکرِ مآلِ غم، نہ ہوائے چارۂ دردِ دل
نہ خیالِ زخمِ جگر تجھے

مرے غم شریک بنے تھے جو وہی اب ہیں تشنۂ خوں مرے
جو یقیں نہ آئے تو دیکھ لے، ہیں گواہ زخمِ دروں مرے
مگر آئیں کاش نظر تجھے

نہ وہ جوشِ شوق و جنوں رہا، نہ وہ ولولے نہ وہ حوصلا
رہے رنگِ بےخبری ترا، مجھے سوزِ دل نے مٹا دیا
نہیں پھر بھی میری خبر تجھے

نہ تباہ کر مجھے باغباں، مجھے رنجِ بے وطنی نہ دے
نہ اُجاڑ یوں مرا آشیاں، مرے دل کے داغ بھی دیکھ لے
ہوسِ چمن ہے اگر تجھے

تو ہے بندۂ غرض و ہوس، تو ہے خوگرِ ستم و جفا
نہ وفا کے ذوق سے تجھ کو مس، نہ متاعِ درد سے آشنا
نہ مذاقِ حسنِ نظر تجھے

مرے سازِ غم کو نہ چھیڑ تو، مری چپ سے تو نہ ہو بدگماں
ہے پیامِ مرگ جو آہِ دل تو قضا کا تیر مری فغاں
میں دکھاؤں رنگِ اثر تجھے

محوی لکھنوی

نیرنگِ خیال

کلیم سے میری بہت عرصے کی ملاقات ہے، باہم تعارف کے بعد اس کی ابتدائی شناسائی نے ہی مجھے اس بات سے آشنا کر دیا تھا۔ کہ یہ خاموش اور سنجیدہ ہستی ہمارے حلقۂ احباب میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے۔ اگرچہ لاہور سے کچھ عرصے تک دُور رہنے کے باعث مَیں اپنے دوستوں سے کچھ بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ (اور وہی بیگانگی اس بات کی محرک ہُوئی تھی۔ کہ مَیں کلیم سے ایک مدت تک کھل نہ سکا) مگر بے تکلف ہونے کے بعد اس کی فطرت کی صحیح نبّاضی میرے لئے ایسی ہی آسان تھی جیسی میرے دیگر احباب کے لئے مشکل۔ وہ بلند بالا، خُوبصورت نوجوان، جسے قدرت نے توفیقِ علم کے ساتھ قوّتِ عمل بھی عطا کی تھی۔ اپنے احباب کی کج فہمیوں سے ایسا تنگ آ گیا تھا۔ کہ میری طرف اس کا خاص طور پر رجوع ہونا چنداں تعجب خیز امر نہ تھا۔

وہ اپنے اس فلسفۂ حسن کی وجہ سے، تمام حلقۂ محفل میں اگر لسانا نہیں۔ تو قلباً صدر خیال کیا جاتا تھا جس کو وہ ہر مناسب موقع پر نہایت شد و مد سے بیان کیا کرتا تھا۔ وہ تمام دوست جو اپنی خصلت کو حسن فہمی پر محمول کیا کرتے تھے۔ کلیم کی رفعت محبّت کو اپنے خیالات سے اس قدر متباین اور متضاد پاتے تھے۔ کہ بجائے رنجشوں کے وہی چیز ان کی گہری دوستی کی موجب بن گئی تھی۔ آخرکار جب مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا۔ کہ وہ تمام حسن کے مجسم پیکر جن کی ایک جھلک میرے احباب کے متاعِ جان و دِل کے لئے بارقہ سوزندہ تھی۔ اس کی ایک خفیف سی کراہٹ ایک ہلکی سی جنبش کے بھی سزاوار نہ ٹھیرے تھے۔ تو مَیں حیران تھا۔ اور بجا طور پر کہ آخر وُہ کونسی حسن کی دیوی ہے جس کا انداز دلاویزی ہمارے متین دوست سے خراجِ تحسین وصول کر سکتا ہے۔

ایک دن جب تمام احباب کسی تھیٹر میں ایک دلفریب ایکٹرس کے رقص کی کرشمہ سازیاں دیکھنے گئے ہوئے تھے مَیں نے کلیم سے معمولی گفتگو کے بعد اس کے معیارِ حسن کی نسبت استفسار کیا۔ اس کی خاموشی اور ابروؤں کی شکن میرے لئے کچھ ایسی جرأت شکن نہ تھی۔ کہ مَیں دوسری دفعہ قسمت آزمائی نہ کروں۔ مگر کلیم کے غیر متوقع جواب نے مجھے اس مزید استفسار سے مستغنی کر دیا۔ وہ اپنے چشمے کو آنکھوں سے ہٹا کے اور سامنے کی دیوار پر نظر جما کر کہنے لگا۔

"تم دیکھتے ہو۔ کہ حُسن وفا اور عصمت سے کس قدر علیٰ

ہے۔ وہ خال خال کتابی قصّے جن میں ہمارے پاک سیرت مورخین نے فرقۂ نسواں کی عصمت اور پاکبازی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ مستثنیات ہیں۔ اور کوئی کلیہ مستثنیات کی بنا پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر کوئی پاسِ وفا کی موہوم امید پر اپنی زندگی "شیوۂ راہِ وفا" جیسی لاحاصل شئے اختیار کرنے میں صرف کر دے۔ تو وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں تاریخِ عالم سے بیگانہ نہیں سمجھتا ہوں کہ فرقۂ نسواں کی عصمت نے توارثِ عمرانی میں کتنا اہم حصّہ لیا ہے۔ مگر اس کے اصلی اسباب نمایاں نہیں، دراصل یوں ہے۔ کہ اُن پاکدامن عورتوں کی طرف کوئی ایسی ہستی متوجہ نہیں ہوئی۔ جس کی مرعوب کن شخصیت ان کی خودداری کو "گلدستۂ طاقِ نسیاں" بنا دے۔ یا اگر انہوں نے خود کسی ایسی ہستی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا ہے۔ تو ایسا جواب پایا ہے۔ کہ پھر اپنے جادۂ وقار سے جو اس کلیے پر منحصر ہے کہ ۔ ـــ

بہت خوب ہے طرزِ بیگانگی + یہ ترکیب اگر کارگر ہو گئی

منحرف ہونے کی ہمّت نہیں۔ وہ زمانہ بھی تھا جب صنفِ نازک کی بے وفائی کا خیال میرے جسم کو ایک خندۂ استہزا سے مرتعش کر دیتا تھا۔ مگر اب ان کی وفا کا خیال اس بات کا محرک ہوتا ہے۔ کہ میں کسی گوشۂ سکوت میں جا کر منہ ڈھانپ اور دل کھول کر سسکوں۔" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اور معلوم نہیں کہ اس کے سننے فلسفے سے مجھے کیا کیا انکشافات حاصل ہوتے۔ مگر ہمارے احباب بقیہ سیر میں اپنے اندازِ موسیقی کے موافق کیف نہ پا کر۔ افسردہ قدموں سے واپس آ رہے تھے۔ اور بطورِ شغلۂ بیکاری اُنہوں نے دور ہی سے مجھے اور کلیم کو دیکھ کر پھبتیاں کسنی شروع کر دی تھیں۔ کلیم فوراً چپ ہو گیا۔ اور اگرچہ اس کے بعد تنہائی میں میں نے اس سے کچھ اور کہلوانے کی بہترین کوشش کی۔ مگر سوائے ایک دلخراش چیں جبیں کے اور کوئی جواب نہ پایا۔

کلیم کی مزاج کی خصوصیات میں سے تلوّن ہی ایک ایسی چیز تھی۔ جو ہمیں بہت پریشان رکھا کرتی۔ میں اس بات پر متعجب ہوں۔ یہی تلوّنِ طبع اس کے فلسفۂ حسن کو کیوں نہ متاثر کر سکا۔ اکثر تجربہ کیا گیا ہے۔ کہ جس چیز کی وہ رات کو اس زور و شور سے مخالفت کر رہا ہے۔ اور اپنی قوتِ لسانی کی انتہائی کاوشوں کو صرف کار کر رہا ہے۔ اسی کی نسبت آفتاب کے برآمد ہونے سے پہلے ہی اس کے خیالات ایسے بدل گئے۔ کہ دلائل اور شواہد سے اسی بات کی حمایت کی جا رہی ہے۔ اس کی قوتِ مجلسی اور واقفیتِ ادب نے اس کے بہت سے عقیدتمند پیدا کر دئے تھے۔ اور وہ اُنہیں اپنے فلسفۂ حسن سے بہرہ ور کر دیا کرتا تھا۔ وہ اپنے اس حلقہ کو ازراہِ انکسارِ ظاہری "زمرۂ دیوانگی" پکارا کرتا تھا مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ باوجود اپنی انتہائی

کوششوں کے مَیں اس حلقے میں داخل نہ ہوسکا۔ ورنہ بہت سے حقائق و دقائق ظاہر ہوجاتے۔

بہت تجسس و تفتیش کے بعد مجھے معلوم ہُوا۔ کہ کلیم کے تلون طبع کی ابتدا اور اور اس کی حسن ناشناسی کا آغاز ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ اس بات سے بہت سے نتائج حاصل ہوسکتے تھے۔ مگر مَیں نے اس کے آیندہ طرزِ عمل پر اُٹھا رکھا تھا۔ اور اس کی گذشتہ زندگی کی چھان بین میں مصروف ہوگیا۔ اس کی مستقل مزاجی کا کافی سے زیادہ ثبوت مجھے اس وقت ملا جب اورینٹل کالج کے ایک طالب علم کے ذریعے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس نے کالج میں داخل رہ کر "مولوی فاضل" کا امتحان ستا دفعہ دیا۔ اور ناکامیاب ہوتا رہا۔ آٹھویں سال اس کو اپنے کامیاب ہونے کی (جیسا کہ ہر سال ہُوا کرتی تھی) پُوری امید تھی۔ کہ طبیعت کی کایا پلٹ گئی۔ اور تلون مزاجی پیدا ہوگئی میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس کی علمی قابلیت پر تو اس واقعہ سے کوئی اثر نہیں مترتب ہوسکتا۔ خُدا جانے اس میں کیا حکمتِ خداوندی مضمر تھی۔ کہ وہ یوں ناکام ہوتا چلا گیا۔ وُہ قولاً اور فعلاً ایک پُورا فلاسفر۔ سقراط کے قانونِ اخلاق کا حافظ۔ غالب کے شعروں کا دلدادہ اور سبعہ معلقات کا ایک ایسا شوقین تھا۔ کہ اکثر اورینٹل کالج کے پروفیسر کسی خاص شعر کے معنی دریافت کرنے میں اپنی تسلّی کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ عربی علم ادب کی نسبت اس کی نظر اتنی وسیع اور مطالعہ اتنا گہرا تھا۔ کہ بعض دفعہ کسی ادبی مسئلے پر اس میں اور پروفیسر صاحبان میں بحث چھڑ تی اور مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور اگر میرا حسنِ عقیدت جو مجھے ان کے ساتھ ہے۔ اجازت دیتا۔ تو مجھے اس حقیقت کے آشکارا کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ کہ عام طور پر کلیم ہی حق بجانب سمجھا جاتا تھا۔

میرے پاس اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں۔ کہ جب وہ اورینٹل کالج میں داخل تھا۔ تو حسن کی سحر کاری اور چشمِ جادو کی فسوں نوازیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اکثر لوگوں نے کلیم کو اس کوچے میں گشت لگاتے دیکھا ہے۔ جو سکۂ حسن کی بدترین ٹکسال ہے۔ اگرچہ وہ مہوشاں ادا فروش اس بے زر اور مفلس عاشق سے نہایت ہی سرد مہری کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور اس کی دلدہی اور دلنوازی تو کجا اس کا اس طرف گزرنا ہی تمسخر اور استہزا کا موجب ہوجاتا تھا۔ پھر بھی وہ اس مستقل مزاجی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے جو فطرت نے کافی سے زیادہ مقدار میں اس کو بخشی تھی۔ ذلت سے مستغنی ہوکر ان کے خراب نار گھروں کا اسی طرح چکر لگاتا رہا۔ گویا اس کا یہ فرض ہی تھا۔ خدانخواستہ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ اس کا دامن کسی معصیت سے بھی آلودہ ہُوا ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ وہی تو کلیم تھا جس کی نسبت مشہور تھا۔ کہ اس

نے ایک رنگین ادا سے جس کو جسے اس کی اٹھتی جوانی اور متناسب الاعضا بدن پسند تھا عین مجمع عام میں جب وہ اس کی طرف خاص طور پر مخاطب ہو کر اپنی آنکھوں کی تبسّم آفرین بجلیاں گرا رہی تھی۔ حسرت کا یہ مشہور شعر سُنا دیا تھا۔ کہ ؎

ہزار عشق تری چشم نیم وا پہ نثار
نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب، رہنے دے

اتفاق ایک ڈاکٹر کی زرّیں رائے کی صورت میں رونما ہُوا۔ اور کلیم کی علالت طبع کا علاج ایک گاؤں کی صاف اور معتدل آب و ہوا قرار دی گئی۔ ہم وہاں صبح کے وقت پہنچے۔ فلک نیلوفر کا ایک پہلو قرمزی رنگا ہُوا تھا۔ گویا کسی مجروح کبوتر کا پہلو گرم گرم خون دے رہا ہو۔ ہر طرف ایک سکوت طاری تھا۔ مجھے وہ منظر کبھی نہ بھولیگا۔ وُہ کھلیان۔ وہ محافظ کا چھوٹا سا مکان۔ وہ چند خود رو پھول جو رات کی باد تند کی تاب نہ لا کر گر پڑے تھے۔ ایک خاموشیِ مطلق جس میں ہوا اپنی نغمہ پرور موجوں سے اس انجماد کو توڑنے کی ناکام کوشش کرتی۔ یکایک دُور سے سُورج کی ایک کرن پھوٹتی ہُوئی دکھائی دی۔ اور ہنگامۂ کار شروع ہو گیا۔ دور افق کے پاس کسان اپنے اپنے بیلوں کو لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے نقطۂ نظر معلوم ہوتے تھے عورتوں نے اپنی فطرت نسوانی کے تقاضے سے ایک جنگِ گفتگو

چھیڑ رکھی تھی۔ اور اپنے اپنے گھڑوں کو اپنی کمر پر رکھے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ مَیں نے کلیم کی طرف دیکھا۔ وُہ آہستہ آہستہ گن گن کر قدم رکھتے ہُوئے۔ زمین پر نظر گاڑے اپنی چھڑی سے مثلث اور مستطیل شکلیں بناتا ہُوا چل رہا تھا۔ گویا گرد و پیش کی گوناگوں دلچسپیوں سے بالکل بیخبر ہے۔ عین اس وقت میری نگاہ ایک دہقانی دوشیزہ پر پڑی جو میرے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میانہ قامت گداز جسم نزاکت سے کہیں دور، مگر شباب صحت اور تناسب اعضاء نے ایک عجیب پیکر رعنائی بنا رکھا تھا۔ الّڑپن کی ادا سے۔ اپنے بائیں کولے پر گھڑا رکھے ہُوتے جا رہی تھی۔ اس قدرتی لچک نے جو گھڑے کے بوجھ کی وجہ سے اس کی کمر میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی چال کو بہت کچھ محشر خرام کر دیا تھا۔

"شہری لڑکیوں اور دہقانی دوشیزہ میں کسقدر فرق ہے۔ وہ دھاں پان ہستیاں جو تمام دن کنگھی چوٹی کے بکھیڑوں سے فرصت نہیں پاتیں۔ اور اپنی نسبت یہ سُننا چاہتی ہیں۔ ؎

پائینچے جب کہ اس پری نے اُٹھائے
مَیں یہ بولا خُدا کمر کو بچائے

جن کا پُر تکلف حُسن اس بات کا متقاضی رہتا ہے۔ کہ "دست مرہونِ حنا۔ رُخسار رہنِ غازہ ہو" جن کے

شباب کی کیفیتیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ایک لاجونتی کے پھول کی طرح ہوتی ہیں۔ کہ چھونے سے مرجھانا یقینی ہے۔ اس سادہ شرمیلی لڑکی سے کیا تعلق رکھتی ہیں؟

مَیں انہیں خیالات میں مستغرق تھا کہ کلیم نے ایک نمایاں اضطراب سے میرا شانہ جھنجوڑا۔ اور اپنی چھڑی سے اس دوشیزہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

" دیکھتے ہو۔ صنّاع کی نقاشی، حسن کا بہترین نمونہ" اور اتنا کہہ کر گردن جھکالی۔

اب وہی کلیم بلند پرواز کلیم۔ اسفل نشینان ہوس پرست کے درمیان اوندھے مُنہ آپڑا ہے۔ اور کسی کی جُرأت نہیں ہوتی۔ کہ اس معمے کو حل کرے !!!

سیّد عابد علی عابدؔ

رشحاتِ فکری

کہتی ہے وہ چتون مری درمانِ طلبی سے
اِک مَیں ہوں کہ اب بھی مجھے امیدِ وفا ہے
ظالم تجھے آرائشِ گیسو کی قسم ہے
اُس دِل کو سمجھتا ہوں مَیں آسودۂ حسرت
لو ہو گیا بیمار بھی رخصت شبِ وعدہ
ممکن نہیں ہو خاطرِ ناشاد شگفتہ

اب بھُول کے بھی دل کو لگانا نہ کسی سے
اِک وہ کہ پشیمان نہیں پیمان شکنی سے
آزردہ نہ ہونا مری آشفتہ دلی سے
جو دِل ہے مسخر تری جادو نظری سے
کچھ کہہ کے اشاروں میں چراغِ سحری سے
غنچوں کے تبسّم سے، نسیمِ سحری سے

کچھ تجھ کو خبر بھی ہے ارے او ستم آرا
کیا حال ہے فکریؔ کا تری بے خبری سے

فکریؔ

ترکِ تنقید

ایم ۔ اے پاس کرنے کے بعد مَیں لاء کالج میں داخل ہُوا ۔ تو دل میں شاعری کا شوق چرایا ۔ دن کے کئی کئی گھنٹے باغ میں گزرنے لگے ۔ کھانے پینے کی سُدھ نہ رہی ۔ سوچتا تھا ۔ چند ہی دن کی بات ہے ۔ پھر میرا نام بنگال کے گوشے گوشے میں گونجنے لگیگا ۔ مگر کئی ماہ کی متواتر مشق کے بعد معلوم ہُوا ۔ کہ قسمت نے مجھے اس کام کے لئے پیدا ہی نہیں کیا ۔ جہاں جہاں نظم بھیجی ۔ واپس آگئی ۔ تاہم مَیں نے حوصلہ نہیں ہارا ۔ اور استقلال کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا ۔ اب مَیں نے سوچا ۔ کہ تنقید نگاری کرنا چاہیئے ۔ بنگال میں نقادوں کی بہت کمی ہے ۔ شاعر نہ بن سکا تھا ۔ شاعروں کا دشمن بن گیا ۔ اور مختلف ماہوار رسالوں میں مشہور اور کامیاب شاعروں کے کلام پر سخت تنقید کرنے لگا ۔ میرے نام کی چند ہی دنوں میں دُھوم مچ گئی ۔ جو کام اظہارِ کمال سے نہ ہو سکتا تھا ۔ اُسے نکتہ چینی نے کر دکھایا ۔ اب میرے غرور کا ٹھکانا نہ تھا ۔

میری جماعت میں ایک نوجوان سوشیل چندر پڑھتے تھے ۔ وہ شعر و شاعری کے مشتاق تھے ۔ بدقسمتی سے اُنہوں نے یہ سمجھ لیا ۔ کہ مَیں اس فن کا جوہری ہوں ۔ سب مجھے اپنی نظمیں دکھانے لگے ۔ اُن میں شیرینی تھی ۔ جدّت تھی ۔ اور تخیّل تھا ۔ مگر اس پر بھی مَیں نفرت سے سر ہلا دیا کرتا تھا ۔ اور زبردستی نقص نکالنے لگتا تھا ۔ کہیں قواعد کی غلطی کہیں وزن کی غلطی ۔ اور کہیں الفاظ کے استعمال کی غلطی بتا دیا کرتا تھا ۔ اور اگر اور کچھ نہ ملتا ۔ تو کہہ دیتا ۔ اس میں شعریت نہیں ہے ۔ دِل پر تاثیر ہی نہیں ہوتی ۔ کبھی کہتا ۔ شعر کا خیال اچھّا ہے ۔ مگر الفاظ کی بندش چُست نہیں ۔ کبھی کہتا ۔ الفاظ تو اچھّے ہیں ۔ مگر خیال بڑا پست ہے ۔ کوشش کئے جاؤ ۔ کسی دِن آفتاب بن کر چمکو گے ۔ آہستہ آہستہ سوشیل کو میری قابلیّت پر شبہ ہونے لگا ۔ اُنہیں یقین ہو گیا ۔ کہ مَیں صرف نقص ہی نکالنا جانتا ہوں ۔ اس سے آگے میری رسائی نہیں ۔ نتیجہ یہ ہُوا ۔ کہ اُنہوں نے اپنے اشعار مجھے سنانا بند کر دیئے ۔ مَیں بے قرار سا ہو گیا ۔ بار بار خیال آتا تھا ۔ کہ سوشیل چندر کو یہ کیا خیال ہو گیا ۔ کہ میری رائے غیر درست ہوتی ہے ۔ انہیں دیکھکر مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا ۔ جیسے وُہ میری ہتک کرنے پر تُلے ہُوئے ہیں ۔ آخر ایک دِن شام کے وقت وہ میرے کمرے میں آئے ۔ اور ایک نظم مجھے دیکر کہنے لگے ۔ اس پر مَیں نے سارا زورِ قلم صرف

کردیا ہے۔ ذرا دیکھئے کیسی ہے؟

کئی دن کے بعد موقع ملا تھا۔ میں نے فوراً قلم پکڑ کر اصلاح دینا شروع کردیا۔ نظم نہایت دلکش اور پُر زور تھی۔ مگر اس میں غلطیاں نہ دکھاتا۔ تو مجھے نقاد کون مانتا۔ دُنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں۔ جو اظہار کمال کا واحد ذریعہ عیب جوئی ہی کو سمجھتے ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک تھا۔ نظم میں کل بیس شعر تھے۔ میں نے چالیس غلطیاں دکھاکر کہا۔ خیال بڑا اچھا ہے۔ مگر اکثر غلطیاں کر جاتے ہو۔ زبان کی طرف ذرا زیادہ توجہ کیا کرو۔

سوشیل چندر کا چہرہ چمکنے لگا۔ جیسے امتحان میں پاس ہو کر طالب علم خوش ہو جاتا ہے۔ اُنہوں نے جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر میرے سامنے رکھدی۔ اور کہا۔ صفحہ بیس دیکھئے تو

میرا خون جم گیا۔ یہ کیا۔ وہ نظم سوشیل کی اپنی نہیں۔ بنگال کے بہترین شاعر بابو رابندرناتھ ٹیگور کی نقل تھی۔ اور میں نے لاعلمی میں اُسی پر قلم چلادیا تھا۔ ندامت سے میری گردن جُھک گئی۔ میں نے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر بے فائدہ۔ چہرے کا رنگ میرے دل کی حالت کا مکمل اظہار تھا۔

مگر اس واقعہ سے میں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ بلکہ شاعروں کا اور بھی دشمن بن گیا۔ اکثر سوچا کرتا تھا۔ کہ جب میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ تو اُن کا کیا حق ہے۔ کہ اس کوچہ میں قدم رکھنے کی جرأت کریں۔ میں تنقید کی لاٹھی لیکر اس کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ کہ نئے آدمیوں کو اندر داخل نہ ہونے دونگا۔ میری تنقید نہایت سخت ہوتی تھی جس کے خلاف لکھتا تھا۔ اُسے مہینوں شعر کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر "باسنتی" رسالہ میں ایک عورت سرسوتی دیوی کا نام گونجنے لگا۔ اُس کی نظمیں نہایت رنگین، دلفریب اور ترنم ریز ہوتی تھیں۔ اُن میں دلکشی اور شیرینی بھی بہت ہوتی تھی۔ مگر مجھ پر اُن کا اثر نہ ہوتا۔ اُستاد کتنا بھی لائق ہو۔ انسپکٹر اُسے نگہ نفرت ہی سے دیکھنا اپنی قابلیت کا اظہار سمجھتا ہے۔ میں نے دو تین مہینے انتظار کیا۔ مگر سرسوتی کی نظمیں برابر شائع ہوتی گئیں۔ اس کے بعد میں نے "اودسر" میں اُن پر تنقید کی۔ اور لکھا۔ کہ وہ زمانہ گیا۔ جب عورتوں کی تعریف صرف اس وجہ سے کی جاتی تھی۔ کہ وہ صنف نازک میں سے ہیں۔ اُس وقت اچھا لکھنے والی عورتوں کی تعداد محدود تھی۔ مگر اب تو بہت سی عورتیں اس میدان میں مردوں سے بھی گوئے سبقت لے جا رہی ہیں۔ اس لئے اب ضرورت نہیں۔ کہ ہم کسی عورت کی صرف عورت ہونے کے باعث تعریف و ثنا کریں۔ اب تو ان کی قابلیت دیکھی جائیگی۔ اور اسی معیار پر فیصلہ کیا جائیگا۔ کہ اُن کا کلام اس قابل ہے یا نہیں۔ کہ اُسے دُنیائے ادب میں جگہ

دی جاتے۔ ادب تباہ ہو جائیگا۔ دنیائے کتب میں انحطاط شروع ہو جائیگا۔ اگر نقادان ادب نے اس ضروری سوال پر کامل احتیاط کے ساتھ توجہ نہ کی"۔

لیکن یہ دیکھکر مجھے کسقدر تعجب ہوا۔ کہ میری اس تنبیہ کا سرسوتی دیوی پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اُس نے "باسنتی" کے تازہ نمبر میں اور دو تین نظمیں شائع کرائیں۔ جن میں سے ایک تو خاص طور پر میرے لئے تھے۔ مگر چوٹیں ایسے طریقہ پر کی گئی تھیں۔ کہ سوائے میرے کوئی دوسرا نہ سمجھ سکتا تھا۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے فوراً اس کی تازہ نظموں پر ایک زبردست تنقید کی۔ اور اُسے بدترین قسم کی شاعری ثابت کرکے آخر میں لکھا۔ پرماتما نے کسی کو شعر کہنے کا مذاق دیا ہے۔ کسی کو شعر سمجھنے کا۔ اُنہوں نے سب کو شعر کہنے کی قابلیت کیوں نہیں دی؟ اسے بہت تھوڑے آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر جن میں یہ قابلیت نہیں ہے۔ اُنہیں پرماتما نے شعر کہنے اور اپنے آپ کو شاعر کہلانے کا شوق کیوں دیا ہے؟ اسے اُس سے بھی کم آدمی سمجھ سکتے ہونگے"۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ میں نے تنقید کا مضمون لیپ پر رکھدیا۔ اور آپ پلنگ پر لیٹ کر سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اُس وقت خیال آیا۔ کہ میری تنقید تعصب پر مبنی ہے۔ سرسوتی کی نظموں پر جو خیالات میں نے ظاہر کئے ہیں۔ وہ اُن کے قابل نہیں۔ اُن میں کئی خوبیاں تھیں۔ اور بعض مقامات پر تو دل رقص کرنے لگ جاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے سرسوتی کسی گمنام باغ کا ایک پھول ہے۔ جو مقدور بھر اپنی خوشبو سے ہوا کو معطر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور میں اُسے توڑ کر مٹی میں ملانا چاہتا ہوں۔ میرے خیالات تبدیل ہو گئے۔ فیصلہ کیا۔ کہ اسے ذرا نرم کر دونگا۔ آخر عورت ذات ہے۔ اس قدر سخت لکھنا مردانگی سے بعید ہے۔

صبح کو دیر میں آنکھ کھلی۔ اُس وقت چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ رات کی تاریکی میں جو فیصلہ کیا تھا۔ اُسے دن کی روشنی نے زائل کر دیا۔ تنقید کو نرم کرنے کا خیال جاتا رہا۔ میں نے ایڈیٹر اودسر کے نام رجسٹری کرا کے بھیجدی۔ اور آپ مسٹر مکرجی کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہمارے لاء کالج میں پروفیسر تھے۔ اُن کے لڑکے کانتی چندر سے اور مجھ سے دوستانہ تعلقات تھے۔

اُس دن اتوار تھا۔ میں اتوار کو باقاعدہ پروفیسر مکرجی کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اس لئے وہ بھی میرا انتظار کیا کرتے تھے۔ اگر کسی دن دیر ہو جاتی تو آدمی بھیجدیا کرتے تھے۔ جب میں پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچا۔ تو دیکھا کہ وہ۔ اُن کے ایک دوست اور اُنکی بیٹی نروپما چائے پر میرا

انتظار کر رہے ہیں۔ مسٹر مکرجی اپنے دوست سے گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نروپما نے کہا "اب کے "باسنتی" میں سرسوتی دیوی نے پھر نظمیں لکھی ہیں۔ آپ پر خفیہ چوٹیں کی ہیں۔ آپ نے پرچہ دیکھا ہوگا؟"

میں نے جواب دیا "ہاں دیکھا ہے۔ رات اُن پر میں نے تنقید بھی لکھ ڈالی ہے۔ پڑھ کر اُس کی آنکھیں کھُل جائیں گی۔ اور نغمے الاپنا بھول جائیگی۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس ہتھوڑے کی چوٹ سے سرسوتی دیوی کے بنا کے تار ٹوٹ جائیں۔ اور اسے اپنا بے سرا راگ بند کرنا پڑے گا۔

نروپما ہنسنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرہ پر شادمانی کھیل رہی تھی

میں رسائل میں جو تنقید کیا کرتا تھا۔ اُس کے نیچے فرضی نام دیا کرتا تھا۔ اسے یا تو نروپما جانتی تھی۔ اور یا "اوسر" کا ایڈیٹر۔ کسی تیسرے آدمی کو اس کا علم نہ تھا۔ نروپما میری تنقید کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی اور سرسوتی کی نظمیں دیکھکر تو اُس کا خون جوش میں آجاتا تھا۔ اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ جو مردوں کا مقابلہ کرتے نہیں شرماتی۔ میرا حوصلہ اُس کی باتوں سے دگنا ہوجاتا تھا۔ وجہ یہ کہ نروپما معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اُس کے باپ نے اُسے اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ اور انگریزی کے ساتھ ساتھ بنگالی علم ادب کا بھی جوہری بنا دیا تھا۔ اُس کی حوصلہ افزائی سے میرے جوش میں اضافہ ہوجاتا تھا۔

نروپما نے میری بات سُنکر کہا۔ "تو اب کے آپ نے خوب لکھا ہے؟"

"اُس کے ہوش درست ہوجائیں گے۔ قلم پھینک دے گی۔"

"ہوں"

"آپ نے اس کی نظم "معافی" دیکھی؟"

"دیکھی ہے۔ آپ کے متعلق ہی تو ہے۔"

"پچھتائے گی۔"

نروپما نے کہا۔ "بیوقوف ہے۔ عورت ہو کر اتنا غرور اُسے زیب نہیں دیتا۔ جو جی میں آتا ہے۔ لکھ مارتی ہے۔"

میں نے تحمّل سے جواب دیا۔ "اس کی وجہ محض یہ ہے۔ کہ اُس کی تعلیم ادھوری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر غلطیاں نہ کرتی۔ اگر تم لکھنے کی کوشش کرو۔ تو خوب لکھو۔ مجھے اکثر تم پر غصّہ آتا ہے۔ کہ تم پڑھ لکھ کر قعرِ گمنامی میں پڑی ہو۔"

"تو سرسوتی دیوی کو چھوڑ کر نروپما دیوی سے جنگ چھیڑنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں نہیں۔ تم اگر شاعری کرو۔ تو میری تنقید ابھی

طرح کی ہوگی"

نروپما بولی "ایسا نقاد جس کے حق میں ہو۔ اگر وہ بھی شاعری نہ کرے۔ تو اُس کی بدنصیبی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے"

میں نے جواب دیا۔ "چند ہی دِنوں میں آسمان شہرت کا تارا بن جاؤ گی"

"دیکھئے صاحب! نقاد کے لئے یہ طرفداری سم قاتل ہے"

"یہ درست ہے۔ لیکن اگر میں تمہاری طرفداری نہ کروں تو یہ نہ صرف غلطی بلکہ گناہ ہوگا"

نروپما کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سُرخ ہوگیا۔ غصّہ سے بولی "تو غریب سرسوتی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ جو آپ اُس کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں"

میں شرمندہ سا ہوگیا۔ اور سر جھکا کر بولا "اُس کا نام پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے"

اس کے ایک مہینے بعد میں مکرجی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اُن کی بیوی سے اُن کا حال پوچھ رہا تھا۔ وہ اُسی دن دارجیلنگ سے لوٹی تھیں۔ کچھ فاصلے پر نروپما بیٹھی تھی۔ اور قدرتی مناظر کی تازہ تصاویر کو اپنے البم میں سجا رہی تھی۔ مکرجی کی بیوی نے کہا۔ "پرکاش! مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی۔ کہ تم اوّل نمبر پاس ہوئے ہو میرا شروع ہی سے خیال تھا۔ کہ تم کسی دن اپنا نام کروگے میں تمہیں تہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں"

اتنے میں نوکر آکر میز پر ایک رسالے کا پیکٹ رکھ گیا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ باسنتی کا تازہ پرچہ تھا۔ فہرست مضامین پر جلدی سے ایک نگاہ ڈالی۔ اس میں سرسوتی دیوی کی ایک نظم تھی۔ میں نے اُسے نکال کر دیکھا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ نظم کا عنوان تھا۔ نقاد۔ مضمون تھا مذاقیہ۔ مگر میرے جسم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"ایک باکمال مصوّر نے ایک حسینہ کی تصویر بنائی۔ اور اُس میں اپنی بہترین کوششیں صرف کردیں لیکن ایک بیوقوف نقاد نے اُسے اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ اور کہا۔ تصویر میں عورت کا سر نیچے اور ٹانگیں اُوپر دکھا کر مصوّر نے اپنی ناواقفیّت کا ثبوت دیا ہے۔ تصویر میں زمین کا رنگ آسمان کی طرح نیلا دکھایا گیا ہے۔ اور آسمان کا رنگ گھاس کے مانند سبز۔ حالانکہ اُلٹا ہونا چاہیئے تھا ——— میری رائے میں یہ تصویر بالکل لغو اور سراسر غیر قدرتی ہے"

میرا خون کھولنے لگا۔ اُس وقت مکرجی کی بیوی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ نروپما بدستور البم میں تصویریں لگا رہی تھی۔ میں نے رو کھے پن سے کہا "باسنتی کا تازہ پرچہ آگیا ہے"

نروپما نے میری طرف دیکھکر پوچھا۔" سرسوتی کی کوئی نظم تو نہیں ؟"

"ہے کیوں نہیں۔ اب کے تو بڑی سخت چوٹ کی ہے"

"کیا لکھا ہے ؟"

"پڑھ کر دیکھ ہی نہ لو"

نروپما نے نظم پڑھی اور چند لمحے خاموش رہی۔ اس کے بعد بولی" پرکاش بابو۔ یہ بڑی سخت بیہودگی ہے۔ آپ کو اس کا تدارک کرنا چاہئیے۔ اس عورت کی یہ مجال کہ آپ کے منہ اس طرح سے آنے کی جرأت کرے"

اس وقت نروپما کی آنکھیں غصہ سے لال ہو رہی تھیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نظم سے میری نسبت اس کو زیادہ رنج پہنچا ہے۔ مگر میں نے یہ کہکر ٹال دیا۔ کہ جانے دو۔ میں خاموشی اختیار کرونگا۔ یہ اس کے لئے بہترین سزا ہے۔ ایسی لغو نظم کا جواب دینا اسے بے جا وقعت دینا ہے۔ میری خاموشی دیکھ کر تو تلملا جائیگی۔ سمجھے گی یہاں اس کی پرواہ ہی نہیں"

نروپما نے آہستہ سے جواب دیا۔" اچھا یہ بھی ٹھیک ہے"

چار پانچ دن گذر گئے میں سوچتا تھا۔ کہ اب کیا کرنا چاہئیے۔ کہ ایک دن مکرجی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میں تمہارے ساتھ نروپما کا بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ پڑھ کر میرا دل شگفتہ ہو گیا۔ جیسے پھول کی کلی پانی کے چھینٹوں سے شگفتہ ہو جاتی ہے۔ میرا پہلے ہی سے یہ خیال تھا۔ کہ یہ رشتہ ہو جائیگا۔ مگر پھر بھی یہ خط دیکھکر مجھے بہت خوشی ہوئی نروپما کا بھولا بھالا حسین چہرہ سامنے آگیا۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کے حکم سے میں باہر نہیں ہوں۔ مگر پھر بھی یہ لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اس معاملہ میں نروپما سے بھی مشورہ لے لینا چاہئیے۔ اس کے جواب میں مکرجی نے لکھا کہ شام کی چائے یہیں پینا۔

شام کو میں مکرجی کے ہاں پہنچ گیا۔ مگر وہاں مکرجی اور اُن کی بیوی دونوں نہ تھے۔ نروپما نے ہنستے ہوئے کہا۔ آیئے پتا جی اور ماتا جی ذرا گھر سے چلے گئے ہیں۔ ابھی لوٹ آئیں گے۔ آپ کو اُن کی واپسی تک یہیں بیٹھنا ہوگا"

مکرجی کے سیر کو چلے جانے کی وجہ میں فوراً سمجھ گیا مسکرا کر بولا۔" چائے میں چینی کی بجائے۔ اگر نمک ڈال دو۔ تو میں نمک حرامی نہیں کرسکونگا"

" بالکل درست۔ ایسے آدمیوں کی کمی نہیں۔ جن کو قابو میں کرنے کے لئے چینی کی شیرینی کی بجائے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے"

میں نے نروپما کو اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ نگاہ میں فرق پڑ گیا تھا۔ اب میں اس خیال سے دیکھتا تھا کہ اس میں کوئی نقص تو نہیں۔ مگر نروپما کو کوئی پتہ نہ تھا۔ اس

کے چہرے پر کیسا بھولا پن تھا۔ کانوں میں ہلتے ہوئے بندے کیسے خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں کیسی چمک تھی۔ میرا دل رقص کرنے لگا۔

نرو پما نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ دی اور کہا۔ "پیجئے! آپ گرم چائے ہی پسند کیا کرتے ہیں"۔

ہائے! معصوم لڑکی!! پرکاش بابو اُس وقت جو آبحیات پی رہے تھے۔ اُس کے مقابلے میں اس چائے کی کیا حقیقت تھی۔ میرا خون اُس وقت ویسے ہی گرم ہو رہا تھا۔ اُسے چائے کی گرمی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مَیں نے کہا۔ "نرو"۔ اور اس سے آگے حلق بند ہو گیا۔ محبّت کا فقرہ مُنہ سے کہنا کتنا مشکل ہے۔ میرے چہرے پر پسینہ آگیا۔

نرو پما نے تعجب سے جواب دیا۔ "کیوں پرکاش بابو! کیا ہے؟"

مَیں نے سنبھل کر کہا۔ اب ہم آپس میں "آپ" کا لفظ چھوڑ کر "تُم" کہنا شروع کریں۔ آپ میں کتنا تکلف ہے کتنا بوجھ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اجنبی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر "تُم" کتنا ملائم ہوتا ہے۔ اسے زبان کتنی آسانی سے کہہ جاتی ہے۔ اس میں کیسی بے تکلفی، محبّت اور شیرینی بھری ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ کیسا ثقیل ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو تُم کہہ کر بُلایا کریں۔ تو کیسا؟

نرو پما نے قدرے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "آج آپکی باتیں حیرت میں لانے والی ہیں"۔

مَیں نے کہا۔ "ایک بات کہوں؟"

"کیا کہنا ہے۔ جلد کہہ ڈالئے"۔

مَیں نے مکرجی کا خط نکال کر نرو پما کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

نرو پما نے اُسے پڑھ کر تہ کر دیا۔ اور میرے ہاتھ میں واپس دے دیا۔ اس کے بعد وہ کُرسی پر بیٹھ گئی اور فضا میں نگاہیں جما دیں۔ مَیں نے پُوچھا۔ "نرو پما کیوں؟"

نرو پما کے چہرے پر انتشار کے آثار نمایاں تھے۔

مَیں نے کہا۔ اگر تمہارا ارادہ نہ ہو۔ تو تم صاف کہہ دو۔ مَیں تم سے زبردستی بیاہ نہیں کرونگا"۔

نرو پما پھر بھی چُپ رہی۔ بظاہر وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

مَیں نے پھر کہا۔ "کیا خیال ہے۔ شرم کی کوئی وجہ نہیں۔ تُم کو جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ مَیں ہر جواب کے لئے تیار ہوں"۔

نرو پما آہستہ آہستہ بولی۔ "مجھے ایک بات کہنا ہے"۔

"کیا؟"

نرو پما نے میری طرف دیکھتے ہوئے اور مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "باسنتی میں نظمیں لکھنے والی گستاخ عورت سرسوتی دیوی مَیں ہی ہوں"۔

مَیں سناٹے میں آگیا۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کیا یہ

ہوسکتا ہے میرے دل کی اس وقت جو حالت تھی اُسے کون جان سکتا ہے؟

مگر پھر بھی شادی ہوگئی۔

نروپما اب پہلے سے بھی زیادہ جوش سے لکھتی ہے۔ اس کی نظموں کی سارے بنگال میں دھوم مچ گئی ہے۔ لیکن مَیں نے تنقید لکھنا ترک کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے کبھی کبھی اصرار کرتی ہے۔ کہ کچھ لکھو۔ مگر مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ گنجا تاڑ کے نیچے نہیں جائیگا۔ اس فیصلہ کی تہ میں کیا وجہ پوشیدہ ہے۔ اسے مَیں نہیں سمجھتا شاید ناظرین سمجھتے ہوں۔

ماخوذ سدرشن

جوش

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

خود کبھی تُم نے نہ ذکرِ دلِ ناشاد کیا
میرے کہنے سے کیا یاد تو کیا یاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں قسمت کا گلا
جن کو تیرے نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، مَیں نے تجھے یاد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جُھک کے مَیں نے یہ کہا "مجھ سے کچھ ارشاد کیا"

جاگ اُٹھی رُوح مری مست پپیہے! شاباش
تو نے مرجھائے ہُوئے دل کو مرے شاد کیا

پھول بیدار ہوئے، سبزے نے انگڑائی لی
صبح نے کیا لبِ جاں بخش سے ارشاد کیا

قیدِ ہستی و عدم، بند یہ معمولی ہیں
خود "مری" قید سے دل نے مجھے آزاد کیا

میری تحقیق نے ہر چیز میں دُنیا دیکھی
ذرّہ ذرّہ کو مرے فکر نے آباد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں، تُم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تُم نے مجھے برباد کیا

میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد آمرے
مَیں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا

جوش اب غدر سے پہلے کا تغزل چھوڑو
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

جوش

شمعدان

ساکا اسمر نعت، اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا لڑکا، کچھ چیز، جسے اس نے اخبار میں نہایت احتیاط کے ساتھ لپیٹ رکھی تھی۔ اپنی بغل میں دباتے ہوئے شہر کے مشہور و معروف ڈاکٹر "مسٹر کوشلف" کے ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہا۔ اخاہ! ساکا۔ آج تم صبح ہی صبح کس طرح آتے۔ کہو اب کیا حالت ہے۔

ساکا نے مودبانہ جواب دیا "جناب، خدا کی عنایت اور جناب کی پرورش سے اب میں بالکل تندرست ہوں۔ میری ماں نے بکمال ادب دست بستہ جناب کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔ اور مجھے اس غرض سے جناب کے در دولت پر بھیجا ہے۔ کہ میں جناب کے احسانات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کروں۔ جناب ڈاکٹر صاحب میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں، جناب نے مجھے اس موذی و مہلک مرض سے نجات دی جس سے جانبر ہونیکا شائبہ بھی نہ تھا۔ اور ہم سخت حیران ہیں۔ کہ کس طرح جناب کا شکریہ ادا کریں!"

ڈاکٹر نے قطع کلام کرکے نرم و ملائم لہجہ میں کہا۔ نہیں نہیں، ایسی معمولی بات کا ذکر نہ کرو۔ میں نے وہی کیا۔ جو ہر انسان کا فرض ہے۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا۔ تو وہ بھی یہ ہی کرتا"

ساکا بولا "جناب میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں آپ خوب واقف ہیں۔ کہ ہم کسقدر غریب و مفلس ہیں۔ اور کسی طرح بھی جناب کے احسانات کا بدل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہم — یعنی میری ماں اور میں اس کا اکلوتا لڑکا۔ ہم جناب کے نہایت ممنون ہونگے۔ اگر جناب اس تحفہ حقیر کو جو ہمارے دلی شکریہ کی علامت ہے۔ قبول فرما کر ہمیں مسرور و مطمئن ہونے کا موقع عطا فرمائینگے۔ یہ ایک صناع کے بیش بہا اور بہترین صنعت ہے۔ اس کو اختراع فائقہ کہہ سکتے ہیں"

ڈاکٹر نے گردن ہلائی اور بولا "ہرگز نہیں میں نہیں چاہتا کہ تم فضول یہ تکلیف برداشت کرو"

ساکا نے اخبار کو آہستہ آہستہ اُوپر سے ہٹاتے ہوئے کہا" جناب ڈاکٹر صاحب انکار نہ کیجئے۔ اگر جناب نے اسے منظور نہ فرمایا۔ تو مجھے اور میری ماں کو سخت صدمہ پہنچیگا۔ یہ میرے باپ کا ہے۔ جسے آپ جانتے ہیں ایسی چیزیں حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اور ہم نے اتنی مُدّت سے نہایت احتیاط سے اس کی یادگار کے طور پر رکھ چھوڑا تھا لیکن اب ہم نے یہ بیش بہا صنعت' جناب کو نذر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

آخرکار ساکا نے اس چیز کو اخبار سے نکال کر' ایک اندازِ افتخار کے ساتھ' میز پر رکھ دیا۔ اب ڈاکٹر نے اپنی نگاہوں کے روبرو ایک نہایت عمدہ' نفیس اور خوبصورت کانسے کا شمعدان دیکھا۔ جو سخت مشقت سے تیار کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پیندے پر دو عورتوں کی عریان مورتیں تھیں۔ جنہیں کاریگر نے مقدس مریم کی شکل و شباہت پہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے سروں پر دو چراغدان بنے ہوئے تھے۔ اور ان کے بشرہ سے آثار حیرت ۔ لیکن یقیناً نہ مجھ میں اتنی جرأت نہ قابلیت' کہ ان مورتوں کی صحیح تصویر زبان قلم سے مفصل طور پر کھینچ سکوں۔ ان کے حسین چہروں پر ایک ہلکا سا عشوہ پرداز تبسم تھا۔ اور اس درجہ شوخی مترشح تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی مفوضہ خدمت (یعنی چراغدانوں کو سر پر اُٹھائے رہنا) کے چنداں پابند نہیں۔ اور جس وقت ان کی مرضی ہو گی' وہ پیندے سے علیحدہ ہو کر اپنا وحشیانہ رقص شروع کر دینگی۔ جس کا تخیل بھی غالباً باعثِ صد اضطراب ہے۔

ڈاکٹر نے اس تحفہ کو کافی عرصے تک خوب غور سے دیکھنے کے بعد اپنی گدی سہلائی۔ اور کہنے لگا" بیشک" یہ اچھی صنعت ہے۔ گو ہم اسے اعلیٰ درجے کی تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ صنّاع کو نقل مطابق اصل بنانے میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ بلکہ بالفاظ دیگر. . . . . مگر میں تمہیں کس طرح سمجھا سکتا ہوں۔"

ساکا نے حیرت سے پُوچھا" کیوں؟ جناب کا اس سے کیا مطلب ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا" بات اصل یہ ہے۔ کہ اگر میں ایسی نامعقول چیز یہاں رکھونگا۔ تو تمام مکان کو یہ بدنما کر دیگی؟"

ساکا نے رنجیدہ ہو کر کہا" ڈاکٹر صاحب فن صنعت کے متعلق' جناب کے عجیب و غریب خیالات سُنکر مجھے سخت حیرت ہے۔ جناب اسے ذرا نظر انصاف سے ملاحظہ فرمائیں کیسی نفاست کیسی پاکیزگی کیسی اُستادی سے بنائی گئی ہے۔ کہ اسے "صنعت مجسم" کہنا چاہئے۔ ایسی مقدس مورتوں کے دیکھا کرنے سے آدمی تمام دُنیوی مصیبتوں اور آلائشوں سے پاک ہو کر فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔ اس کی کاریگری' اس کی ساخت اور چہرے

سکے خدو خال بلاحظہ فرمائیے۔ بالکل زندگی کے علامات پائے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یقیناً! اس میں تو شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اور میں خود بھی ان تمام خوبیوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن سوچو تو! میرے کمرے میں عورتیں، لڑکیاں، بچے، سب آتے ہیں۔"

ساکا نے قطع کلام کرکے کہا۔ "جی ہاں، اس میں تو کچھ شک نہیں کہ اگر اس بہترین صنعت کو سطحی نظروں سے دیکھا جاتے۔ تو چنداں قابل وقعت نہیں۔ لیکن جناب ڈاکٹر صاحب آپ ذی فہم اور قدردان شخص ہیں۔ جناب کو عام آدمیوں سے بالاتر نگاہوں سے دیکھنا چاہئے۔ اور علاوہ ازیں اگر جناب نے اس کی قبولیت سے اعتراض کیا۔ تو ہمیں حد درجہ ملال ہوگا۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ جناب نے مجھے از سر نو حیات تازہ بخشی، اور ہم جناب کو اپنی عزیز ترین اور گرانبہا شے نذر کرتے ہیں۔ اس بات کا سخت افسوس ہے۔ کہ ہم اس کے ساتھ کا دوسرا شمعدان حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاکہ جوڑا پورا ہو جاتا۔"

ڈاکٹر نے تنگ آکر کہا۔ "بہتر ہے، تم اسے یہاں چھوڑ جاؤ۔ میں اسے رکھنے کے لئے کوئی جگہ تجویز کرونگا میں ممنون ہوں۔ اور اپنی ماں کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔ لیکن ساتھ ہی میں کہتا ہوں۔ تم خود انصاف کرو کہ میرے پاس عورتیں بچے . . . . مگر میں سمجھا کس طرح سکتا ہوں۔ اچھا خیر میں اسے کسی جگہ رکھونگا۔" ۳

ساکا ڈاکٹر کا آخری جواب سُنکر نہایت محظوظ ہوا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "لیجئے جناب، اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ دیکھئے نا۔ جناب اس شمعدان کو اپنے قلمدان کے اُس جانب رکھ لیں۔ ہا کیسی لاچاری ہے کہ ہم اس کے ساتھ کا دوسرا جناب کو نذر نہ کر سکے۔ تاکہ زینت اور بھی دوبالا ہو جاتی۔ اچھا جناب، اس ہدیۂ حقیر کو شرفِ قبولیت بخشنے پر ہزاراں ہزار شکریہ کے ساتھ رُخصت۔"

ساکا کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے پھر شمعدان کو غور سے دیکھا، اپنی گدی سہلائی، اور کہنے لگا۔ "اس میں تو کچھ شک نہیں۔ کہ یہ اعلیٰ درجہ کی صنّاعی ہے۔ ہر دیکھنے والا اس بات کا اعتراف کریگا۔ اور پھر ایسی چیز کو ناقدری کے ساتھ پھینکدینا۔ انتہائی لغویت ہے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے۔ کہ اس کا یہاں رکھا رہنا بھی ناممکن ہے۔ کیا کرنا چاہئے۔ کوئی دوست بھی ایسا نہیں ہے۔ جسے دیکر گلو خلاصی حاصل کروں۔" دفعتہً ڈاکٹر کو ایک وکیل کا خیال آیا۔ جس نے اس کا کام نہایت جانفشانی سے بلا معاوضہ کیا تھا۔ "ہاں۔ ہاں، ٹھیک ہے۔ گو وہ معاوضہ

لینے سے انکار کرتا ہے۔ مگر وہ یقیناً اس کو لینے سے انکار نہ کریگا۔ کیونکہ میں یہ اُسے تحفہ کے طور پر دونگا"۔

ڈاکٹر نے زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ اور معاً کپڑے بدل کر تیز قدمی کے ساتھ وکیل کے گھر پہنچا۔ خوش قسمتی سے وہ موجود تھا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر نے کہا! "وکیل صاحب، جو احسان آپ نے میرے اُوپر کیا ہے وہ میں مدت العمر فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ ہمیشہ معاوضہ لینے سے انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا آج میں ایک تحفہ حقیر آپ کی نذر کرنے لایا ہوں۔ ایک بہترین صنعت مجھے کہنا چاہیے۔ میں بکمال ادب مستدعی و ملتجی ہوں کہ آپ اسے منظور فرمائیں"۔

شمعدان کو دیکھکر وکیل جوش و خروش سے بڑی دیر تک اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان وعذب البیان رہا۔ آخر میں بولا۔ "کیا قوت تخیل ہے! یہ صناع لوگ بیٹھے بیٹھے کیا کیا اختراعات کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایسی نادر چیز آپ کو کیسے دستیاب ہوئی"۔ چند لمحوں میں وکیل کا جوش فرو ہوا۔ اور اس نے دروازہ کی طرف پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر نہیں، میں اس کو نہیں لے سکتا۔ آپ اسے فوراً واپس لے جائیں"۔

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں۔ آپ اتنے ڈرے کیوں جاتے ہیں"۔

وکیل نے جواب دیا۔ "جناب میری ماں، یہاں آتی ہے۔ میرے موکلوں اور نوکروں کی ہر وقت آمد و رفت رہتی ہے۔ میں اسے یہاں کس طرح رکھ سکتا ہوں؟"

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "جناب آپ بڑی ناشکری کر رہے ہیں۔ ایسی نادر صنعت کے لینے سے انکار گویا کفران نعمت ہے۔ اس کو "صنعت مجسم" کہنا چاہیے۔ آپ از بہر خدا انکار نہ کریں۔ ہاں اگر مجھے رنجیدہ کرنا مقصود ہے تو خیر"

وکیل بولا "اگر یہ مورتیں صرف ......"

لیکن ڈاکٹر یہ عذر سننے کے واسطے نہ ٹھیرا اور اُس کو انکار سے منع کرتا ہوا۔ بالکل سیدھا گھر پہنچا۔ کیونکہ اسے تو اس تحفہ سے جان چھڑانی تھی۔

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وکیل نے بھی ڈاکٹر کی طرح شمعدان کو غور سے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف اُنگلیوں سے ٹھوکا۔ اور بولا "لاریب یہ ایک نادر صنعت ہے۔ اور اگر اس کو پھینک دیا جائے۔ تو ایک طرح کا جرم ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہاں اس کا رکھنا بھی غیر ممکن ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے۔ کہ کسی کو دیدیا جائے، مگر کسے؟

..... کیوں .... ہاں ہاں وہی شاشا ایکٹر ....
میں ابھی جا کر اسے دے آتا ہوں ..... ٹھیک ہے وہ ایسی چیزوں کی جستجو میں بھی رہتا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد وہی شمعدان نہایت احتیاط سے اخبار میں لپٹا ہوا اس کے دوست شاشا (جو تھیٹر کا ایکٹر تھا) کے پاس بھیج دیا گیا۔ جس میز پر وہ رکھا گیا تھا۔ اس کے آس پاس تمام دن ایکٹروں کا مجمع رہا۔ جو اس کی تعریف میں نہایت سرگرمی سے مصروف تھے۔ اور پھر جبکہ کمرہ وحشیانہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ ایک ایکٹرس دروازہ کے پاس آئی۔ اور چاہتی تھی۔ کہ اندر قدم رکھے۔ شاشا نے چلا کر کہا "مت آنا مت آنا۔ میں بالکل برہنہ ہوں!"

تھیٹر ختم ہونے کے بعد، شاشا نے شمعدان کو غور سے دیکھا۔ اپنے بازوؤں کو ہلایا اور کہا۔ "میں ایسی بیہودہ چیز کس طرح رکھ سکتا ہوں۔ یہاں ایکٹرس آتی رہتی ہیں اور یہ ایسی چیز بھی نہیں کہ بعجلت دراز میں رکھ لی جاسکے۔" اس کا نوکر بولا۔ "آپ اسے بیچ کیوں نہیں ڈالتے۔ یہاں ایک بڑھیا ہے۔ جو ایسی چیزیں بہت خریدا کرتی ہے۔ بس آپ میڈم اسمرنف کو دریافت کرلینا۔ ہر شخص اس سے واقف ہے۔"

دوسرے ہی دن ایکٹر نے اپنے نوکر کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور بغیر وقت کے شمعدان بیچ دیا گیا۔

دو روز بعد ڈاکٹر کوشلکف اپنے کمرے میں انگلیاں پیشانی پر رکھے ہوئے کسی خیال میں مستغرق تھا۔ کہ دفعتاً دروازہ کھلا، اور ساشا اسمرنف ہانپتا کانپتا داخل ہوا۔ اس کا چہرہ فرط مسرت سے سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ چلّایا۔ "جناب ڈاکٹر صاحب، میں بہت مسرور ہوں کہ آخرکار ہم خوش قسمتی سے دوسرا شمعدان حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں، جناب نے میری جان بچائی۔" اور خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے شمعدان میز پر رکھا۔

ڈاکٹر سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا لیکن اس کی آواز گلے میں رُک گئی۔ اس کا منہ کھُلا رہ گیا۔

حیدر

غزل

تا صبح روبرو کوئی مست شباب ہے
بیداریوں سے بڑھ کے محبت کا خواب ہے

تعمیر کائنات میں مضمر ہے، سوز عشق
خورشید کے فراق میں ذرّہ خراب ہے

اے بیخودی عشق تو رسوا نہ کر مجھے
سرمستیِ نظر میں کسی کا شباب ہے

اللہ رے چشم مست کی کیف آفرینیاں
ناآشنائے مے بھی تو مست شراب ہے

اختر صفائے نفس ہے لازم پئے حیات
مانا طلسم خانۂ گیتی خراب ہے

لیلیٰ

یا

محاصرۂ غرناطہ

مصنفہ لارڈ لٹن

مترجمہ سیّد امتیاز علی تاج

فصل چہارم

باپ اور بیٹی

گذشتہ سے پیوستہ

جس حجرے میں لیلےٰ اضطراب کی حالت میں واپس آتی۔ وہ اسی مخصوص وضع کا تھا جس کا اندازہ اس کی طرزِ معاشرت کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش غرناطہ کے موروں سے مختلف تھی۔ یہ حجرہ زیادہ وسیع تھا۔ اور اس کی زیب و زینت سے مصری شان ٹپکتی تھی۔ دیواریں مشرقی سامانِ آرائش سے پیراستہ تھیں۔ اور ارغوانی زمین پر طلائی کام کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ خانہ دار گلڑوں اور بھاری چھت پر جیسے چوبیں ستون سہارے ہوئے تھے۔ کسی زبان کے عجیب و غریب حروف کندہ تھے۔ اور ستونوں کے گرد سونے اور ملمع کے سانپ لپٹے ہوئے تھے جس میں سے سبز رنگ کی روشنی اور زندگی کی سی چمک عیاں تھی۔

سنگِ مرمر کی میزوں پر مختلف قسم کے لکھے ہوئے اوراق۔ اور کئی قسم کے باجے بکھرے پڑے تھے۔ او ایک اکیلا چاندی کا مجلّی چراغ کمرے میں مدہم سی رو پھیلا رہا تھا۔ گو یہ تمام زیب و زینت نہایت شاندار تھی لیکن بحیثیت مجموعی اس کا اثر طبیعت میں افسردگی۔ پژمردگی اور گھبراہٹ پیدا کرتا تھا۔ حالانکہ غرناطہ کے عیش پسند مشرقی باشندوں کے خوشنما ایوانوں اور اس مُلک کے صاف آسمانوں کے نظارہ سے ایسا اثر پڑنا مناسب نہ تھا بلکہ ایسا اثر تو اُن غار نما عمارات کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا تھا۔ جو سیبہ اور ممفس کے باشندوں کو زمانہ قدیم میں آفتابِ افریقہ کی جُھلس دینے والی تمازت سے محفوظ

رکھتی تھیں۔

لیلےٰ اس کمرے میں کھڑی تھی۔ اس کا رنگ فق اور سانس تیز چل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کھُل گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ بلا رکھے تھے۔ اور اس کی تمام روح اس کے کانوں میں موجود تھی۔ اگر کسی ایسی نازنین اور ماہوش پری کا تصور کرنا ہو۔ جو کسی سنگدل اور بے رحم جن کے طلسمی محل میں مقید ہو۔ تو لیلےٰ کی اس حالت سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بدن چھریرا اور نازک تھا۔ اور نسائی حسن کے تناسب اور گداز سے معمور تھا۔ اس میں ایک اس قسم کی لچک اور شانِ نزاکت تھی۔ جیسے ایک سنگ تراش اپنے تخیل میں اُس وقت پیدا کرتا ہے۔ جب اُسے دُنیا سے اعلیٰ اور ارفع کسی آسمانی ہستی کی تصویر تیار کرنی ہو۔ اس کے گیسو گھنے اور سیاہ تھے۔ لیکن ان میں جو چمک۔ اور سنہری جھلک تھی۔ وہ اُن ایشیائی زلفوں سے مختلف تھی۔ جو شبِ دیجور کی طرح سیاہ ہوتی ہیں۔ اور گو اس کے چہرے کی رنگت قدرتاً زرد تھی لیکن ایسی صاف اور آب و تاب سے اس قدر روشن تھی۔ کہ ممالک شمالی میں بھی وہ حسین ہی سمجھی جاتی۔ اس کے خط و خال نازک تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نادر سلنچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ لبھانے میگوں میں محبوبیاں تھیں۔ اور اس کے اندر موتیوں کو شرمندہ کرنے والے دانت چمک رہے تھے۔ لیکن اس کے بے مثل حسین چہرے کا سب سے بڑا طلسم یہ تھا۔ کہ اُس پر ایک پاکیزگی و نزاکت برستی تھی۔ عشق کے حسیات لطیفہ نے جو اس قسم کے حُسن میں شاذ و نادر پاتے جاتے ہیں۔ اور جن سے موری دوشیزہ لڑکیوں کا ست اور ہوس انگیز شباب قطعاً ناآشنا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی دلربائی کو دوبالا کر رکھا تھا۔ لیلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ گویا اس مرمری بُت میں ایک روح بیدار تھی۔

چند لمحوں کے سخت فکر و تردد کے بعد وہ جالیدار غرفہ کے پاس گئی۔ آہستہ سے اُسے کھولا۔ اور باہر جھانکنے لگی۔ بہت دور درختوں کے درمیانی فاصلے میں اسے اِک لمحہ بھر کو اپنے عاشق کا رشک شمشاد اور شاہانہ قامت دکھائی دیا۔ جسکا سایہ سبزہ پر پھیلی ہوئی چاندنی کو تاریک کر رہا تھا۔ اس نے اب اپنی تلاش بے سود کے بعد ایک پر اشتیاق نظر اپنی محبوبہ کے دریچے پر ڈالی۔ اور گنجان پتّوں اور شاخوں کے چلمن نے اسے لیلےٰ کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا لیکن پھر بھی لیلےٰ نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ اور اس کے رُخساروں پر تشکر کے گرم آنسو اُبل آئے۔ وہ کمرے میں پڑے ہُوئے گدیلوں کے انبار پر دوزانو ہو گئی۔ اور بولی۔ "اے میرے آبا و اجداد کے خُدا میں تیرا شکر بجا لاتی ہوں۔ کہ وہ سلامت ہے"

ایک درد انگیز خیال اس کے دل میں گزرا۔ اور وہ بولی

"میں اس کے لئے کیسے دُعا کروں؟ ہماری جبین نیاز ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتی۔ اور مجھے تعلیم دی گئی ہے۔ کہ میں اس کے مذہب اور قوم سے حقارت، نفرت اور اُن کے نام سے وحشت کا اظہار کروں۔ میرے اللہ اس کا کیا انجام ہوگا۔ منحوس تھی وہ ساعت جب اُس نے سامنے کے باغ میں مجھے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اور اس سے زیادہ منحوس تھا۔ وہ لمحہ جب وہ دیوار پھاند کر اندر آیا۔ اور لیلیٰ سے کہنے لگا۔ کہ تجھ پر وہ شخص فدا ہے جس کی قوت بازو غرناطہ کی پشت پناہ ہے۔ اور جس کے نام پر غرناطہ رحمت بھیجتا ہے۔ آہ میں کیا کروں۔ ہائے مجھے کیا ہو گیا۔"

دوشیزہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ اور جذبات انگیز تصورات میں مستغرق ہو گئی۔ جن کے سکوں میں صرف اس کی سسکیاں خلل انداز ہوتی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح مسلسل رنج والم میں ڈوبی پڑی رہی۔ یکایک پردے آہستہ سے ہلے۔ اور ایک شخص جس کی پوشاک اور وضع عجیب و غریب تھی آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوا۔ لیلیٰ کو ایسی افسردہ حالت میں دیکھ کر رکا۔ اور ایک ایسی نگاہ سے اُسے دیکھنے لگا جس میں رحم اور نرمی اس کی جبلی سختی و درشتی سے کشمکش کر رہی تھی۔

آنے والے نے کہا "لیلیٰ"!

لیلیٰ چونک اٹھی۔ اور اُس کے چہرے پر حجاب کی تمتماہٹ جھلک آئی۔ اُس نے آنکھوں سے آنسو پ[ونچھ] ڈالے۔ اور مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کرتی [ہوئی] آگے بڑھی۔

"میرے ابا۔ تشریف لائیے"

نووارد گدیلوں پر بیٹھ گیا۔ اور لیلیٰ کو اپنے قر[یب] بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر نہایت متانت سے کہنے لگا۔ "یہ آنسو ا[و] تیرے رخساروں پر تازہ ہیں۔ یہ تیری قوم کے مصا[ئب] کے گواہ ہیں۔ ہماری بیٹیاں آنسو بہانے اور ہمار[ے] بیٹے درد سے کراہنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ عالیشان [...] کے سروں پر خاک اُڑ رہی ہے۔ اور حسینوں کے چش[موں] میں زہر ہلاہل گھلا ہوا ہے۔ اے کاش ہم صرف کشمک[ش] کر سکتے۔ کاش ہم میں حوصلہ ہوتا۔ کاش ہم اپنے سر اُ[ٹھا] سکتے۔ اور شیطان کی غلامی سے مخلصی حاصل کر[نے] کے لئے متفق ہو سکتے۔ ممکن ہے۔ یہ نہ ہو سکے۔ لی[کن] ایک تنہا شخص تمام قوم کا انتقام لیگا۔"

لیلیٰ کے باپ کا سانولہ چہرہ جو جوشیلے جذبات [کے] اظہار کے لئے بہت موزوں تھا۔ جوش غضب میں خوفناک ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اور [...] کانپنے لگے۔ لیکن جوش کا دورہ مختصر تھا۔ اور ابھی [...] اس کی تندی و غضبناکی پر پوری طرح کانپنے بھی نہ پا[ئے]

کہ وہ اک سکون میں تبدیل ہوگیا۔

" ان خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ تو عورت ہے۔ اور ابھی بچی ہے۔ اس لئے ان حالات کو دیکھنے کے لئے نہیں بنی۔ لیلےٰ تو نازو نعم میں پلی ہے اور بہت احتیاط سے تجھے تربیت دی گئی ہے۔ شاید میں تجھے تندخو اور سنگدل معلوم ہوتا ہوں۔ لیکن تیرے ایّامِ طفلی کو رنج و غم کی پھانس سے بچانے کے لئے میں اپنے خونِ دل کے بہترین قطرے گرانے کو تیار تھا۔ دیکھ خاموشی سے سُن۔ اس کے لئے تیار ہو جا۔ کہ تو ایک روز اپنی نسل کی مایۂ ناز بنے۔ تیرا وقت فضول لہو و لعب اور نکمّے مشاغل میں نہ گزرنے پاتے۔ تجھے وہ سبق دِئے گئے ہیں جن سے تیری صنف محروم رہتی ہے۔ موری لڑکیوں کے ناپاک و نجس خیالات تیرے لئے نہیں۔ ان کے شاہدان بازاری کے سے گیت۔ ان کے تباہ کن رقص تیرے لئے نہیں بنے۔ تیرے نازک اعضا۔ کو وہ انداز اختیار کرنا سکھایا گیا ہے جیسے فطرت ایک خدا کی عبادت کے لئے مخصوص کرتی ہے۔ تیری آواز کی موسیقی تیری اس درماندہ قوم کے گیتوں سے ہم آہنگ کی گئی ہے جو اپنے گناہوں کی یاد سے افسردہ اپنے بہادروں کے مبارک کارناموں سے پُر جوش۔ اور دعاؤں کے خشوع و خضوع سے مقدس ہے۔ ان صحیفوں اور ہمارے عزراؤں کی پند و موعظت نے تجھے ہمارے ایسے علوم اور ایسے واقعات تاریخی سکھلائے ہیں۔ جو تیرے دل و دماغ کو امید کامرانی سے معمور کردیں۔ اور جن سے تیرے دل میں ایک مقدس فرض کا احساس ہو۔ لیلیٰ۔ تو سُن رہی ہے؟"

لیلےٰ پریشان اور متعجب تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے اس کے باپ نے کبھی اس جوش سے گفتگو نہ کی تھی۔ دوشیزہ نے سادگی اور راستی سے اس طرح جواب دیا۔ کہ مستفسر کی گونہ تسلّی ہوئی۔ اور وہ لہجہ بدلکر ایک سنجیدہ اور متین آواز میں کہنے لگا۔

" تو ستانے والوں پر لعنت بھیج۔ اے عظیم الشان قوم یہود کی دختر! اُٹھ اور ظالم و جابر مور بادشاہ پر لعنت بھیج۔"

یہ کہتے کہتے لعنت بھیجنے والا خود اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کا داہنا ہاتھ بلند تھا۔ اور بایاں دوشیزہ کے شانے پر رکھا تھا۔ لیکن لڑکی ایک لمحہ کے لئے وحشت آمیز حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھکر ڈرتی ہُوئی اسکے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔ اور عاجزانہ طور پر انہیں دبا کر ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہنے لگی۔

"میرے اُوپر رحم کیجئے۔ رحم۔"

یہودی نے غضب و حقارت کی نگاہ سے اس کو اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ اُس کا ہاتھ از خود خنجر پر جا پڑا۔ آدھا خنجر باہر نکال لیا۔ مگر ایک لعنت کہنے

کے بعد اُس نے پھر نیام کر دیا لیکن پھر اسے باہر کھینچ کر لڑکی کے قریب پھینک دیا۔ اور ایک ایسی آواز سے جس میں سکون کی ناکام کوشش بھی شامل تھی۔ کہا "اوذلیل وخوار لڑکی! اگر تُو نے اپنے دل میں کسی ناپاک مور کی نسبت کسی ناجائز خیال کو جگہ دی ہے۔ تو اس کو نکال دے۔ بلکہ ضرورت ہو۔ تو اس خنجر کی امداد لے۔ خواہ موت کے ذریعے سے مخلصی حاصل کر۔ لیکن اس ہاتھ کو ایک ناروا فرض کے ادا کرنے سے بچا لے"۔

ضعیف شخص نے جلدی سے اپنے آپ کو لیلیٰ کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور بدقسمت لڑکی کو تنہا اور بیہوش چھوڑ کر چل دیا۔

(باقی باقی)

نوائے الست

جو سُن رہا ہے کیفِ مسرت سے مست ہے
وہ جامِ اہلِ دل جسے گیتی نما کہیں
کیا جانئے خیال نے پہنچا دیا کہاں
بے بود ہے نمود طلسمِ نظر فریب
اس درجہ تنگدل نہ ہو اے خاطرِ حزیں
بخشا نہ جائے گا گنہ اجتناب آج

ہنگامہ زا ہنوز نوائے الست ہے
عالم میں ہے اگر تو دلِ مے پرست ہے
اپنی بلندیوں سے ہر اک اوج پست ہے
ناداں بوہم سرخوش پندار مست ہے
ہاں مژدۂ قبول یہ دل کی شکست ہے
وہ "مے بنوش" برلب و ساغر بدست ہے

سلمےٰ مجھے ہے لذّتِ دیدار بھی شراب
ساقی کی چشم ساقیِ ساغر بدست ہے

سلمائے سہا

گلابی ساڑی

(ایک ایکٹ میں ایک مکمل کھیل)

اراکین

(شیریں۔ فیروزہ۔ جمشید۔ کاؤس)

منظر

(بمبئی میں ایک متوسط حیثیت کا ڈرائنگ روم)

(فیروزہ بیٹھی کوئی کپڑا سی رہی ہے۔ شیریں قریب ہی ایک کرسی پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے)

شیریں۔ نہیں خالہ اماں۔ ان مردوں کی ذات ہی بیوفا ہے۔

فیروزہ۔ شیریں۔ یہ تم کہہ رہی ہو؟

شیریں۔ کیوں خالہ اماں؟

فیروزہ۔ تمہاری کسی بات کا ٹھکانہ نہیں۔

شیریں۔ میں نہیں سمجھی۔

فیروزہ۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب جمشید تمہارے لئے ہر روز تحفے لے کر آیا کرتا تھا۔ تمام تمام دن تمہاری نازبرداریاں کیا کرتا تھا۔ تو تم کیا کہتی تھیں تمہیں یاد نہ ہو مجھے یاد ہے۔

شیریں۔ تو خالہ اماں۔ مجھے کیا معلوم تھا محبتیں بھی دکھاوے کی ہوا کرتی ہیں۔

فیروزہ۔ تمہیں نہ تب کچھ معلوم تھا نہ اب کچھ معلوم ہے۔

شیریں۔ نہیں نہیں۔ اب میں سمجھ گئی۔ اب میں خوب سمجھ گئی ہوں۔

فیروزہ۔ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کل کو جمشید آ کر اپنی غیر حاضری کی کوئی بہت ضروری وجہ بتلائے۔ اور آنسو بہا کر تم سے معافی چاہے۔ پھر؟

شیریں۔ اپنی غیر حاضری کی اُس نے کوئی بہت معقول وجہ بتادی۔ تو پھر تو میں اس کو معاف کر دونگی۔

فیروزہ۔ اور مردوں کی ذات بے وفا نہ رہیگی۔

شیریں۔ ہاں تو پھر تو وہ ایک نیا تجربہ ہوگا۔

فیروزہ۔ تو بیٹی آج کیوں ایسی بات کہتی ہو۔ جس پر کل پچھتانا پڑے۔

شیریں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ وہ نہیں آتا۔ وہ مجھے بھلائے دیتا ہے۔

اور میں اس کو یاد کر کے ظالم بھی نہ کہوں؟

فیروزہ۔ شیریں۔ مرد بہت مصروف رہتے ہیں۔ بیٹی تمہارا بچپن تھا۔ تمہیں کیا یاد ہوگا۔ تمہارے ابّا تو بعض دفعہ مصروفیت کی وجہ سے کئی کئی روز تک تمہاری امّاں سے بات بھی نہ کر سکتے تھے۔

شیریں۔ تو پھر وہ بتا تو دیتے ہونگے۔ کہ میں مصروف ہوں۔

فیروزہ۔ نہیں۔ انہیں اتنا بتانے کی بھی فرصت نہ ہوتی تھی۔ ہم خود اندازہ لگا لیتے تھے۔

شیریں۔ تو جمشید کو ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔

فیروزہ۔ بیٹی جب وہ آئیگا۔ تو تم کو معلوم ہو جائیگا۔

شیریں۔ پر خالہ امّاں میں کیسے یقین کروں کہ وہ کبھی آئیگا بھی

فیروزہ۔ میں جمشید کو تم سے بہتر جانتی ہوں۔

شیریں۔ تم جمشید ہی کو جانتی ہو محبّت کو نہیں جانتیں

فیروزہ۔ تم مجھ کو نہیں جانتی

شیریں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کچھ نہیں جاننا چاہتی

[کھڑکی کے سامنے خاموش کھڑی ہو جاتی ہے]

شیریں۔ مگر خالہ امّاں۔ جمشید نے ایسا کیا۔ تو میں اس سے بدلہ ضرور لونگی۔

فیروزہ۔ کیا؟

شیریں۔ اگر وہ کسی اور کو چاہنے لگا۔

فیروزہ۔ شیریں کیوں دیوانی ہو رہی ہو؟

شیریں۔ یہ دیوانہ پن ہے؟

فیروزہ۔ تم اسے محبت کہتی ہو؟

شیریں۔ ہاں یہ میری محبّت ہے۔ میری ناکام محبت۔

فیروزہ۔ ناکام محبّت محبّت کی یاد سے محبت کیا کرتی ہے۔

شیریں۔ تو میری نفرت ہے۔

فیروزہ۔ تمہیں جمشید سے نفرت ہے؟

شیریں۔ ہاں نفرت ہے۔ جاؤ نفرت ہے۔

فیروزہ۔ شیریں دیکھو۔ ہم دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ کوئی مرد ہمارے سر پر موجود نہیں۔ ایسی حالت میں جمشید سے سعادتمند لڑکے کا اتفاق سے مل جانا۔ اور تم پر یوں دیوانہ وار جان چھڑکنا تمہاری خوش قسمتی ہے۔

شیریں۔ میں باز آئی اس خوش قسمتی سے۔

[خادمہ طشتری میں ایک کارڈ لاتی ہے]

فیروزہ۔ بھلا کون ہے شیریں؟

شیریں۔ مجھے کیا معلوم۔

فیروزہ۔ پھر کہتی ہو۔ مجھے جمشید سے محبّت ہے۔

شیریں۔ کون کہتا ہے۔

فیروزہ۔ میں یہاں نہ بیٹھوں گی۔ جمشید کے سامنے مان لینا

شیریں۔ وہ ہے۔ تو کہہ دو۔ گھر پر نہیں ہیں۔

خادمہ۔ بیوی میں تو بتا بیٹھی ہوں۔ وہ گھر میں ہیں۔

شیریں۔ کیوں بتایا۔

فیروزہ۔ خیر جانے بھی دو (خادمہ سے) جاؤ بُلا لاؤ۔

شیریں۔ آپ ہی ملئے۔ مَیں جاتی ہوں۔

فیروزہ۔ شیریں تم سچ مچ بگڑ گئی ہو۔ مَیں تو سمجھ رہی تھی۔ جمشید کے آنے پر غصّہ اُتر جائیگا۔

شیریں۔ پھر آپ ہی تو سمجھ رہی تھیں۔

فیروزہ۔ پر اتنا تو معلوم کرلو۔ کہ وہ اتنے دنوں کیوں نہ آسکا۔

شیریں۔ آپ ہی کرتی رہیے معلوم۔

[چلی جاتی ہے]

فیروزہ۔ بچپن نہیں جاتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے۔ واہ! [جمشید آتا ہے] جمشید تم کہاں غائب ہو۔ نہ خبر نہ خیریت تمہارے مکان پر کئی مرتبہ ملازم بھیجا۔ وہاں بھی تالا تھا۔ آخر کہاں رہے؟

جمشید۔ معاف کرو۔ مَیں بہت ہی شرمندہ ہوں۔ مگر مَیں عجیب پریشانیوں میں مبتلا رہا۔

فیروزہ۔ پریشانیاں کیسی؟

جمشید۔ شیریں کہاں ہیں؟

فیروزہ۔ اندر ہیں۔ مگر یہ پریشانیاں کیسی؟

جمشید۔ معلوم مَیں نے آپ سے کبھی ذکر کیا یا نہیں میرے ایک بہت دولتمند ماموں مُدت سے مارشس میں رہتے ہیں۔ وہیں اُن کا کاروبار ہے۔ وہیں رہنا اختیار کر لیا ہے عجیب قسم کے آدمی ہیں۔ شادی کی نہیں۔ نہ بیوی نہ بال بچے کبھی کبھی خط لکھ دیتے تھے۔ کسی سے اُن کو محبت بھی نہیں۔ بس ہمارے لئے تو وہ برسوں سے مُردہ ہی تھے۔ اتوار کے روز جو اُٹھا۔ تو تاج محل ہوٹل کے ملازم نے مجھے ایک خط لاکر دیا۔ کھولا تو اُن کا خط! معلوم ہُوا بمبئی آئے ہیں۔ اور ہوٹل میں ٹھیرے ہُوتے ہیں۔

فیروزہ۔ خوب!

جمشید۔ اب بڑھاپے میں وہ اپنی جائداد کا معاملہ طے کرنے بمبئی آئے ہیں۔ مجھے اُنہوں نے ہوٹل ہی میں بُلاکر اپنے ساتھ ٹھیرا لیا۔ اُن کے ساتھ ساتھ اتنے روز گزر گئے۔

فیروزہ۔ مگر جمشید ایک مرتبہ آکر ہمیں اطّلاع ہی دے جاتے۔

جمشید۔ خالہ۔ آپ کو ان کا مزاج معلوم نہیں۔ جبھی یہ کہہ رہی ہیں۔ وہ تو ایسے آدمی ہیں۔ کہ اس وقت مجھے بُلایا مَیں موجود نہ ہُوا۔ بس بگڑ گئے۔ اور پھر ایسے بگڑتے ہیں۔ کہ خُدا کی پناہ۔

فیروزہ۔ تو ایک کارڈ ہی لکھ دیتے۔

جمشید۔ یہ قصور تو ضرور ہُوا۔ مگر یقین مانئے۔ میرا دل ہر وقت اس طرف پڑا رہتا تھا۔ یہی سوچتا رہا۔ ذرا فرصت ملے۔ تو ہو آؤں۔ اب آج وہ اپنے کسی پُرانے دوست سے ملنے گئے۔ اور مجھے آنے کا موقع ملا۔ مگر بہت تھوڑی دیر کو آیا ہوں۔ چچا مجھے ساتھ لے کر آج پونا جا رہے ہیں۔ شیریں کو اطّلاع ہوگئی؟

فیروزہ۔ ہاں ابھی آتی ہے۔ تو جائداد کا کیا فیصلہ ہُوا کچھ دیا

تمہیں چچا نے ؟

جمشید۔کہاں دیا۔عجیب عجیب شرطیں پیش کرتے ہیں۔ کہ ماریشس چل کر رہو۔ اور ــــ بس یہ کرو اور وہ کرو۔ شیریں کو بلائیے۔ تھوڑی دیر میں مجھ کو جانا ہے۔

فیروزہ۔تمہاری شیریں تو بہت بگڑ رہی ہیں تم سے۔

جمشید۔کیوں ؟

فیروزہ۔ابھی ابھی کہہ رہی تھیں۔کہ جمشید نے مجھے بھلا دیا ہے اور اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ اور یہ اور وہ۔مزاج تو تمہیں اُن کا معلوم ہے۔باتوں باتوں میں بگڑ بیٹھتی ہیں۔اب تمہارے منائے ہی منیں گی۔

جمشید۔تو میں خود اندر جاؤں۔

فیروزہ۔تم ٹھیرو۔میں بلائے لاتی ہوں۔[فیروزہ جاتی ہے]

جمشید۔مجھے پہلے امید تھی۔کہ شیریں بگڑ گئی ہوگی بھلا اب کیسے کہونگا۔کہ چچا شادی کی اجازت دینے سے پیشتر تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔[ٹہلتا ہے] یہی ڈر ہے۔اگر ناپسند کیا تو کیا ہوگا۔ ــــ اور اُن کی طبیعت کا ٹھکانا ہی کیا۔وہ میری آنکھوں سے تھوڑا ہی دیکھیں گے۔نعلوم انہیں کیا بات کھٹک جائے ــــ پر جایداد کی خاطر میں شیریں کو تو نہیں چھوڑنے کا۔چولہے میں جائے جایداد ــــ لیکن اگر شیریں ان سے ملنا منظور کر لیں۔تو خوب ہو۔پر کیسے کہونگا اور وہ تو پہلے ہی بگڑی بیٹھی ہے۔ابھی منانا بھی ہے۔اُفوہ چچا شیریں کو پسند کر لیں۔ تو پھر تو ......

[فیروزہ شیریں کو لیکر آتی ہے]

فیروزہ۔(شیریں سے) اس بیچارے کی مجبوری کو بھی تو دیکھو (جمشید سے) لو بھئی۔ان روٹھی رانی کو لے تو میں آئی ہوں۔منانا اب تمہارا کام ہے۔

جمشید۔کچھ یہ بھی معلوم ہوا۔ناراضگی رتی ماشوں میں ہے یا سیروں منوں ہیں۔

فیروزہ۔یہ اب تم ہی معلوم کرو۔میں جاتی ہوں۔[فیروزہ جاتی ہے]

جمشید۔کیوں صاحب طبیعت بگڑ رہی ہے یا مزاج بگڑ رہا ہے؟

شیریں ــــ

جمشید۔آپ کو سُنائی ہی نہیں دیا۔یا جواب دینے کی قسم کھائی ہے؟

شیریں ــــ

جمشید۔ہوں! جواب ہی نہ ملے گا۔تو پھر اتنا تو کہہ دیجئے کہ ہم ناراض ہیں۔

شیریں ــــ

جمشید۔بھئی ناراض ہو۔تو بتا تو دو۔کہ کیوں۔اور اگر اب بھی جواب نہ دیا۔تو میں سمجھونگا۔ناراض ہی نہیں ہیں۔

شیریں ــــ

جمشید۔تو گویا آپ ناراض نہیں ہیں۔[بڑھکر شانوں پر

ہاتھ رکھ دیتا ہے]

شیریں۔ مجھے نہ ستائیے۔

جمشید۔ کہنے لگیں۔ کہ نہ ستائیے۔ اس ستانے نے تو آپ کی چیپ تڑوائی۔ دیکھو نہ شیریں۔ تمہاری خفگی ہمارے سر آنکھوں پر۔ مگر بات اصل یہ ہے۔ کہ اس وقت زیادہ منانے کی فرصت نہیں ہے۔ ہم بتائیں۔ اس خفگی کا رجسٹر بند کرکے کہیں چھوڑ دو۔ پھر کسی وقت حساب کتاب دیکھ لیا جائیگا۔

شیریں ــــ

جمشید۔ پسند نہیں آیا۔ یہ خیال آپ کو۔ اچھا لو۔ اور کیا کہتی ہو۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ اس خفگی کا قرض پائی پائی ادا کر دونگا۔

شیریں۔ اب اعتبار نہیں رہا۔

جمشید۔ اوہو۔ تو گواہ لئے آتا ہوں۔ خالہ کو بلالوں۔ اے۔ اچھا نہیں بلاتا۔ اب تم منے کو ہو۔ کوئی آگیا تو پھر روٹھ جاؤگی۔

شیریں۔ ایسا ہی تو آپ کو میرے روٹھنے کا خیال ہے۔

جمشید۔ تو اب یہ جلی کٹی باتیں ہونگی۔

شیریں۔ پھر کیوں نہ ہوں۔

جمشید۔ اب کیا کہیں۔ قصور تمام ان یورپ اور امریکہ والوں کا ہے۔ انہوں نے فضول مشینیں سینکڑوں بناڈالیں سینما کی قسم کی کوئی ایسی مشین ایجاد نہ کی۔ کہ انسان کے سر پر لگادی جاتی۔ اور انسان جو کچھ سوچتا اس مشین پر اس کا فلم بنتا جاتا۔ ایسی مشین ہوتی۔ تو بنانے والا نمعلوم کتنے مصیبت کے مارے عاشقوں کی دعائیں لیتا۔ جہاں کوئی تم سی شکی عورت کوئی سیدھا اُلٹا الزام لگاتی۔ فٹ سے کہتے۔ کہ جناب آپ کی فرقت میں ہم کل رات بھر سوتے نہیں۔ اور گواہی میں فلم نکال کر سامنے پھیلا دیتے۔ کہ ملاحظہ فرمائیے۔

شیریں۔ اب یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ جاؤ۔ ہم نے دیکھ لیا۔

جمشید۔ دیکھو شیریں اب یہ تمہاری زبردستی ہے نا۔ خالہ نے تم کو بتا دیا ہوگا۔ کہ میں مجبور رہا۔ اور تمہیں خود ہی سوچ لینا چاہیئے تھا۔ کہ کسی خاص مجبوری کے بغیر تمہارا جمشید غیر حاضر ہو سکتا ہے؟

شیریں۔ میں تو کہتی ہوں۔ مجھے اطلاع کیوں نہ دی تم نے۔

جمشید۔ پھر کہیں گی کہ عورتیں ناقص العقل نہیں ہوتیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ میں اتنے روز نہ آسکونگا۔ میں تو ہر وقت یہی سوچتا تھا۔ صبح نہیں شام۔ شام نہیں کل کو ہو آونگا۔

شیریں۔ بحث میں تو ارسطو بھی تم سے پیش نہیں پاسکتا۔

جمشید۔ اور پھر تم ہم سے بحثتی ہو۔

شیریں۔ تو اب یہ تمہارے ماموں کب تک رہینگے یہاں؟

جمشید۔ بس اب جانے ہی والے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی مارشس جا رہا ہوں۔ ہاں ہاں۔

شیریں۔ جھوٹ!

جمشید۔ تم بھی بوریا بستر باندھ رکھو کل شادی۔ پرسوں روانگی۔

شیریں۔ ہر وقت کی ہنسی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔

جمشید۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤں گا تو تم پھر روٹھ جاؤ گی۔

شیریں۔ کیوں؟

جمشید۔ اچھا ایک بات کہوں مانو گی؟

شیریں۔ ماننے کی ہوئی تو مان لونگی۔

جمشید۔ تمہیں اپنے جمشید سے یہ بھی امید ہے کہ وہ کوئی معیوب بات تم سے کہے گا۔

شیریں۔ اب کہیں کہہ بھی چکو۔

(باقی باقی)

جذباتِ عزیز

اک جہاں گرمِ تماشا نظر آتا ہے مجھے
حشر اک حشر میں برپا نظر آتا ہے مجھے

چارہ گر ضبط کو سمجھا ہے سکون اور یہاں
حال کچھ اور ہی دل کا نظر آتا ہے مجھے

وہ تو ہر بات پہ کہہ دیتے ہیں ہم جانتے ہیں
مشکل اظہارِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

تو تو ہاں پردہ نشیں ہے تجھے دیکھا کس نے
چارسو کس کا تجلی نظر آتا ہے مجھے

ان کے سمجھانے کو جاتا ہے خدا خیر کرے
ہمنشیں ہاتھ سے جاتا نظر آتا ہے مجھے

حسن ہر ذرۂ عالم ہے تماشا طالب
ہر طرف دامِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

بے نیازی سے تری دیکھئے کیا پاتے جواب
دل کی امید سراپا نظر آتا ہے مجھے

پھر وہی دل کی طپش ہے وہی خونباریِ چشم
پھر وہی سر وہی سودا نظر آتا ہے مجھے

وہی بیخوابیِ شب ہے وہی اختر شمری
پھر وہی جوشِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

حسرت آبادِ تمنا میں ہے اک حشر بپا
شوق پھر انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے

میں ہوں اور عیشِ تصور کی فراوانی ہے
خواب میں خوابِ زلیخا نظر آتا ہے مجھے

مشکِ تختۂ چیں ہے دلِ برباد عزیز
کہ یہی داغِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

"ہزار داستان"

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جلد ۱	اشاعت اوّل ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء	نمبر ۷

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

جرمنی کے مشہور و معروف شاعر اور فلاسفر گوئٹے کی شہرت اس کے کسی تصنیف کے ترجمے کی کافی سے زیادہ سفارش ہے۔ موصوف کے یہ خطوط جن کے ترجمے کے لئے میں جناب سیّد ہادی حسین صاحب کا ممنونِ احسان ہوں۔ اس وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ مصنف نے خطوط نویسی کے اس نرالے انداز میں ایک افسانہ محبت تحریر کر دیا ہے۔ اسی افسانہ کے ضمن میں جن حقائق فطری و معاشری پر ممدوح نے اپنے فلسفیانہ اور اجتہادی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ وہ خود اس بات کے اہل ہیں۔ کہ اہل الرائے حضرات ان کے متعلق گوئٹے کے نقطۂ خیال کا مطالعہ کریں۔ میں جناب مترجم کو اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ جو انہیں گوئٹے کے سے عمیق جذباتِ قلب کو اُردو کا جامہ پہنانے میں میسّر ہوئی ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اُس کی ذمہ وار اُن کی اپنی طبیعت کی جودت، فن ترجمہ میں مہارت، اور وہ قابلیت ہے جو انکو دونوں زبانوں میں حاصل ہے۔

جناب گوپال کرشن صاحب پاس میرے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ اُنہوں نے فرانسیسی زبان کے ایک ایسے مختصر افسانہ کو خالص مشرقی انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کا مقصد تربیتِ اخلاق ہے۔ حقیقت میں اگر غیر زبانوں کے ایسے ایسے لآلیِ آبدار اُردو کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں تو نہ صرف یہ ہمارے ادب کے لئے باعثِ ناز ثابت ہونگے۔ بلکہ اپنے مصنفین کے حلقۂ اثر کو زیادہ وسیع کر کے ان کے اصلی مقصد کو زیادہ کامیابی سے پُورا کرنے کے اہل ہو جائینگے۔

ہزار داستان کی خوش بختی ہے۔ کہ آج کی اشاعت حضرت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں مدظلہ العالی کے کلام سے مزیّن ہے۔ جو دسترس کہ حضرت موصوف کو فارسی میں حاصل ہے اس کا شہرہ دُور دُور ہے۔ اور وہ لوگ جن کو ان کا کلام سُننے کا اتفاق ہُوا ہے۔ (مگر یہ ایک ایسی نادر خوش قسمتی ہے جس سے ایک بہت ہی محدود حلقہ فیضیاب ہے) وہ ان کے کمال فن کے قائل ہیں۔ میں علّامہ اقبال مدظلہ العالے کا احسانمند ہوں کہ انہوں نے حضرت مسیح الملک کے اس نتیجۂ فکر کو ہزار داستان کے لئے حاصل کر کے اس کو دُہری اہمیّت عطا کر دی۔

انحطاط شباب، جناب سیّد عابد علی صاحب عابدؔ کی اس کوشش کا ایک نیا نتیجہ ہے۔ جو موصوف افسانوں کے رنگ میں انسانی فطرت کے مختلف حقائق کو بیان کرنے میں فرما رہے ہیں۔ ہندوستان میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اور اس لئے اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے۔ جس میں ابھی ہمیں ادب مغرب سے بہت کچھ اور بہت عرصہ تک سبق لینا ہے۔

میں جناب قاضی عبدالودود صاحب بی۔ اے کا خاص طور پر مرہونِ منّت ہوں کہ انہوں نے بطور خاص حضرت علّامہ خان بہادر میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ کلام کا کچھ حصّہ بھیجکر ہزار داستان کے صفحہ کو ایک کشتی گوہر بنا دیا۔ حضرت شادؔ کی شاعری جو امتیازات رکھتی ہے۔ وہ ممدوح کی زندگی میں ہی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مگر آج انکا کلام ہمیں اس لئے اور بھی محبوب ہے کہ وہ بُلبل جس کا یہ نغمہ ہے اب خاموش ہو چکی ہے۔

ہماری تسیر، حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے تازہ رشحات فکر میں اس لئے زیادہ وقیع ہے کہ اس میں اس اثر کی جھلک بھی ہے۔ جو ان کی طبیعت پر لسان العصر حضرت اکبرؔ الہ آبادی مغفور کی صحبت سے ہُوا۔ میں ذاتی طور پر حضرت جوشؔ کو ہندوستانی شاعری کے لئے ایک فالِ نیک سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں وہ دن دُور نہیں جب انکو اپنی خداداد جدت پسندی کی بدولت زبان اُردو کے بہترین مغربی شاعر ہونیکا امتیاز حاصل ہو جائے بجوشؔ جوش بھی ممدوح ہی کا نتیجہ فکر ہے۔ ہزار داستان حضرت جوشؔ کی مزید توجہ کا اس لئے زیادہ حقدار ہے۔ کہ جہانتک میں سمجھتا ہوں۔ انکی شاعری اور اس کی زندگی کا مقصد ایک ہی ہے۔ اور اس لئے مجھے امید ہے۔ کہ حضرت ممدوح اس شدت تشنگی کو آزمائش میں نہ ڈالا کریں گے۔ جو آپ کا کلام میرے اور ہزار داستان کے دوسرے ناظرین کے سینوں میں بھڑکا دیتا ہے۔

جھولن ستحی الف۔ جناب محمد فضل حق صاحب معتصم کی سرگرمیوں کا ثمر لطیف ہے۔ اُردو میں مجلسی و معاشرتی ڈراموں کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہے۔ مگر بنگالی اور گجراتی کا ادب کسی طرح بھی یوروپ کے کسی مُلک سے اس صنف ادب میں کم حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر اُردو کے نو آموز شائقین کم از کم اس قسم کے بنگالی اور گجراتی ڈراموں کا ترجمہ کر کے ماہرین فن کی توجہ اس طرف مبذول کر سکیں تو ایک بڑا کام ہوگا۔ میں مترجم موصوف کی اس ادبی کوشش کو قابل مبارکباد سمجھتا ہوں۔ اور ان کو یقین دلاتا ہوں کہ ہزار داستان کے صفحات ان کی اور ان کے ہمخیال ادیبوں کی اس قسم کی ادبی مشق کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔ جو اگرچہ اب کسی قدر غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ مگر نتائج کے اعتبار سے نہایت اہم اور وقیع ہے۔ ایڈیٹر

غم نصیب

مصنفہ گوئٹے

مترجمہ محمد ہادی حسین

حصۂ اوّل

۴ مئی

تم سے جدا ہو کر میں کیسا خوش ہوں! میرے دوست انسان کا دل بھی کیا چیز ہے! تم سے دُور ہونا جس کی مفارقت کبھی میرے لئے ناممکن ہوتی تھی جس سے مجھے اس قدر محبت تھی۔ اور پھر خوش رہنا! مجھے معلوم ہے تم اس سے چشم پوشی کرو گے۔ کیا بخت ناساز نے ایسے ایسے کتنی تعلقاتِ اُلفت مجھ غم نصیب کی جگر خراشی کے لئے مخصوص نہیں کر دئے؟ غریب لیونورا! لیکن اُس کی دلشکنی کا الزام مجھ پر نہیں آتا۔ اس میں میرا کیا قصور تھا۔ کہ ادھر تو اُس کی بہن کی خصوصی سحر طرازیوں نے میرے لئے ایک خوش آیند مشغلۂ تفریح مہیّا کر رکھا تھا۔ اور اُدھر اُس کے نازک دل میں میری محبّت کا جذبہ پیدا ہو گیا؟ باوصف اس کے کیا میں بالکل بے قصور ہوں؟ کیا میں نے اُسکے جذباتِ شوق کی ہمّت افزائی نہیں کی؟ کیا میں فطرتِ انسانی کے اُن مظاہرِ حقیقی سے مسحور نہ ہو جاتا تھا۔ جو اگرچہ اصل میں کچھ ایسے نشاط انگیز تو نہ ہوتے، تاہم بسا اوقات ہمیں بہلانے تھے؟ کیا میں نے . . . . . . لیکن آہ، انسان چیز ہی کیا ہے۔ کہ اپنے آپ پر یوں الزام لگائے؟ میرے عزیز دوست میں وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ اصلاح پذیر ہو جاؤنگا۔ میں جو قسمت کی ذرا ذرا سی ستم آرائیوں پر غریق فکر ہو جاتا ہوں، اپنی اس بہیم عادت کو ترک کر دُونگا۔ آیندہ ہمیشہ زمانۂ حال میرا مایۂ طرب ہوگا۔ اور ماضی کو میں گیا گذرا سمجھونگا۔ میرے بہترین دوست بے شک تمہارا کہنا بجا ہے۔ کہ نسل انسانی کا رنج و غم بدرجہا کمتر ہوتا۔ اگر لوگ اپنی قسمت حاضرہ کو صبر و سکون سے برداشت کرنے کے بجائے اپنے تخیّل کو اندوہِ ماضی کی یاد تازہ کرنے میں اسقدر کاوش سے مصروف نہ کیا کرتے ـــــ خُدا جانے اُن کی اُفتادِ طبیعت ایسی کیوں ہے!

اتنی عنایت کرو کہ میری والدہ سے کہ دو میں اُن کے کام کی انجام دہی میں انتہائے امکان تک کوشش کرونگا۔ اور اُنہیں اس کے متعلق جسقدر جلد ہو سکا اطلاع دُونگا میں نے اپنی خالہ کو دیکھا ہے۔ اور اُنہیں اُس ناخوشگوار شخصیت سے یکسر مختلف پاتا ہوں۔ جو ہمارے دوست

اُن سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ ایک زندہ دِل خوش طبع خاتون ہیں۔ اور بہترین دل کی مالک میں نے اُن سے والدہ کی اُن حق تلفیوں کا تفصیلاً ذکر کیا۔ جو انہیں ورثہ کے ایک حصّے سے محروم کرنے میں روا رکھی گئی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے طریقِ عمل کے اسباب و مقاصد بیان کئے۔ اور ساتھ ہی وہ شرطیں بھی بتائیں جو اگر پُوری ہو جائیں تو وہ سب کچھ دے دینے پر بلکہ جتنا ہم چاہتے ہیں۔ اُس سے بھی زیادہ کر دینے پر رضامند ہیں۔ قصّہ مختصر مَیں اس موضوع پر فی الحال اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ بس تم میری والدہ کو یقین دلا دو کہ سب کچھ حسبِ دلخواہ ہو جائیگا۔ میرے عزیز دوست مَیں نے اس غیر اہم معاملے میں پھر مشاہدہ کیا ہے۔ کہ غلط فہمیاں اور تغافل شعاری دُنیا میں کینہ توزی اور بدسگالی سے بڑھ چڑھ کر فتنے برپا کرتی ہیں۔ بہرحال مؤخرالذکر دونوں نسبتاً کم ظہور میں آتی ہیں

اور بہر طور مَیں یہاں نہایت خوش ہوں اِس فردوس دُنیوی میں تنہائی میرے لئے ایک زندگی بخش دارو ہے۔ اور بہارِ نو آغاز اپنی پُرفیض وعدہ فرمائیوں سے میرے دل کو جو اکثر شک و شبہ میں مبتلا رہتا ہے۔ شگفتہ کئے دیتی ہے ہر درخت ہر جھاڑی پھولوں سے مالامال ہے اور یہی جی چاہتا ہے۔ کہ کوئی مجھے ایک تیتری بنا دے کہ اس خوشبو کے سمندر میں تیرتا پھروں۔ اور اپنی تمام ہستی کو اس میں محصور پاؤں۔

شہر بذاتِ خود مجھے ناپسند ہے لیکن اس کے گردا گرد فطرت کی ایک ناقابلِ اظہار خوبصورتی نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے مرحوم کونٹ م نے اُن نشیبی پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی پر باغ لگوایا تھا۔ جو نہایت دل آویز و قلمونی سے ایک دوسری کو کاٹتی اور خوش منظر وادیاں بناتی ہیں باغ سیدھا سادا ہے۔ اور اُس میں پہلی مرتبہ داخل ہوتے ہی یہ معلوم کر لینا آسان ہے۔ کہ اُس کا خاکہ ساخت و پرداخت کسی ضابطہ شناس باغبان کا تیار کیا ہوا نہیں بلکہ ایک حسّاس دل کا، جو آرزومند تھا کہ یہاں آکر تنہائی میں خود اپنے کیفِ مسرت کا مطالعہ کرے۔ مَیں نے ایک بوسیدہ دری میں بیٹھ کر کتنے ہی آنسو اس مرحوم کی یاد میں بہائے ہیں۔ جو کسی زمانہ میں مالک باغ کی جائے بازگشت تھی اور آجکل میری ہے۔ مَیں کچھ مدت میں اس مقام کا مالک ہو جاؤنگا۔ مالی تھوڑے دنوں سے مجھ سے کچھ مانوس ہو گیا ہے۔ اور اس سودے میں اُسے کوئی خسارہ نہیں۔

۱۰- مئی

بہار کی ان خوشگوار صبحوں کی طرح جن سے مَیں پُوری دلچسپی کے ساتھ لذّت گیر ہوتا ہوں۔ ایک عجیب سکون میری ساری رُوح پر طاری ہو گیا ہے۔ مَیں تنہا ہوں اور

یہاں زندگی کے طلسمِ دلربا کو محسوس کرتا ہوں۔ جو میرے ایسی رُوحوں کی مسرت کے لئے بنایا گیا تھا۔ میرے عزیز دوست! میں ایسا خوش ہوں، حیاتِ آسودہ کے احساسِ لطیف میں اس قدر مستغرق ہوں کہ اپنی قابلیت کی تہذیب سے بالکل بے التفات ہو گیا ہوں۔ اس وقت کہو تو میں ایک لکیر بھی نہ کھینچ سکوں، تاہم مجھے محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں اس وقت سے بہتر مصوّر کبھی نہ تھا۔ جب پُر فضا وادی تراکمِ بخارات سے لبریز ہوتی ہے۔ اور خورشیدِ نیمروز درختوں کے ناقابلِ گذر جنگل کی بالائی سطح کو چیرتا ہے۔ اور کوئی کوئی آوارہ کرن اندرونی نہانخانہ میں دزدوار داخل ہوتی ہے۔ اُس وقت میں پتلی پتلی دھار سے بہنے والی ندی کے کنارے لمبی لمبی گھاس پر لیٹ جاتا ہوں۔ اور جب میں اس طرح زمین سے متصل لیٹا ہوتا ہوں۔ ہزاروں نامعلوم پودے خود بخود میری نگاہِ انکشاف کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ جب میں ڈال پات کی مختصر سی دُنیا کی بھنبھناہٹ سُنتا ہوں، جب میں کیڑوں مکوڑوں کی بیشمار اور ناقابلِ بیان صورتوں سے واقف ہو جاتا ہوں اُس وقت میں قادرِ مطلق کے حضور کو محسوس کرتا ہوں جس نے ہمیں اپنا ہم شبیہ بنایا۔ اور نیز اُس محبت ہمہ گیر کو، جو انبساط کی بقلتے دوام سے ہمارے اردگرد حلقہ کئے ہوئے ہماری پرورش و نوازش کرتی ہے۔ پھر اے دوست! جب تاریکی میری آنکھوں پر چھا جاتی ہے۔ اور زمین و آسمان یکجا ہو کر میری رُوح میں سمائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور خیالِ محبوب کی طرح اُس کی ساری طاقت کو جذب کر لیتے ہیں۔ اُس وقت میں چاہتا ہوں اور سوچتا ہوں: کاش! تم ان تصوّرات کو معرضِ بیان میں لا سکو، اور اُس کامل اور پُرجوش چیز کو جو تمہارے اندر جاگزیں ہے صفحۂ کاغذ پر نقش کر سکو۔ تاکہ وہ تمہاری رُوح کا آئینہ ہو سکے جس طرح تمہاری رُوح خُدائے لایزال کا آئینہ ہے! لیکن اسے میرے دوست! یہ میری طاقت سے بہت زیادہ ہے۔ ان تمثالہائے تصوّر کی عظمتِ شان مجھے اپنے بوجھ کے نیچے دبائے دیتی ہے۔

۱۲- مئی

مجھے نہیں معلوم کہ بعض فریب کار رُوحیں اس مقام کو اپنی جائے مسیر بنائے ہوتے ہیں۔ یا یہ میرے ہی دل کا وہم فلک سیر ہے جسکی وجہ سے مجھے گردوپیش کی ہر چیز جنت نظیر دکھائی دیتی ہے۔ میرے گھر کے سامنے ایک چشمہ ہے میں اس سے میلوسینا اور اس کی بہنوں کی طرح وابستہ سحر ہوں یہ ایک ایسا چشمہ ہے۔ جو خفیف سے نشیب سے اُتر کر ایک محرابدار چٹان کے پاس پہنچتا ہے جس سے کوئی بیس سیڑھیاں نیچے شفاف بلوریں پانی ایک مرمری چٹان سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ وہ مختصر سی دیوار جو بلندی پر چشمے کے اردگرد

حلقہ زن ہے۔ وہ بلند بالا درخت جو اس مقام کو گھیرے ہوئے ہیں، اور خود مقام کی فرحت پرور خنکی — ہر چیز ایک بہجت آفریں اور نشاط آور اثر رکھتی ہے۔ کوئی ایسا دن نہیں جاتا۔ کہ میں وہاں جا کر دو ایک گھڑیاں نہ گذاروں۔ نوجوان لڑکیاں شہر سے پانی بھرنے آتی ہیں کیسا معمولی اور ضروری مشغلہ ہے کسی زمانے میں شہزادیوں کا کام تھا جب میں وہاں مصروفِ آرام ہوتا ہوں۔ مجھے خانہ بدوشی کی دیرینہ طرزِ معاشرت کا تصوّر بندھ جاتا ہے۔ ہمارے قدیم بزرگ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ اُن کے آغازِ دوستی کے منظر، چشموں کے کناروں پر باہم قریبیت و اتحاد کے منظر، میرے پیش نظر ہو جاتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ کس طرح پُرفیض روحیں چشموں اور ندیوں کی نگہبانی میں مصروف رہتی تھیں۔ جو شخص ان حسیات سے ناآشنا ہے اُس نے گرمیوں کے ایک وارفتہ کُن دن کی درماندگی کے بعد کنارِ آب کی سرد آرامگاہ میں خوش آرامی کا اصلی لطف کبھی نہیں اُٹھایا۔

۱۳ مئی

تم نے مجھے کتابیں بھیجنے کی نسبت پوچھا ہے میرے پیارے دوست میں التجا کرتا ہوں خُدا کے واسطے مجھے ایسے سخت گیر جوئے سے بچالو۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی میری رہنمائی کرے مجھے اُبھارے، مجھے اُکسائے میرے دل میں از خود کافی جوشِ اضطراب ہے مجھے خواب آور خوش آہنگیوں کی خواہش ہے۔ اور اُنہیں میں ہومر میں بدرجۂ اتم پاتا ہوں۔ اکثر کوشاں رہتا ہوں کہ اپنے خون کے تپ سوزاں میں کچھ تخفیف کروں۔ اور میرے دل کو تم جانتے ہی ہو۔ کہ اُس جیسی بے ثبات اور غیر مستقل چیز کوئی نہ ہوگی مگر اے میرے دوست، جس نے اتنی بار اُس دردِ جگر کو برداشت کیا ہے جو تمہارے دل میں میری غمگینی کو یک بیک غیر معتدل مسرت سے، اور میٹھی میٹھی اُداسی کو زبردست جذبات سے مبدّل ہوتے دیکھ کر پیدا ہوتا تھا۔ کیا مجھے تمہارے سامنے اعتراف کرنیکی ضرورت ہے؟ تو سُنو میں اپنے دل سے ایک طفلِ بیمار کی طرح پیش آتا ہوں، میں اُس کی ہر ہر ترنگ کو پُورا کرتا ہوں پھر اس کا ذکر نہ کرنا۔ اکثر ایسے لوگ ہیں جو مجھے اس کے لئے قابلِ نکوہش ٹھیرائینگے۔

۲۵ مئی

یہاں کے عام لوگ، خاص طور پر بچے مجھ سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اور میں اُن میں ہر دلعزیز ہوں۔ پہلے پہل جب میں نے اُن سے میل ملاپ شروع کیا۔ اور آشنایانہ لہجہ میں اُن سے عام رسمی باتیں پوچھیں، تو بعضوں نے یہ گمان کیا کہ میں اُن کا مضحکہ اُڑانا چاہتا ہوں، اور سخت ترشروئی کے ساتھ میری طرف سے مُنہ پھیر لیا میں نے اس واقعہ سے دِل کو رنجیدہ نہ ہونے دیا مجھے صرف اُسی بات کا تلخ احساس ہوا جسے میں پہلے بھی کئی بار مشاہدہ کر چکا ہوں وہ لوگ جنہیں نمائش و وقار منظور ہوتی ہے سخت سرد مہری سے کام لیکر اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ گویا انکو چھو جانے میں بھی ازالۂ وقعت کا خطرہ ہے۔ برخلاف اس کے بیکار اوباش اور زودمشق ظاہر داری یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ گویا وہ اپنی بلند پایگی سے اُتر کر اسفل نشینانِ عالم کے ہم صحبت بنتے ہیں اس نمود کا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ

غریب لوگوں کے دل میں انکی ناشائستگی کا احساس اور بھی گہرا ہوجاتا ہے۔

مجھے بخوبی معلوم ہے کہ ہم سب نہ ہمسر ہیں، اور نہ ہوسکتے ہیں لیکن میری رائے لو۔ تو وہ آدمی جو عام لوگوں سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ اُن کی نظروں میں احترام حاصل کرے۔ اُسی قدر تقصیروار ہے۔ جسقدر ایک بُزدل آدمی جو اس لئے روپوش رہتا ہے۔ کہ اُسے دشمن کے ہاتھوں شکست کھانے کا خدشہ دامنگیر ہے۔

تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ مَیں چشمے پر گیا۔ وہاں جا کر دیکھا۔ کہ ایک نوعمر خادمہ اپنے گھڑے کو سب سے نیچے کی سیڑھی پر رکھے ہوئے کھڑی ہے۔ اور ادھر اُدھر نظر دوڑا رہی ہے۔ کہ کوئی ساتھ والی آئے تو گھڑے کو اُس کے سر پر رکھ دے۔ مَیں دوڑتا ہوا نیچے گیا۔ اور مَیں نے اُس کی طرف دیکھ کر پُوچھا۔ "کیوں، اچھی لڑکی کیا مَیں تمہیں مدد دُوں؟" اُس کے چہرے پر ایک گہری جھلک آگئی۔ اور اُس کے مُنہ سے نکلا۔ "اوہ۔ جناب" میں نے کہا۔ "نہیں نہیں کوئی تکلّف نہ کرو"۔ وہ آمادہ ہوگئی۔ اور مَیں نے گھڑا رکھوا دیا۔

۱۷۔ مئی

مَیں نے ہر طرح کے لوگوں کو شناسا بنا لیا ہے۔ لیکن ابھی تک مجھے رفیقانِ صحبت میسّر نہیں۔ نہیں معلوم مجھ میں کیا ایسی کشش ہے۔ کہ لوگ مجھے اس درجہ چاہتے ہیں۔ اور اسقدر طالبانِ دوستی میرے کھنچے چلے آتے ہیں۔ لیکن پھر مجھے افسوس ہوتا ہے جب ہماری راہ ہم آہنگی تھوڑی دُور تک جا کر رہ جاتی ہے۔ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ "جیسے ہر جگہ ہیں" نسلِ آدم اِک بیزار کن تسلسلِ یکسانی ہے۔ بہت سے انسان اپنے وقت کا بیشتر حصّہ کسبِ معاش کے لئے محنت کرنے میں گذارتے ہیں۔ اور باقی وارستہ حال لوگ جو بندِ مشاغل سے آزاد رہتے ہیں۔ اُنہیں اس حدتک ستاتے ہیں کہ وہ بمشکل اُن سے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش صرف کرتے ہیں۔ بڑے بدقسمت انسان!

لیکن یہاں بیشتر اچھے لوگ ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی ہنگامی کیفیّتِ خود فراموشی مجھ پر طاری ہوجاتی ہے۔ اور مَیں اُن پاکیزہ مشاغلِ خوشباشی میں شامل ہوکر جو ہنوز دیہاتیوں کے بہرہ نصیب ہیں ہیں۔ اپنے دل کو بہلاتا ہوں۔ مثلاً ایک پُرنعم دسترخوان پر بیٹھ کر فراغِ خاطر اور اشتہائے صادق سے محوِ خورد و نوش ہوتا ہوں، یا کسی گشتِ تفریح یا محفلِ رقص کا انتظام کرتا ہوں، یا اس طرح کے اور شغلوں میں حصّہ لیتا ہوں۔ تو اس کا اثر میری طبیعت پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ پُورا لطف اُٹھانے کے لئے مجھے صرف یہ بھلا دینے کی ضرورت ہے کہ اسقدر قوتیں میرے اندر سرمستِ خواب ہیں جنہیں زنگِ بیکاری کھائے جا رہا ہے۔ اور جنہیں چھپا رکھنے پر مَیں مجبور ہوں۔ اُف! یہ خیال میرے لئے سوہانِ رُوح ہے! تاہم غلط فہمی کا شکار ہونا ہم سب کی قسمت میں ہے۔

افسوس کہ میری رفیقۂ شباب مجھ سے جُدا ہوگئی ہے! اور حیف کہ وصالِ اُلفت کا انجام یہ ہجر ہے! بجا ہوگا اگر مَیں اپنے آپ سے کہوں: "تم ایک فریب خوردہ وہم ہو کہ اُس چیز کی جستجو میں سرگرداں ہو۔ جس کا اس عالمِ سفلی میں ملنا محال ہے۔" لیکن کوئی وقت تھا جب وہ میری تھی۔ مَیں اُس نیکدل اُس عالی مقدّم کا مالک رہ چکا ہوں جس

کے حضور میں میری ہستی اپنی حقیقت سے مستزاد معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جو کچھ بننا میرے امکان میں تھا۔ میں اُس کے حضور میں وہ سب کچھ بن رہتا تھا۔ کیا اُس وقت میری رُوح کی ایک قوت بھی ناشناسِ اجتہاد رہتی تھی؟ کیا میں اُس کے حضور میں اُس پر ابھرا احساس کو پورے طور پر آشکار نہ کرتا تھا جس کے ساتھ میرا دِل حُسنِ فطرت سے والہانہ ہم آغوش ہے۔ کیا ہماری باہمی راہ و رسم لطیف ترین جذبوں اور تیز ترین ذہانت کا ایک متواتر سلسلہ نہ تھی۔ جس کی رنگا رنگی اگرچہ کبھی کبھی تلوّن مزاجی کا رنگ لئے ہوتیں لیکن اُن پر جودتِ فہم کی نمایاں مُہر ثبت ہوتی تھی؟ وہ مجھ سے چند سال بڑی تھی۔ آہ! وہ سال اُسے مجھ سے پہلے قبر میں لے گئے۔ میں اُس کی قوی حِس اُسکے جمیل صبر کو کبھی نہ بھُولونگا۔

کچھ دن ہوتے مجھے ایک نوجوان و . . . . . نامی مِلا۔ وہ ایک صاف گو، کشادہ دل شخص ہے۔ جس کے چہرے سے بشاشت ٹپکتی ہے۔ اُسے یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم ختم کئے ہُوئے تھوڑی ہی مُدّت ہُوئی ہے۔ اُسے اگر اپنے پر گمانِ زیرکی نہیں۔ تو اتنا ضرور ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے زیادہ باخبر سمجھتا ہے۔ مجھے اُس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس نے محنت بہت زیادہ کی ہے۔ اور اِس سلئے اُس کے ہاں معلومات کا کافی ذخیرہ جمع ہے۔ اُس نے میرے متعلق کہیں سے سُن لیا ہوگا۔ کہ میں تصویریں بہت بناتا ہوں۔ اور یونانی زبان بھی پڑھنا جانتا ہوں (مُلک کے اس حصے میں یہ دو عجوبۂ روزگار چیزیں ہیں) اس سلئے وہ میری ملاقات کو آیا۔ اور اپنے علم کا سارا سرمایہ ہیپّو سے لیکر وُڈسٹک اور ڈی پاتیلز سے لیکر وِنکل مین تک مجھ پر ظاہر کر دیا۔ پھر اِس بات کا بھی مجھے یقین دلایا۔ کہ "سلزرز کے نظریّہ کا پہلا حصّہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اور مطالعہ انطیقات کے موضوع پر ہین کا ایک قلمی نسخہ بھی میرے پاس ہے"! میں نے یہ سب کچھ بے چون وچرا تسلیم کر لیا۔

اس کے علاوہ ایک نہایت معزز آدمی سے مجھے واقفیّت حاصل ہوگئی ہے۔ یعنے یہاں کے ڈسٹرکٹ جج سے، جو ایک صاف دل کشادہ خاطر شخص ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اُسے اپنے نو بچّوں کے گروہ میں گھرا ہُوا دیکھنا ایک نہایت دلخوش کُن نظارہ ہے۔ اُس کی بڑی لڑکی کی نسبت بھی بہت کچھ سُننے میں آیا ہے۔ اُس نے مجھے ملاقات کی دعوت دی ہے۔ اور میرا ارادہ ہے۔ کہ اوّلین موقعہ سے مستفید ہونگا۔ بادشاہ کی ایک شکاری قیامگاہ اُس کا مکان ہے۔ یہاں سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہوگا۔ اُس نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد اُس میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ اُسے شہر میں کچہری کے قریب رہنا سخت درد انگیز معلوم ہوتا تھا۔

چند اور شخص جو میری نظروں میں کچھ مشکوک سے معلوم ہوتے ہیں۔ میرے صورت آشنا ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ ہر اعتبار سے ناپسندیدہ ہیں۔ اور ان کے اظہارہائے دوستی سخت ناقابلِ برداشت اور صبر آزما ہیں۔ خدا حافظ۔ یہ خط تمہیں ضرور پسند آئیگا۔ خط کیا ہے ایک داستان ہے!

(باقی باقی)

حقیقی راحت

(ایم لیول کے ایک فرنچ افسانہ کا ترجمہ)

بھکاری کا جسم سردی سے نیلا ہو رہا تھا۔ صبح امیروں کی گاڑیوں کے دروازے کھولنے اور بند کرنے کے صلہ میں جو چند پنس اُس نے کمائے تھے۔ اُنہیں کو جیب کی تہ میں ہاتھوں سے ٹٹول رہا تھا۔ اُس نے اپنا سر سرد ہوا کی شدت سے بچنے کی کوشش میں جُھکا دیا تھا۔ تیز گام رہروؤں کی بھیڑ میں وُہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرے ہُوئے ہاتھوں کو جیب سے باہر نکالنے کی اُس کی ہمّت نہ تھی۔ تکان کے باعث اُسے کسی سے گفتگو کرنے کی خواہش نہ تھی۔ برف کے پتلے پتلے گالے ہوا میں ادھر اُدھر اُڑتے ہُوئے اس کی ڈاڑھی اور گردن پر آ آکر گرتے۔ اور خود بخود پگھل جاتے تھے۔ لیکن اُسے کچھ پروا نہ تھی۔ وہ اپنے ہی کسی خیال میں محو تھا۔

"اگر مَیں امیر ہو جاؤں . . . فقط ایک گھنٹہ کے لئے . . . تو میں ایک گاڑی خرید لوں . . ."

وہ رُکا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے کچھ سوچا۔ اور پھر سر ہلا کر اپنے آپ سے پُوچھنے لگا۔

"اور کیا؟ . . . ."

متعدد عیش و عشرت کی اشیاء کے نظارے اُس کے خیال میں گذرے۔ لیکن ہر بار جبکہ کسی چیز کے حصول کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوتی۔ وہ سر ہلا دیتا۔

"نہیں یہ کچھ نہیں . . . تو کیا حقیقی راحت کا فقط ایک لمحہ حاصل کرنا اتنا سخت مشکل ہے؟ . . ."

اسی طرح چلتے چلتے اُسے ایک اور بھکاری نظر پڑا جو ایک مکان کے دروازہ کے سامنے بیٹھا ہُوا ٹھٹھر رہا تھا۔ اور کانپتے ہوتے ہاتھوں کو اُٹھا اُٹھا کر نہایت ہی ضعیف آواز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آواز بازار کے شور وغل میں دبی جاتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

"برائے خُدا کوئی مدد کرو! . . . خُدا کے واسطے کچھ دو! . . . ."

اس کے قریب ہی ایک دُبلا پتلا مسکین کُتّا بیٹھا تھا۔ کیچڑ میں لت پت بھونکنے کی کوشش کرتا ہُوا وُہ کانپ اُٹھتا تھا۔ بھکاری اُن کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ کُتّے نے اُس کو اپنا ہی ساتھی سمجھ کر آہستگی سے دُم ہلائی اور غرّانے کی کوشش کی۔

اُس نے غور سے بھکاری کی طرف دیکھا۔ پھٹے پُرانے چیتھڑوں، بوسیدہ ٹوٹی ہوئی جوتی پر نظر دوڑائی۔ اس کے سرد اور نیلے ہاتھوں کو دیکھا۔ اُس کی بند آنکھوں اور بدنما چہرہ پر نگاہ جمائی۔ اُس کی چھاتی پر لٹکتے ہوئے چھوٹے سے بورڈ کو دیکھا۔ جس پر فقط ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ . . "اندھا"

کسی آدمی کو اپنے قریب رُکتے محسوس کر کے اندھے نے اپنی گریہ وزاری شروع کی۔

"مدد موسیو! . . . . غریب اندھے پر رحم کھاؤ . ."

بھکاری بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ راہگیر منہ موڑ کر تیز گام ہو گئے۔

سموری پوشاک میں ملبوس ایک خاتون مکان سے باہر نکلی۔ ایک خادم چھتری لئے اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔

عورت تیزی سے چلتی ہُوئی سامنے گاڑی میں سوار ہو گئی

اندھے نے آواز لگائی۔

"مدد! . . . خُدا کے واسطے کچھ دیتے جاؤ . . ."

لیکن کسی نے کچھ دھیان نہ کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بھکاری نے اپنی جیب سے چند پنس نکالے۔ اور اندھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کُتّا دیکھ کر جوشِ مسرت سے بھونکنے لگا۔ اندھے نے نقدی مٹھی میں بند کر کے کہا۔

"شکریہ موسیو! . . . . خُدا تمہیں اس نیکی کا اجر دے"

اپنے آپ کو موسیو کے لقب سے مخاطب ہوتے سُنکر پہلے تو بھکاری کے مُنہ سے بے اختیاری میں نکلا۔

"مَیں موسیو نہیں ہوں۔ تمہاری طرح ہی ایک غربت زدہ مُصیبت کا مارا ہوں۔"

لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ کیونکہ وہ خُوب اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ غریبوں کے ساتھ لوگوں کا انداز تکلم کیسا ہوتا ہے۔ اِسی لئے بولا:۔

"نہیں بھائی یہ تو کچھ بھی نہیں۔ . . ."

"موسیو! آپ بڑے نیکدل ہیں . . . اتنی سخت سردی میں آپ نے میری خاطر اپنا ہاتھ جیب سے باہر نکالنے کی تکلیف گوارا کی۔ کمزوروں کے لئے یہ موسم سخت خراب ہے . . . کاش کہ لوگ جانتے ! . . "

"فقیر کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ بولا۔

"مَیں جانتا ہوں . . . مَیں جانتا ہوں . . . "

اپنے سے زیادہ مصیبت زدہ کے سامنے وہ اپنا افلاس بھی بھُول گیا۔ کہنے لگا۔

"کیا تُم پیدائیشی اندھے ہو؟"

"نہیں . . . . . یہ مصیبت بڑھاپے کے ساتھ آئی تھی . . . . ہسپتال والے کہتے تھے۔ یہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے . . . . اس کا نام وُہ شاید دھند بتلاتے تھے . . . لیکن مَیں اُن سے بہتر جانتا ہوں۔ مجھے معلوم

ہے۔ کہ اس کا سبب فقط بڑھاپا نہیں . . . اور کچھ بھی ہے۔ مجھے بہت مصیبتیں اُٹھانی پڑی تھیں مَیں نے بہت آنسو بہاتے ہیں . . . ."

"تب تو تمہیں بہت تکلیف اُٹھانی پڑی ہوگی!"

"آہ موسیو! . . . . ایک برس کے عرصہ میں ہی میری بیوی، میری لڑکی، میرے دو لڑکے چل بسے . . . جن جن کو مَیں پیار کرتا تھا۔ وہ سب چلے گئے۔ میرا تمام اثاثہ محبت ایک سال میں ہی لُٹ گیا۔ خود مَیں بھی نیم مردہ ہوگیا . . . مرا نہیں! . . . . بدقسمتی سے بچ گیا! لیکن اب بالکل اپاہج ہوگیا ہوں۔ کسی کام کے قابل نہیں رہا۔ . . . اب غربت نے آدبایا ہے . . . . کئی کئی روز مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملتا۔ کل سے مَیں نے سوائے ایک سوکھی روٹی کے اور کچھ نہیں پایا۔ وہی آدھی کُتّے بیلم کو دیدی تھی۔ اور آدھی آپ کھائی تھی۔ . اب آج آپ کی دی ہُوئی نقدی سے کچھ روٹی خریدونگا۔"

بھکاری نے جیب میں بچی ہُوئی نقدی کو ہاتھ سے ٹٹول کر گننا شروع کیا۔ کل ساڑھے گیارہ پنس تھے۔ بولا۔

"اُٹھو میرے ساتھ چلو۔ یہاں سخت سردی ہے۔ آؤ تمہیں کچھ کھانے کے لئے لے دوں۔"

اندھا مسرت سے بیخود ہوگیا۔ لکنت سے بولا۔

"آہ موسیو! تُم بڑے نیکدل ہو . . ."

"آؤ . . . ."

یہ سوچکر کہ کہیں اندھے کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ وہ خود سخت بھیگا ہُوا اور کمزور ہے۔ بھکاری نے پہلے ہی اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اور ساتھ ساتھ اسی طرح کچھ دُور چلنے کے بعد آخر وہ ایک معمولی سے قہوہ خانے کے سامنے جا کھڑے ہُوئے۔

بھکاری نے دروازہ دھکیل کر کھولا۔ اور اندھے سے کہا۔ "اندر آجاؤ . "

انگیٹھی کے نزدیک لگی ہُوئی ایک میز پر اُس نے اندھے کو بٹھلایا۔ اور خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا

چند مزدور خاموشی سے بیٹھے ہُوئے کھانے میں مشغول تھے۔ اندھے نے کُتّے بیلم کو چھوڑ دیا۔ اور آگ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"اہا! یہ جگہ کیسی آرام دہ ہے . . . !" وہ ایک آہ سرد بھر کر بولا۔

بھکاری نے خدمتگذار لڑکی کو بُلایا۔ اور اُسے کچھ شوربا اور گوشت لانے کو کہا۔ لڑکی نے پوچھا۔

"اور تمہارے لئے؟"

"کچھ نہیں۔"

گرما گرم شوربا اور لذیذ گوشت اندھے کے سامنے رکھے گئے۔ اُس نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ کبھی کبھی

وُہ روٹی کے ٹکڑے اور ہڈیاں میز کے نیچے کُتّے کے لئے پھینکتا جاتا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو بھکاری نے کہا۔

"کچھ پی بھی لو۔ ٹانگوں میں طاقت آجائیگی۔"

پھر اُس نے نوکر سے پُوچھا

"کل دام کتنے ہوتے ہیں؟"

"ساڑھے دس آنے۔"

اُس نے ادا کر دیئے۔ اور ایک پنس لڑکی کے لئے رکھ لیا۔ ساتھی کو سہارا دیکر اُس نے اُٹھایا۔ اور جب وہ باہر بازار میں پہنچ گئے۔ تو اُس نے اندھے سے پُوچھا۔

"یہاں سے کتنی دُور رہتے ہو؟"

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

"سینٹ لیزار اسٹیشن کے متصل"

"تو پھر ابھی بہت دُور جانا ہے۔ مَیں دریا کے پار ایک چھپّر میں سوتا ہوں۔"

"چلو میں تھوڑی دُور تک تمہیں چھوڑ آؤں۔"

اندھا اظہارِ شکریہ میں جُھک گیا۔ بھکاری نے کہا

"نہیں۔ نہیں۔ ... یہ کچھ بھی نہیں۔"

بھکاری کا دل ایک عجیب خوشی سے لبریز تھا ویسی خوشی اُس نے عمر بھر کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ خوابی خیالوں میں مست وہ اندھے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اُس وقت اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ کہ خود اُس نے دو روز سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اور اُس کے پاس رات کو سر چھپانے کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں۔ اپنی مصیبتوں اور پھٹے پُرانے چیتھڑوں کو وہ قطعاً بھُول چکا تھا۔ اُسے اپنے فقیر ہونے کا بھی علم نہیں رہا تھا۔

چلتے چلتے وہ اندھے سے پُوچھتا جاتا تھا۔

"ہم تیز تو نہیں چل رہے؟ تم تھک تو نہیں گئے؟"

"نہیں ... نہیں موسیو! ..."

وہ مُسکرایا۔ اپنے آپ کو اُس انداز میں مخاطب ہوتا ہُوا سُنکر وہ بڑا خوش ہُوا۔ اندھے کو مغالطہ میں مبتلا دیکھ کر اُسے بڑی راحت محسوس ہُوئی۔ اپنے آپ کو مخیر خیال کرکے اُس کا دل مسرت کے ساتویں آسمان پہ جا پہنچا۔

دریا کے کنارے پہنچ کر اندھے نے ہوا میں نمی محسوس کی۔ بولا۔

"اب مَیں اپنا راستہ ڈھونڈ لونگا۔ میرے ساتھ میرا کتا بھی ہے۔"

"اچھا پھر مَیں چلتا ہوں۔ خدا حافظ!"

اُس وقت ایک عجیب خیال نے اُس کے دل پر قبضہ جما لیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا میری تمنا بار آور نہیں ہو گئی؟ کیا آخر کار میرا دل خالص مسرت سے بہرہ اندوز نہیں ہو گیا؟ اس پچھلے

گھنٹہ میں کیا مَیں نے وہ خوشی حاصل نہیں کی جو کہ لذیذ ترین کھانوں، زرو جواہر اور محبّت کے خوابوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی؟ اس اندھے غریب کو کیا معلوم کہ وہ ایک اپنے جیسے ہی محتاج اور افلاس زدہ کے ہاتھوں یہ آرام اور محبّت کا سلوک حاصل کر رہا ہے! . . . اخاہ اس پچھلے گھنٹہ میں مَیں بالکل امیر بن گیا تھا۔ انہیں کا سا دِل . . . . اُنہیں کا سا دماغ! . . لیکن آہ! اب ایسی خوشی آئندہ کب ملے گی!

لیکن احساس مسرت بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ جلد ہی حقیقت عریانی میں نظر آنے لگی۔ اُس نے دوبارہ کہا

"ہاں... تو مَیں چلتا ہوں۔"

وہ اُس وقت تک پُل کے وسط میں پہنچ چکے تھے بھکاری نے ایک دفعہ پھر جیب کو ٹٹولا۔ شاید کوئی ایک آدھ پینی ہی جیب میں بچ رہی ہو۔ لیکن نہیں جیب بالکل خالی تھی اُس نے اندھے کا ہاتھ پکڑا۔ اور جوش سے دبایا۔ اندھے نے کہا۔

"موسیو! ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بڑے مہربانی اپنا نام بتلاتے جائیں۔ مَیں آپ کے حق میں خداوند کریم سے دُعا مانگونگا۔"

نہیں نہیں یہ کونسی بڑی بات تھی۔ خوشی تو مجھے حاصل ہُوئی ہے۔ بس اب جلد سردی سے نکل جاؤ . . . الوداع!"

بھکاری تھوڑی دُور واپس چلا۔ پھر رُک گیا۔ اُس نے نیچے پانی کی سیاہ چادر کی طرف غور سے دیکھا۔ اور ایک دفعہ پھر بلند آواز سے بولا۔

"الوداع! . . . ."

اور یکایک وہ جنگلے سے پھاند پڑا! . . .

پانی کے چھلکنے کی زوردار آواز آئی۔ . . . اور پھر مدد! مدد!" . . . کنارے کی طرف دوڑو وغیرہ کا شور سُنائی دینے لگا۔ کئی اندھے کو دھکیلتے ہُوئے نکل گئے۔ اُس نے اُن سے پُوچھا۔

"کیا ہُوا؟ کیا ہُوا؟

ایک چھوٹے سے لڑکے نے چلّا کر کہا۔

"ایک فقیر نے دریا میں گر کر خودکشی کر لی۔"

اندھے نے تکان اور حسرت بھرے انداز سے شانے ہلاتے اور بڑبڑایا۔

"آہ! اُس میں دلیری تو تھی۔"

پھر اُس نے کُتّے کو بوٹ کی نوک سے چلنے کا اشارہ کیا اور زمین پر لکڑی ٹیکتا ہُوا آگے کی طرف روانہ ہوگیا۔

گوپال کرشن یاس

انفاسِ مسیح

گل تازہ تر ز چمن محبت گلعذار بہ من درا
اگرت بسر ہوس است ازو در سینہ زن بچمن درا

بگذار اے ہوس جہاں کہ کنم نداش بگوشِ جاں
چو دہد سروش ز آسماں کہ تو اے فلاں بہ وطن درا

تو اے زلفِ از رُخ یارِ مادم خواب ناز مشو جُدا
چو ازو جدا کند ت صبا تو ز برہمی بشکن درا

نظرے بمن بُتِ چین من بدرت رسید جبینِ من
بلب است جانِ حزینِ من لب خود کشا بسخن درا

تو ز دردِ عشق فغاں مکن، تو ز دیدہ اشک رواں مکن
تو نہانِ خویش عیاں مکن تو چو عاشقی بہ رسن درا

بکشا ز زہد خودت گرہ چو رسد پیام ز میکدہ
کہ زکہنہ حجرۂ خانقہ نجسم شراب کہن درا

بتو گفتم اے لب مشتری کہ تراست حاجت رہبری
چو تو خواہی لعل و گہر خری زرہِ سخن بعدن درا

(حضرتِ مسیح الملک مدظلہ)

انحطاطِ شباب

ایک افسانہ

بہار میں اور ناصر کی ملاقات، ایک موجِ طرب تھی۔ کہ سر سے گذر گئی۔ ایک نشہ تھا۔ کہ دل و دماغ پر چھا گیا۔ اس کے زمانہ مفارقت کی خمار اندوزیاں جنکی تلخ ترین حالت ان لمحاتِ زرّیں کی یاد سے وابستہ تھی۔ جو میری نام نہاد زندگی کے سکون میں تلاطم پیدا کر دیتے تھے۔ ابھی تک ہنگامہ افروز تھیں۔ معاذ اللہ، جب وہ اوّل اوّل مجھ سے جُدا ہوا ہے۔ تو مَیں نے کتنے لیل و نہار اور ایسے لیل و نہار جو افتخارِ روزگار تھے۔ صرف اسی کو پا لینے کے لئے صرفِ جستجو کر دیئے تھے۔

میری زندگی جو مختلف النوع حوادث کا مجموعہ تھی، وہ پیش پا افتادہ حوادث جو اپنی اہمیّت بار بار کے اعادہ سے کھو بیٹھتے ہیں، میرے جنون پرور اور مضطرب دل میں نہ کوئی احساس پیدا کر سکتی تھی نہ شعریت، ناصر کا سازِ جذبات میرے مضرابِ زندگی کے لئے ایک کیفیت تھی نوزائیدہ، ایک تنوع تھا خوش گوار، اس کا متلاطم بحرِ زندگی، جسے آپ ناواقفیت سے ہوس کارانہ طرزِ نمایش پر مبنی کہہ دیتے، میری پرسکون حالت سے کسقدر متضاد تھا۔ کہ مَیں دراصل اپنی محبّت کو اسی تباین پر قائم کرتا تھا۔ اگرچہ آیندہ واقعات نے ثابت کر دیا۔ کہ یہ محبّت ایک فطرتی شے تھی۔

ہم تقدیر اور تدبیر کی مخاصمت باہمی پر اپنے واقعات کے نتائج کی بِنا رکھتے ہیں۔ شاید یہ حادثاتِ زمانہ کا وہ سیل تھا۔ جو ہمیں پرکاہ کی طرح گردشِ مدام میں رکھتا ہے اور اتفاق کے عمومی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو مجھے اس شام دریا پر لے گیا۔ مگر مَیں تو اس کی ایک اور دل آویز وجہ قرار دیتا ہوں۔ کسی محبوب ترین ہستی کی ہر اک حرکت اور ہر اک انداز میں ہم ایک خاص دلفریبی محسوس کرتے ہیں۔ ناصر کے وہ جنون انگیز لمحات جب وہ لڑکوں کی لاحاصل گفتگو سے جسے وہ "مہذب تضیع اوقات" کہا کرتا تھا۔ تنگ آجایا کرتا تھا۔ اور یکبار گھبرا کے باہر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے ابتک

یاد ہیں۔ ہم اُسے ہر جگہ ڈھونڈتے اور نہ پاتے۔ آخر الامر جب اس حیرت خیز حقیقت کا انکشاف ہُوا کہ آپ ان لمحوں میں بیک بینی و دو گوش، راوی کے کنارے ایک عجیب بیکس انداز سے ریت پر بیٹھے رہا کرتے ہیں۔ تو یہ کالج کے لئے ایک چند روزہ مشغلہ ہوگیا۔ اور میرے لئے اسکی بیقرار فطرت کا ایک بدیہی نمونہ انہیں واقعات کی یاد مجھے اس دن دریا پر لے گئی۔

. . . . . .

مَیں ناصر کی ملاقات کا کیف لفظوں میں کیسے بھر دوں مَیں اس بات کی لاحاصل کوشش کیوں کروں جس پر مَیں قادر تو ہوں۔ مگر بیان نہیں کرسکتا۔ جسے مَیں محسوس تو کرتا ہوں۔ مگر کسی اور کو اس کا احساس نہیں کرا سکتا۔ پہلے تو اس کے غائب رہنے اور بلا اطلاع آجانے کے وجوہ بہت سادہ ہُوا کرتے تھے۔ کوئی مجسم پیکرِ حسن اسکی ریائی پارسائی کو بیک نگاہِ تبسّم خیز برباد کر دیتا تھا۔ اور وہ کچھ عرصے کے لئے شوخ "کم نگاہی" اور عشق پرور تغافل کی تلخیوں سے آشنا ہوکر، پھر اپنا معمولی انداز بذلہ سنجی اختیار کرلیتا۔ کوئی المناک سے المناک حادثہ اس کی ظرافتِ طبعی کو فنا نہ کرسکتا تھا۔ ہر وقت چھلکتے ہوئے قہقہے اس کے قرب و جوار میں گونجا کرتے، مگر اب جو مَیں نے اسے دیکھا تو اس کی پہلی اور موجودہ حالت میں زمین و آسمان کا تفاوت پایا۔

آسمان پر ہلکا ہلکا ابر تھا۔ اور ہر درخت کے پتّے پردہ ہائے ساز بن گئے تھے۔ دُور، اُفق کی سُرخ روشنی، تمام دریا کو شرابِ ارغوانی بنا رہی تھی۔ اور وہ اس دل افروز منظر کے درمیان، ایک افسردہ اور مضمحل انداز سے ٹہل رہا تھا۔ اپنی نظر زمین پر گاڑے ہُوئے فطرت کی دلچسپیوں سے بالکل بے خبر، اگر اس کی نگاہ اُٹھتی بھی تو بیشتر اس کے کہ وہ کسی چیز کا جائزہ لے۔ پھر اپنے مطمحِ نظر پر جم جاتی مَیں حیران تھا۔ کہ کیا یہ وہی ناصر ہے۔ جو ہر اس دن جب کوئی معمولی سا طوفان بادو باراں، بجلی کی بیقرار مشایعت کے ساتھ اُٹھتا۔ اجتماع کی اساسی بندشوں، اور ادب کی رسم و راہِ عام سے بے نیاز ہوکر تختی بالطبع ہوجاتا۔ اور تمام بورڈنگ کی وسیع فضا میں موسیقی کی دلفریب لے گونجنے لگتی۔ اور ناصر کی سُریلی آواز ان اشعار کو دُہراتی ہوئی:۔

نو بہار است ساقیا برخیز
مے گلگوں بہ کاسۂ ما ریز
مطرب اِک نغمۂ نشاط افروز
ساقی اِک جرعۂ سرور انگیز
نائے دلکش بہ نوحہ فرعون
جامِ بینش بہ کوریٔ چنگیز

تمام ان خشک مزاج طلباء کی انتہائی ناراضگی کا باعث ہوتی۔ جو ایسے دن اور ایسے وقت بھی چند درسی کتابوں

کے صفحوں کو اپنے دماغ میں جذب کرنا" لیاقت کی بہترین دلیل اور کامیابی کا واحد وسیلہ سمجھتے تھے۔

مَیں نے اس سے بہت سے سوالات کئے تھے مگر ان کے بے ربط جوابات سے صرف یہی مفہوم منضبط ہوتا تھا۔ کہ گذشتہ تین سال تو عجب بے لطفی میں کٹے اور اب اُس نے دل میں یہ ٹھانی تھی کہ "شورش ہنگامۂ ہستی سے دُور" راوی کے کنارے چھاؤنی چھائینگے۔ مگر یہاں بھی میری خواہی نخواہی دخل در معقولات اس کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔

یہ جواب گویا ایک طنز یہ طعنہ تھا میری آمد پر۔ مگر میری فراوانِ ارادت، اس کے دامن سے ایسی ناستوار وابستہ نہ تھی۔ کہ اس ذرا سی سرزنش ناز پر چراغ پا ہو جاتی مَیں نے اپنی شکوہ گذاریوں کو کسی وقتِ دیگر پر موقوف رکھا اور اسے صرف اسی بات پر مجبور کیا۔ کہ وہ میرے ساتھ چلا چلے۔ اور شکر ہے کہ میرا خلوص نیّت کامیاب اور صداقت بار آور ہوئی۔ اور کچھ عرصے کے بعد بغیر حیلہ و حجت کے وُہ میرے ساتھ ہو لیا۔

. . . .

اتفاق کی بات کہ اس وقت ہمارے مخصوص حلقۂ احباب میں سے صرف حاجی اسمٰعیل صاحب موجود تھے۔ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ جنہیں ناصر اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بہت برانگیختہ کر دیا کرتا۔ اور جو اپنی دستار تقدس اور مناسک حج کے بسر چلنے کے بھروسے پر، اسے بہت دفعہ ملحد اور مشرک کا رسمی خطاب دے چکے تھے۔ ان کی عادت تھی۔ کہ گفتگو کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ دخل در معقولات کے لئے ہر وقت مستعد رہا کرتے۔ آپ کالج میں دو اشخاص کو اپنی باتوں میں مشغول دیکھتے۔ اور اس وقت جو صاحب اپنی ریش مقدس پر بار بار ہاتھ پھیر کر اپنی بیقراری کا بیّن ثبوت دے رہے ہوں۔ اور اپنے چہرے کو ان دونوں بیچاروں کے درمیان زاویۂ قائمہ بنا کر اپنی بات کی اہمیت کو محسوس کرانے کی غرض سے اپنی دونوں کہنیوں سے گاہ گاہ ٹھوکا بھی دیتے جائیں۔ وہی ہمارے محترم مہربان حاجی صاحب ہیں۔

مَیں ناصر کو چند لمحوں کے لئے چھوڑ کر دوسرے مشاغل کی طرف متوجہ ہُوا ہی تھا۔ کہ ان کی درشت آواز میرے کان میں پڑی۔ قریب جا کر جو دیکھتا ہوں تو حاجی صاحب ناصر کے بازو کو اپنے دائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے ہیں۔ اور زبانِ گوہر افشاں سے اس کی طویل "ہرزہ گردی" پر ایک مسلسل لکچر دیا جا رہا ہے۔ اور بیچارہ ناصر جو پہلے ایسے موقعوں پر عین بدمستی اور سرخوشی کی حالت میں مسکرا کر کہہ دیتا کہ

نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

ب ایک ترحم آمیز طریقے سے اپنی نگاہ حاجی صاحب کے چہرۂ شرعی کی طرف اُٹھاتا ہے۔ اور زیرِ لب گنگناتا جاتا ہے ؎

بیرقؔ میں تباہی رونق کاشانہ ہو جائے
قفس ہی نالوں سے جل کر چراغ خانہ ہو جائے

میں نے قریب جاکر ناصر کی گلوخلاصی کرائی۔ اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔"

. . . .

کسی ادب دان فلسفی کا قول ہے۔ کہ اس وقت جب ماہِ درخشاں معشوقۂ کائنات کو چادر نور اڑھا دیتا ہے۔ تو تمام عشاق اپنی زندگی کو محض اس لئے سرگرم کار بنا دیتے ہیں۔ کہ اپنی تمناؤں کے سرتاج کے چند زرّیں لمحے اپنے لئے مخصوص کر لیں۔ یہ قلیل الفرصت ایام جن کی شگفتگی اور ہنگامہ آرائی محض ان کی چند روزہ زندگی میں مضمر ہے۔ ان کے لئے تو ایک بہانہ ہوتے ہیں حصول ملاقات کا۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ زندگی کے یہ ایام نازِ حسن اور نیازِ عشق کی کیف پرور بیخودی میں گذر جائیں۔ جن کی یاد فصلِ خزاں میں بھی ایسی ہی طرب انگیز ہو جیسا بذات خود ان کا واقعہ ہوتا تھا۔

کچھ اسی طرح کے جذبات میرے دل میں بھی ناصر کی تجدید ملاقات کے بعد شورش افزا تھے۔

آہ، پہلے تو ایسے موقعوں پر میں نے کتنی ہی چاندنی راتیں صرف اس کی لاابالی گفتگو اس کے بے پروا انداز خرام، اس کے وارفتہ حرکات کے دیکھنے میں گذار دیں۔ اس کیف نظارہ سے نشاط انگیں لمحات حاصل کرنے تو کوشش لاحاصل کے مصداق تھے۔ کہ اس کی جدائی کا خوف ایک لرزۂ پیہم بن کر مجھے پریشان کرتا رہتا، اسے میرے وہم کی سراب آفرینیاں کہئے یا میرے دل کی حساسی، ہاں میں یہ کر سکتا تھا۔ کہ جس وقت وہ بازار میں چلتے چلتے کسی خاص مسئلے پر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرے۔ تو میں اپنے حواس کو اسکی سامعہ نوازی اور باصرہ افروزی کی نذر کر دوں۔ اور اس بات کا خیال بھی نہ کروں کہ وہ کس بحث پر گفتگو کر رہا ہے۔ اس سے اتنا تو ہو جاتا۔ کہ کچھ عرصے کے لئے میرے دل سے اس کی جدائی کا خیال بالکل اُتر جاتا۔ مگر ایک دن مجھ سے کسقدر گلۂ تغافل کیا گیا۔ جب وہ پھول جیسی لطیف چیز پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ اور میرے دل و دماغ کسی اور طرف مصروف تھے۔

اس نے اپنی کہنیوں سے مجھے ٹھوکا دیا۔ اور کہنے لگا۔ "سنتے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں، وہی پھول جسے اپنے اوراق پر اسقدر غرور نزاکت ہے۔ اپنی دلآویزی کا راز محض اس بات میں پنہاں رکھتا ہے۔ کہ اس کی دلآویزی کا خاص باعث یعنی نزاکت ہی، خزاں کے صدمے تو ایک طرف

بادتند کے تھپیڑوں کو بھی نہیں سہ سکتی۔

مَیں اس فقرے کا جواب کیا دے سکتا تھا جب مجھے تقریر کی ابتداء و انتہا کی ہی خبر نہ تھی مَیں نے آہستہ سے اُسے بیدل کے یہ شعر سُنا دیے۔ ؎

نقاب عارض گلپوشش کردۂ ما را
تو جلوہ دادی و مدہوش کردۂ ما را
خراب میکدۂ عالم خیال تو ایم
چہ مشربی کہ قدح نوشش کردۂ مارا

اسی طرح جب رات ہو جاتی، اور اس کا دلکش سناٹا عالم پہ چھا جاتا، تو مَیں اپنے بستر پر لیٹا سوچا کرتا۔ کہ مَیں نے اپنے دل کو تسلّی دے لی تھی۔ کہ میری زندگی کے سکون انجمادی میں کچھ ناصر ہی کے ہنگامہ جذبات سے کمی نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کے اور بھی ذرائع ہیں۔ مگر اس کی ملاقات کے بعد مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ وہ تمام خیالات صرف اس کلیے پر مبنی تھے۔ کہ جو چیز بسہولت نہیں آ سکتی ہم اُس کی نسبت تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

. . . .

اب ایسی ملاقاتوں میں ناصر ہنسنا تو در کنار، مسکرانا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی رُوح نے نشاط انحطاط کی آخرین پستیوں سے تنگ آ کر ظلمت بیگانگی اختیار کر لی ہے۔ میری یہ مراد نہیں۔ کہ ناصر کی طبیعت جامد ہو گئی ہے۔ نہیں، ناصر کی تابناک لطافت باریاں اگر پہلے شگفتگی کے پردے میں جلوہ افروز تھیں۔ تو اب وہ لطیف اور رقیق افسردگی کی صورت میں تبدیل ہو گئیں تھیں۔ اس کی حالت اس ہمہ گیر اور ہمہ سوز مایوسی کی تو نہیں تھی۔ جو عام اشخاص پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور جو اُن پر ایک ایسی مہیب خاموشی مسلط کر دیتی ہے۔ کہ خُدا کی پناہ، اس کا پردۂ ابتلا اسقدر باریک تھا۔ کہ اگر آپ چاہتے۔ تو بہت تھوڑی شفقت سے اسے ہوائے عیش میں تحلیل کر سکتے تھے۔

اس کے جذبات اسی طرح ہنگامہ پرور تھے۔ مگر اب ان میں وہ بلند آہنگی باقی نہ رہی تھی۔ جو بعض اوقات کرخت معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی جگہ اب ایک شیریں و آوارہ نغمہ نے لے لی تھی۔ جو پہلے سے بدرجہا عشرت افزا تھا۔

اُف، وہ منظر ابتک میری آنکھوں میں ہے۔ جب ایک دن مَیں اور ناصر سیر کے لئے تیار ہی تھے۔ کہ چند احباب آ گئے اور اگرچہ مَیں تمام قواعد تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر انہیں رخصت کر دینے والا تھا۔ مگر ناصر نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور خاموشی سے اس جانفرسا عذاب الیم کو برداشت کرنے لگا۔ جو اسے صحبت ناجنس سے ہوا کرتا تھا پھر مستزاد یہ کہ وہ اس عذاب کو برداشت کر لینا ناگوار نہ خیال کرتا تھا۔ مگر کسی کے دل توڑنے سے اسے سخت نفرت تھی۔ اس نے اپنے کسی نام نہاد دوست کو کبھی کنایتاً

بھی نہیں جتایا۔کہ وہ اپنے وقت کو ضائع کر رہا ہے۔

ہاں تو ہمارے احباب میں سے اُس دن وہ دو شخص تشریف لائے تھے۔جو اپنے تمام ہمچشموں میں اپنی شعر فہمی اور سخن سنجی کی وجہ سے مشہور تھے۔اور جن کی مصحف کمال کی آیتوں میں سے یہ آیت مقبول خواص و عوام ہو چکی ہے کہ

عناب لب، لعاب دہن، شربت وصال
نسخہ یہ چاہئے تیرے بیمار کے لئے

ان ظالموں نے ناصر کی موجودہ حالت اور گذشتہ حالت کے تباین کو دیکھ کر بہت سے نظریئے قائم کر لئے تھے اور غضب یہ کہ ان کو ناصر کے سامنے بیان کرتے ہوئے بھی نہ جھجکتے تھے۔صغریٰ اور کبریٰ ترتیب دیتے تھے اور جب مغالطہ واقعہ ہوتا تھا۔تو شرماتے تھے۔مگر اپنی ڈھٹائی سے باز نہ آتے تھے۔یہ اس بات کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔کہ ناصر انہیں قابل خطاب بھی نہیں خیال کرتا تھا۔

ان میں سے ایک صاحب نے ناصر کی طرف مخاطب ہو کر بہت بے تکلفانہ انداز میں کہا "واللہ، ناصر تمہاری یہ افسردگی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔کہاں تو وہ ضرورت سے زیادہ خوش مزاجی، اور کہاں یہ انقباض دلی۔

تم نے اپنے امتیازی خصائل کو بھی چھوڑ دیا۔حسن پرستی راس نہ آئی۔یا کسی کی بیوفائی نے چرکا لگایا . . . . ."

اور خدا معلوم ان کی اس بے ربط تقریر کا سلسلہ کہاں ختم ہوتا۔اگر میں قطع کلام نہ کر دیتا۔

"دیکھنا کیسا پُر بہار ابر اُٹھا ہے۔اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ہمارا ترجمانِ جذبات کیا کہتا ہے:۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

میرے اتنا کہنے کے بعد کچھ عرصہ تو کمرے میں خاموشی طاری رہی۔اور میر صاحب میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھنے لگے۔پھر ناصر کی طرف متوجہ ہوئے۔اور مسکرا کے فرمانے لگے" آؤ۔چلو تو، سُنا ہے تھیٹر میں گوہر جان رونق افروز ہے۔گانا تو غضب کا گاتی ہے۔کیا لوچ کا گلا پایا ہے۔سبحان اللہ، ایک دفعہ سُن لیجئے۔اگر یہ تمام خلوت نشینی چھوڑ چھاڑ کے اس کے نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ"

میر صاحب دم لینے لگے۔اور ناصر نے میری طرف حسرت آفرین نگاہوں سے دیکھا۔پھر ایک عجیب مضمحل انداز سے اپنی ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی۔اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا:۔

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں"

. . . . . .

ناصر کے عادات و اطوار میں سے ایک حیرت خیز بات یہ تھی۔کہ عین ان مواقع پر جس وقت اس کی واقفیت عامہ

اور ذوق ادبی اسے تمام محفل میں ایک نمایاں رتبہ دے سکتے تھے۔ اسی وقت وہ خاموشی کو بروئے کار لایا کرتا تھا۔ وہ اس بات کا سخت مخالف تھا۔ کہ کوئی وجدان سلیم رکھنے والا شخص اپنے جذبات کا اظہار تنقید کے عمومی پیرایہ میں کرے۔ اس نے کسی شاعر کے شعر سُنکر ان کی ایسی سخن نافہم داد نہیں دی۔ جو عام طور پر مشاعروں میں دیکھی جاتی ہے۔ ہاں جس وقت وہ تنہا کسی خاص شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس وقت اس کے مُنہ سے جو اضطراری کلمات نکل جائینگے۔ وہ نہ صرف اس کے احساسات کا آئینہ ہونگے بلکہ بہترین تنقید کہلانے کا بھی انہیں کو حق حاصل ہوگا۔

مَیں نے سوچا کہ ہنگامِ مطالعہ چپ چاپ اس کے کمرے میں گھُس جاؤنگا۔ اور اپنی عادت سے مجبور ہوکر وہ جس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوگا۔ اس کی نسبت کچھ نہ کچھ کہنا اس کے لئے ناگزیر ہوگا۔ پہلے ایک ایسے موقع پر جب مَیں نے ایسا ہی کیا تھا۔ تو چند عجیب شعر سُنے تھے۔ وہ آجتک میرے حافظے پر ثبت ہیں۔ اب اتنے عرصے کے بعد مجھے پھر اسبات کا خیال آیا۔ شام کا وقت تھا۔ اور تمام طلباء اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے کتابوں کو ازبر کر رہے تھے۔ مجھے سامنے ہی ناصر کا کمرہ نظر آرہا تھا۔ جس کو ایک دبیز چک ڈھانپے ہوئے تھی۔ مَیں آہستہ سے اس کے کمرے تک پہنچا۔ اور جھانک کر دیکھا تو وہ ایک آرام کرسی پر لیٹا ہُوا تھا۔ اور ہاتھیں کلیاتِ اکبر لئے ہوئے تھا۔ میرے دل میں ایک ہنگامہ طرب برپا ہوگیا۔ اکبر — وہ ظریف، زندہ دل ہستی جس کی چٹکیاں، علی الرغم پند و نصیحت، روتوں کو ہنسا دیتی ہیں۔ ناصر کے لئے کتنی طرب افزا ہوگی۔ جس شخص کا ذوق شعری ابھی تک شوخی و تمسخر سے تسکین پاتا ہے۔ اس کی طبیعت افسردہ کیسے رہ سکتی ہے۔ مَیں چک اُٹھا کے اندر چلا گیا۔ اس نے مُڑ کر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "بیٹھئے" لسان العصر کے کچھ شعر سُناؤں۔

اب مَیں بیتاب ہوں، کہ دیکھئے زندہ دلی کا کونسا تازہ نمونہ فردوس گوش ثابت ہوتا ہے۔ کہ ناصر کی غمگین آواز یہ شعر دُہراتے ہوئے سُنائی دیتی ہے:۔

ہے تجلی نور حیرت کی براہ شعلہ بار
ہر تپش سینے کی برق طور ایمن ہے یہاں
شعلۂ غم سے دلِ سوزاں میں اک جاں آگئی
روح پرور اختلاط برق خرمن ہے یہاں

اس کے بعد کمرے میں پورے آدھ گھنٹہ خموشی طاری رہی، ناصر زمین پر نظر گاڑے مُسکرا رہا تھا۔ اور غم و غصّہ کی وجہ سے مجھے کوئی شے نہ ملتی تھی۔ جس پر مَیں برس پڑتا۔ آخر کار جب مَیں بہت عرصے کے بعد اپنے جذبات کو قابو میں لے آیا۔ تو اُٹھکر رُخصت ہونا چاہتا تھا۔ کہ ناصر نے میرا دامن پکڑ کے مجھے بٹھا لیا۔ اور بغیر تمہید کے وہ

جگر خراش داستان شروع کی۔ جس کا ایک ایک حرف
میرے دماغ پر نقش خونیں کی طرح ثبت ہے۔

. . . . . .

مختلف شہروں میں آوارہ گردی کے بعد ایک
مخلص دوست نے چندے شدّت اضطراب کو کم کرنے
کی کوشش کی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ اُس کی
"مساعی جمیلہ" تھیں۔ اور میرے لئے وہ تقدیر کی خوفناک
اور ناگزیر گرفت تھی۔ جو مجھے بمبئی کے حسن آباد میں نوید راحت
دینے لگی۔ مَیں نہیں جانتا کہ وہاں کی بوقلموں نظاروں اور
گوناگوں شادابیوں سے میں کتنی جلد تنگ آجاتا مگر ایک
اور بالواسطہ دوست نے اس بات کو محسوس کرنے سے
پیشتر ایک ایسے مشغلے کی طرف متوجہ کر دیا۔ جو میری زندگی
کے المناک ترین واقعہ سے عبارت ہے۔

ایک دن جب میرے تمام احباب ایک تھیئٹر کے
نئے تماشے میں میری بیعت کو بہت ضروری اور لابدی
خیال کر رہے تھے۔ اور میری مسلسل غیر شاعرانہ "نہیں"
ان کے اصرار کو اور بھی دوبالا کر رہی تھی۔

بشیر حسین صاحب تشریف لے آئے۔ جن کا تھوڑے
ہی دن ہوتے مجھ سے باقاعدہ تعارف ہو گیا تھا۔ انہوں نے
میری حالت کو سمجھ کر کہا۔ "اگر انہیں تماشا گاہوں سے اسقدر
نفرت ہے۔ تو رہنے دیجئے۔ آج زہرہ کے ہاں، اسکی سالگرہ
کی تقریب میں جلسہ ہے۔ میرے ایک دوست جن کو خاص
طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ آج غیر متوقع طور پر علیل ہو گئے ہیں۔
مَیں ان کی جگہ ان کو لیجا سکتا ہوں"۔

مَیں نے بلا سوچے سمجھے وہاں جانے کی آمادگی ظاہر کر دی
کہ بلا سے کچھ بھی ہو۔ ایک طرف سے تو چھٹکارا ملے گا۔
جب سب نے میری رغبت کو غیر معمولی طور پر جلسہ کی طرف
منعطف پایا۔ تو وہ بھی راضی ہو گئے۔ اور مجھے بشیر حسین
کے سپرد کر کے خود تماشے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

راہ میں بشیر حسین صاحب نے صاحب خانہ کی تعریف
میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دِئے۔ اگرچہ مَیں نے ان
کی باتوں کو چنداں توجہ سے نہیں سُنا۔ اس کا مفہوم یہ تھا
کہ زہرہ ایک مرحوم بیرسٹر کی لڑکی ہے۔ جو اس کے لئے کئی
لاکھ کی گرانقدر جائیداد چھوڑ گیا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت
مغربی قواعد کے زیرِ سایہ ہوئی ہے۔ وہ مخصوص امتیاز، جو
ہندوستانی عورتوں اور شیریں ادایانِ فرنگ کے درمیان
پایا جاتا ہے۔ یہاں کالعدم ہے۔ یعنی زہرہ اپنے حسن عالم افروز
کو اربابِ اشتیاق کی نظروں سے چھپا کر فطرت کے بیش بہا
عطیے کا غلط استعمال نہیں کرتی۔ اس بات پر مَیں نے بھی
کان کھڑے کئے۔ کہ اب ہمارے ہاں بھی وہ رسوم و رواج
عام ہوتے جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے شعلہ بہ پیراہن اقوام
بدنام ہیں۔ اس بات کے سُننے کے بعد مَیں نے بھی انکی

طرف زیادہ توجہ کرنی شروع کی۔ اور اُنہوں نے اس غیر متوقع طرزِ عمل سے فایدہ اُٹھا کر میرے سامنے زہرہ کے حسنِ اخلاق' وسعتِ مطالعہ' بالغ نظری اور خوبصورتی کی خوب چٹخارے لے لے کر تعریف کی'۔

اگر نادیدہ اشتیاق اسی چیز کا نام ہے۔ کہ متصورشے کا بہت بیتابی سے انتظار کیا جائے۔ تو مَیں زہرہ کا نادیدہ مشتاق ہو چلا تھا۔

خیر جوں توں کر کے راستہ طے ہُوا۔ اور ہم زہرہ کے مکان پر پہنچے۔ نہایت عظیم الشان مکان تھا۔ دروازے پر ہزار ہا بجلی کے لمپ آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے کے علاوہ اس بات کے بھی مدعی تھے۔ کہ آج کوئی غیر معمولی تقریب ہے۔ ہم ایک وسیع صحن سے گذر کر ایک اس سے بھی وسیع ہال میں پہنچے۔ اور وہاں کے نظارے کو دیکھ کر مَیں ششدر سا ہو گیا۔ مہمان اسقدر تھے۔ کہ ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ ہر طرف عیش و طرب کا دور دورہ تھا۔ زمین پر سنگ مرمر کا فرش تھا۔ جس پر ایرانی غالیچے بچھائے گئے تھے۔ ایک طرف سازندے اور اربابِ نشاط اپنی خوش گپیوں سے تمام محفل کو محظوظ کر رہے تھے۔ ایک طرف چند ریشمی پردے' اور ان کے پیچھے سے سریلی جھنکاریں مترنم اور لوچدار قہقہے صنفِ نازک کے اجتماع کا پتہ دے رہے تھے۔ کمرے کے سرے پر صاحبِ خانہ کھڑی تھی۔

اُف' تین سال کے بعد اب بھی وہ سیمیائی نظارہ میری آنکھوں میں پھر تا دکھائی دیتا ہے۔ جب مَیں گرد و پیش کی جاذبِ نظر دلچسپیوں سے بالکل بے خبر ہو کر صرف زہرہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ ایک امیرانہ' مگر سادہ اور خوش وضع فراک پہنے تھی۔ چوڑا طولانی کمر بند' اُبھرے ہوئے سینے کو سنبھال رہا تھا۔ کچھ سنہری مایل لمبے لمبے سیاہ اور خم در خم بال' سُنہری موباف سے بندھے ہوتے تھے۔ اس کی نرگسی آنکھوں کی پتلیوں میں گویا سادگی اور دوشیزگی رقص کر رہی تھی۔ اس کا کھلتا ہُوا کندنی رنگ بجلی کی تیز روشنی میں' سُرخ بھبوکا دکھائی دے رہا تھا۔ سُرخ شاداب ہونٹوں پر ایک نیم تبسّم تھا۔ جو مہمانوں کو "خوش آمدید" کہنے کے علاوہ دندانِ آبدار کی ایک جھلک بھی دکھا رہا تھا۔ اس کا متناسب الاعضا اور گداز جسم' جوانی کی رنگینیوں سے معمور گویا ایک پیکرِ نور معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ایک خوشگوار بیہوشی میرے دماغ پر مسلط ہو چکی تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا مَیں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ اور وہاں کی ہر ایک سے ایک وہمی تصویر کی مانند ہے۔ کہ جو چھونے کے لئے نہیں۔ بلکہ صرف دیکھنے کے لئے خلق کی گئی ہے۔

اتنا یاد ہے کہ اسی حالت میں مجھے کسی نے اس

پیکرِ حُسن اس شعلۂ نور کے آگے کھڑا کر دیا ہے۔ اور پھر اس کی سریلی آواز مجھے یہ کہتے ہوئے سُنائی دی ہے کہ

"میں آپ سے مل کے بہت خوش ہوئی۔ امید ہے کہ آپ آیندہ بھی گاہ گاہ غریب خانہ کو رونق بخشینگے"۔

.. ..

اس کے بعد میں نے وہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ اور وہ تمام شبہات جو اس کی بے پردگی کی وجہ سے میرے دل میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ صرف ایک ہی ملاقات میں زایل ہو گئے۔ اس کی خلوص آمیز سادگی، اور باحیا بے تکلفی نے مجھے بہت جلد اپنا گرویدہ کر لیا۔ اور یہ حالت کچھ میرے لئے ہی خاص نہ تھی۔ بلکہ ہر ایک شخص، جسے اپنی عمر میں کبھی زہرہ سے سابقہ پڑا ہے۔ متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکا۔ زہرہ کی یہ اثر آفرینی اسی طرح بے لوث اور پاک وصاف تھی۔ جس طرح ایک معصوم بچے کا دل ہر ایک طرح کے گرد وغبار سے مخلیٰ ہوتا ہے۔ مجھے اس کی موجودگی میں باوصف ہنگامۂ جذبات اتنی جُرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ اس کے سامنے عشق ومحبّت کا تذکرہ تک بھی چھیڑ سکوں اگرچہ وہ مجھ سے اس بے تکلفی سے ملتی تھی جو قواعد مغربی کی معاشرتی اور تمدنی تربیت پیدا کر دیتی ہے پھر بھی مجھے اتنا مقدور نہ ہوا۔ کہ اپنی دوستی کے نقاب کو ایک لمحے کے لئے بھی اُٹھا کے اسے حقیقت کی ایک جھلک دکھا دوں۔

میں اب شام کی سیر کا وقت وہیں گذارتا تھا۔ اور یہ دو تین گھنٹے مجھے اسقدر مختصر معلوم ہوتے تھے کہ خدا کی پناہ اس اثنا میں ہر ایک بحث پر گفتگو ہُوا کرتی تھی۔ اور میں نے اس بات کو تعجب سے دیکھا۔ کہ معمولی علوم کے علاوہ وہ سیاسیات اور ادبیات میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔ اور جب کبھی مذکورہ بالا موضوعات پر گفتگو چھڑ ی ہے۔ تو بحیثیت مجموعی اس نے میری واقفیت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کیا ہے۔

ایک دن شام کے وقت جب میں ذرا دیر میں پہنچا۔ تو مجھے اطلاع ملی۔ کہ زہرہ میرا انتظار کر کے ابھی ابھی نہانے گئی ہے۔ میں کمرہ ملاقات میں بیٹھ گیا۔ اور مجھے بے اختیار غالب کا شعر یاد آیا۔

نفس نہ انجمن ارزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

ابھی میں اس شعر کا مزا ہی دل میں لے رہا تھا کہ زہرہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس بات کا فوری اثر جو مجھ پر ہُوا۔ وہ یہ تھا۔ کہ میرا دل بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے کلیجے سے لپٹا لوں۔ مگر میں نے بمشکل ضبط کیا اور سنجیدہ آواز میں کہا "مجھے افسوس ہے۔ کہ آج میں نے آپ کو زحمتِ انتظار دی"۔

زہرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور مُسکرا کے میرے قریب

بیٹھ گئی۔ اس دن اس نے بالکل سفید لباس پہنا تھا۔ سیاہ لمبے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے رُخسار پر گر رہے تھے۔ گویا گلاب کے پھُولوں پر شبنم گر رہی تھی۔ اپنے نازک ہاتھوں کی اُنگلیوں سے اُس نے بالوں کو جھٹک کے پیچھے پھینک دِیا۔ اور چائے کی پیالی میرے آگے سرکا دی۔ مَیں نے پیالی کو لینا چاہا۔ مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مَیں نے پیالی اُٹھائی۔ اور پھر میز پر رکھدی۔ زہرہ نے میری ان بے سرو پا حرکات کو دیکھ کر کہا۔ "کیوں کیا بات ہے۔ آپ کچھ افسردہ سے نظر آتے ہیں"۔

مَیں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ "نہیں تو، کل رات ذرا دردِ سر ہو گیا تھا۔ شاید اُسی کا اضمحلال باقی ہے"۔

زہرہ نے متفکرانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ مگر گفتگو کو بدل دیا۔ آدھ گھنٹہ مختلف مسائل پر بحث ہوتی رہی۔ یکایک نامعلوم طریقے سے گفتگو میں مردوں کا ذکر آگیا۔ زہرہ نے مُسکرا کر کہا۔ " مرد عموماً سنگدل ہُوا کرتے ہیں ان کی فطرت کا اقتضا ہی یہی ہے۔

مَیں نے جواب دیا۔ "یہ تو آپ ایک اہم مسئلے کا اس قدر جلد فیصلہ کر رہی ہیں۔ صنفِ نازک کی طرف سے جو الزام سنگدلی مردوں پر عاید کیا جاتا ہے۔ وہ بالکل غلط ٹھیرا۔ کہ انسان ان خصائل کو جو فطرت کی طرف سے ودیعت کئے گئے ہیں۔ ہرگز بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

زہرہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "بہت ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر یہ تو مسلمہ امر ہے۔ کہ مرد اپنی قساوت کا اظہار کرنے کے لئے اس لئے مجبور ہیں۔ کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے"۔

مَیں نے اپنا اعتبار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کیسے"۔

زہرہ نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "آپ کی جنس میں سے جتنے افراد سے مجھے سابقہ پڑا ہے آپ ہی صرف ایک ایسے شخص ہیں۔ جس نے اپنی 'دوستی' کو ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنے سے تباہ نہ کر دیا ہو"۔

وہ کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ گئی۔ مگر مَیں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو اس کے رُخسار شرم سے تمتما رہے تھے۔ مَیں سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میرا دِل بانسوں اُچھلنے لگا۔ کیا یہ مجھے جُرأت دلائی جا رہی ہے؟ یا عام گفتگو میں اس کی زبان سے یہ فقرہ بھی معمولی طور پر نکل گیا تھا؟ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ مگر مَیں کیا کر سکتا تھا۔ اس فقرے کا جواب دینے کی مجھ میں تو جُرأت نہ تھی۔

عین اُس وقت زہرہ نے ظروف اُٹھانے کے لئے اپنی پیش خدمت کو آواز دی۔ میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور گفتگو، پھر اُنہیں سیاسیات، ادبیات اور خُدا جانے، کیا کیا، واہیات کے دائرے میں آگئی۔

زہرہ کے ہاں ایک شخص حیات خاں بھی آیا کرتا تھا کسی فوج میں کپتان کے عہدے پر سرفراز تھا۔ نہایت خوشرو اور خوش وضع، فوجی وردی اُسے بہت ہی سجتی تھی سڈول بھرا ہُوا جسم تھا۔ بشرے سے ذکاوت اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ خصوصاً آنکھیں بہت ہی دلفریب تھیں اس سن و سال اور صورت و شکل پر اس کی متانت اور سنجیدگی دلوں میں کُھبی جاتی تھی۔ گویا اس میں کوئی مقناطیسی جذب تھا۔ جسے آنکھ اُٹھا کے دیکھا مسخر ہو گیا۔ جس سے دو باتیں خوش مزاجی سے کر لیں۔ بندۂ بے دام بن گیا۔ وہ خاصکر مجھ سے بہت تپاک اور ہمدردی سے ملتا تھا۔ مگر معلوم نہیں کیا وجہ تھی۔ کہ مجھے اس کی تمام خوبیوں کے باوجود، اس سے ایک قسم کا تنفر محسوس ہوتا تھا۔ کبھی مَیں اس کی طرف غور سے دیکھتا۔ تو معلوم ہوتا تھا گویا خباثت اور خونخواری اس کی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ مَیں زہرہ کے گھر بلا اطلاع جا پہنچا۔ رات کے نو بجے کا وقت ہو گا۔ آسمان پر ستارے چھٹکے ہُوتے تھے۔ اور مَیں ہشاش بشاش چلا جا رہا تھا مجھے کیا خبر تھی۔ کہ اس دن مجھے اپنی زندگی کا سخت ترین صدمہ برداشت کرنا پڑیگا۔

صحن سے گذر کر زہرہ کے کمرے کے سامنے پہنچا تو ایک مردانہ آواز سُنائی دی۔ مَیں ٹھٹک گیا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھایا۔ تو آواز آشنا سی معلوم ہوئی۔ غور سے سُنا۔ تو کپتان صاحب کی آواز تھی۔ اس وقت تمام اخلاق کے نام نہاد خیالات پر پانی پھر گیا۔ میری جسمانی اور ذہنی قوتیں، جذبات کے زیر اثر مختل ہو گئیں۔ مَیں نے اپنے آپ کو بہت روکا۔ مگر نہ ہو سکا۔ مَیں نے برامدے کی کھڑکی کو آہستہ سے کھولا۔ اور پردہ اُٹھا کے اندر جھانکا۔

زہرہ ایک ارغوانی پوشاک میں ملبوس کپتان صاحب کے قریب بیٹھی تھی۔ اور وہ زہرا سے کہہ رہا تھا۔ "...

... عورت کا یہ فرض نہیں کہ حجابات کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے۔ اپنی نسوانیت کو بھی بالائے طاق رکھ دے زہد خشک کی زنجیریں عورت کے حنائی پاؤں کے شایاں نہیں۔ عورت کے لئے تو یہی ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے حسن اور شباب کی لطافتوں کو کبھی صدمہ نہ پہنچائے۔ کوتاہ بین سمجھتے رہے ہیں۔ کہ مشاغل حسن و عشق سے عورت کا احتراز ہی عفت کی واحد نشانی ہے۔ حالانکہ واقعیت اس سے بالکل متضاد ہے ... "

مجھ سے اور زیادہ نہ سُنا گیا۔ مجھ پر گویا بجلی سی گر پڑی تھی۔ مَیں از سر تا پا سن ہو گیا۔ زہرہ کی نسبت دل میں رکیک سے شبہات پیدا ہونے لگے۔ مَیں اُلٹے قدموں

واپس ہو گیا۔ جس طرح راستہ طے ہوا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ میرے دل و دماغ بالکل بیکار ہو چکے تھے۔ قوت احساس فنا ہو گئی تھی۔ گھر پہنچا تو کچھ تکان سی محسوس ہوئی دوستوں نے لیٹ جانے کا مشورہ دیا۔ لیٹنے کی دیر تھی۔ کہ بخار ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اتنی شدت ہو گئی۔ کہ الامان، رات بھر سخت اضطراب میں کاٹی۔ صبح ہوئی۔ تو ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر تو میری زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ البتہ میری سخت جانی پورا ایک ہفتہ موت سے لڑتی رہی اور آخر غالب آئی۔

بستر سے اٹھا تو پہلی خبر جو میں نے سنی وہ یہ تھی۔ کہ زہرہ نے اپنے آپ کو ہوس کی قربان گاہ پر چڑھا دیا اور کپتان صاحب انگلستان چلے گئے۔ اس خبر کا جو اثر ہوا میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا لیکن دوسرے دن ہی میں نے زہرہ سے شادی کی درخواست کی۔ جو منظور کر لی گئی۔

. . . .

زہرہ اب لاہور میں ہے۔ وہ اسی طرح رعنائی اور زیبائی کا ایک عدیم المثال نمونہ ہے۔ ہاں وہ اب گرد و پیش کی دلچسپیوں سے بالکل بے نیاز ہو گئی ہے۔ وہ اپنی گذشتہ زندگی کو قطعاً فراموش کرنا چاہتی ہے۔ اور اپنے زعم میں کر بھی چکی ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اور ساتھ ہی مجھے بھی۔ دھوکا دینے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ میں ایک ایشیائی بیوی کے نقطہ نظر سے اس کے عادات و اطوار میں نکتہ چینی کی ذرا سی گنجایش بھی نہیں دیکھتا، وہ ان چیزوں میں بہ رغبت حصہ لیتی ہے۔ جو میرے لئے دلآویز ہیں۔ وہ میرا خیر مقدم مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کرتی ہے، مگر میں اس کے دل کی حالت سے اچھی طرح واقف ہوں، اس نے کبھی اپنی گذشتہ زندگی کا ذکر کنایتاً بھی نہیں کیا، اور پھر بھی وہ اس کی یاد میں گھلی جاتی ہے۔ کسی محبوب شے کو یاد رکھنے کا بہترین طریق یہ ہے۔ کہ اس کو فراموش کرنے کی کوشش کی جائے۔ زہرہ کا جسم افسردہ نہیں ہوا اس کی روح افسردہ ہو گئی ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے اس سے بدتر تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کہ روح کی افسردگی انحطاط شباب سے عبارت ہے اور انحطاط شباب نسوانیت کی موت ہے۔"

سید عابد علی عابد

رشحات شاد

لکھا برگ گل پر بخط جلی ہے
خوشا وقت اس کا جواب تک کلی ہے

شب ہجر کی سخت گیری نہ پوچھو
جو ٹلیں ہیں جانیں تو کاہ ٹلی ہے

اجل توڑا کر نہ امید پیری
لڑکپن سے دامن میں اپنے پلی ہے

بسیرا ہے ہم نغمہ سنجوں کا جس پر
وہی شاخ سب کی نظر میں بھلی ہے

کرے ترک جو وصل کی آرزو کو
وہ ہم عاشقوں کے جتھے میں ولی ہے

نشیمن کرے شاخ گل پر نہ بلبل
کسی کو نہ یہ شاخ اب تک پھلی ہے

محمدؐ ہیں سرتاج سب انبیا کے
محمدؐ کا اے شادؔ نائب علی ہے

میر علی محمد شاد عظیم آبادی

ہماری سیر

لوگ ہنستے ہیں چھپاتے ہیں
شام کو سیر سے جب آتے ہیں

لیمپ کی روشنی میں یاروں کو
داستانیں نئی سناتے ہیں

ہم پلٹتے ہیں جب گلستاں سے
آہیں بھرتے ہیں تھرتھراتے ہیں

میز پر سر سے پھینک کر ٹوپی
ایک کرسی پہ لیٹ جاتے ہیں

آپ سمجھے؟ یہ ماجرا کیا ہے
سنئے ہم آپ کو سناتے ہیں

.. لگاتے ہیں صرف چکر ہی
ہم مناظر سے دل لگاتے ہیں

وہ نظر ڈالتے ہیں لہروں پر
اور ہم تہ میں ڈوب جاتے ہیں

گھر پلٹتے ہیں وہ 'ہوا' کھا کر
اور ہم 'زخم' کھا کے آتے ہیں

جوش ملیح آبادی

لیلےٰ [illegible]

یا

محاصرۂ غرناطہ

مُصنّفہ لارڈ لٹن

فصل پنجم (۵)

مترجمہ سیّد امتیاز علی تاج

یہودی

گذشتہ سے پیوستہ

کمرے سے نکلکر یہودی ایک کشادہ زینے پر سے نیچے اُترا۔ اور وہاں ایک ضعیف شخص سے دوچار ہُوا۔ جس نے ریشم اور سمور کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ اور بظاہر اسقدر دورسیدہ۔ ناتوان اور نیم جان معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے پژمردہ چہرے کی جھریوں پر زندگی موت کی پیشقدمی سے مغلوب نظر آتی تھی۔

اسرائیلی نے کہا۔ "زیمن! میرے وفادار عزیز خادم میرے پیچھے پیچھے غار کی جانب آ۔" یہ کہکر اور زیمن کے جواب کے انتظار کے بغیر وہ تیز قدمی سے صحنوں اور گلیوں میں سے ہوتا ہُوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہانتک کہ وہ ایک تنگ و تاریک سیلے ہُوئے چور راستے میں پہنچا جو کسی چٹان میں سے کاٹ کر نکالا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دہانوں پر لوہے کی سلاخوں کا ایک اسقدر بھاری جنگلہ تھا۔ کہ ایک سو آدمیوں کی متفقہ قوت بھی اس کی چول کو نہ ہلا سکتی۔ لیکن جوں ہی یہودی نے ایک کمانی کو دبایا۔ دروازہ کھُلا اور وہ اندر داخل ہُوا۔ ایک طاق پر سے پیتل کا ایک چراغ اُٹھالیا۔ اور بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ یہانتک کہ ضعیف شخص ہلکے ہلکے وہاں تک پہنچا۔ پھر اُس نے آہنی دروازہ بند کر دیا۔ اور اس کے بعد کافی فاصلے پر پیچیدہ راستوں میں سے گذرتا چلا گیا۔ حتےٰ کہ یکایک چٹان کے ایک ایسے حصّے کے قریب رُک گیا۔ جو باقی حصّے سے کسی صورت مختلف نہ معلوم ہوتا

تھا۔ دفعتاً اُس نے ایک جگہ ہاتھ لگایا۔ تو وہیں چٹان میں سے ایک دروازہ کُھل گیا۔ وہ دروازہ ایسی صنعت اور کاریگری سے بنا ہوا تھا۔ کہ اس کا اس طرح کُھل جانا بالکل جادو کا کھیل معلوم ہوتا تھا۔ جب چٹان کُھلی تو ایک دائرہ نما غار دکھائی دیا۔ جو پیتل کے چراغوں سے روشن تھا۔ اس میں پوستین کے بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ اور فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ چٹان کے ناتراشیدہ اور بظاہر قدرتی ستونوں پر مختلف قسم کے پُرانے اور عجیب ساخت کے اسلحہ آویزاں تھے۔ بڑے بڑے طاقوں میں پرانی قلمی کتابیں دھری تھیں۔ جو آہنی جلدوں میں بند تھیں۔ علاوہ بریں نرالی قسم کے بھدّے بھدّے آلات اور کلیں بھی بکثرت پڑی ہوئی تھیں۔ جو آجکل کے سائنسدانوں کی نظر میں ایجادات کیمیائی کے آلات قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اور ان سب چیزوں نے اس وحشت کدہ کو جادو گھر اور طلسم گاہ بنا رکھا تھا۔

یہودی سمور کی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ اور جب ضعیف شخص نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کو بند کیا تو بولا۔" زیمن! شراب کا ایک پیالہ بھر دے۔ کہ یہی اصلی رفیق غمگسار ہے۔ اور مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔"

زیمن نے غار کے ایک کونے میں سے شیشہ وساغر نکال کر دیگا کی چمکتی ہوئی انگوری شراب کا ایک پیالہ بھر کے دیا۔ جس نے اس کے خون میں حیات تازہ کی حرارت اور جوش پیدا کر دیا۔

آخری گھونٹ پی چکنے کے بعد اُس نے ایک لمبا سانس لیکر کہا۔"بڈھے اپنے لئے بھی شراب کا ایک پیالہ بھر اور پیتا جا۔ یہاں تک کہ تیری رگوں میں جوانی کا خون موجیں مارنے لگے۔"

زیمن نے حکم کی تعمیل کی لیکن کچھ یونہی سی شراب ہونٹوں کو لگائی۔ اور پیالہ پرے کو رکھ دیا۔

اسرائیلی نے سلسلہ کلام شروع کیا۔"زیمن! جب سے تو نے اس شہر میں قدم رکھا۔ بتا کہ ہماری قوم کے کتنے افراد موری بادشاہوں کی حرص وطمع کی نذر ہو چکے ہیں؟"

تین ہزار۔ وزیر یوسف کے حکم سے گذشتہ موسم سرما میں یہ تعداد مکمل کر دی گئی تھی۔ اور نصرانی کتّوں کے ہنکانے کے لئے ان کے زرومال سے تبر و شمشیر تیار کئے گئے تھے۔"

تین ہزار۔ بس صرف تین ہزار۔ کاش یہ تعداد سہ چند ہوتی۔ کیونکہ اب سود لینے کا وقت آ رہا ہے۔"

بُوڑھے آدمی نے کہا۔"میرا بھائی بیٹا اور پوتا بھی ان ہی شہیدوں میں تھے۔" یہ کہتے ہوئے بڈھے کے چہرے پر اور بھی مُردنی چھا گئی۔

" ان کے مقبرے ظالموں کی نعشوں کے ڈھیر سے بنیں گے۔ کم ازکم وہ انتقام لینے میں قوم یہود کو بخیل قرار نہ دیں گے۔"

" لیکن اے درماندہ قوم کے عالی مرتبہ سردار! مجھے معاف کرنا۔ کیا تیرا یہ خیال ہے۔ کہ عرب کے بے دینوں کی نسبت مغرور و سرکش نصرانی ہماری تباہی میں کمی کریں گے؟"

یہودی نے جواب دیا۔ " حقیقت میں دونوں ملعون ہیں۔ لیکن ایک کے وعدے دوسرے کی نسبت زیادہ صادق ہیں۔ میں فرڈیننڈ اور اس کی مغرور ملکہ سے مل چکا ہوں۔ اور انہوں نے ہمیں وہ حقوق حریت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جو اس سے پیشتر ہمیں یورپ میں کبھی نصیب نہیں ہوئے۔"

" وہ ہماری آمدورفت۔ ہمارے منافع اور ہمارے زروجواہر سے تو تعرض نہ کریں گے؟"

اسرائیلی نے زمین پر پاؤں مار کر کہا۔ " تجھ پر خدا کی مار۔ کاش سارے جہان کا سونا جہنم کی کبھی نہ بجھنے والی آگ میں جھونک دیا جائے۔ یہ زر پرستی کا سفیہانہ اور مصیبت ناک جذام ہی ہے۔ جو ہماری قوم کے دل اور روح نہیں۔ بلکہ انسانی صورت تک کو مسخ کر رہا ہے۔ اکثر اوقات جب میں آل سلیمان و یوشع کے شاہانہ خط و خال کو دیکھتا ہوں (وہ خط و خال جو ممالک مشرق کے شرفا کی نجابت کا نشان بنکر انہیں شاہنشاہی و حکمرانی کے فطرتی حقوق عطا کرتے ہیں) کہ ذلیل دُنیاوی تفکرات سے اُن پر جھریاں پڑگئی ہیں۔ اور چہرے مسخ ہوگئے ہیں جب میں ایک تنومند اسرائیلی کو ریشم اور روغنوں کے ایک ادنیٰ سوداگر کے سامنے حشرات الارض کی طرح عجز و انکسار سے رینگتا ہُوا دیکھتا ہوں۔ اور جب کبھی ایسی آواز میرے کانوں میں آتی ہے۔ جو میدان کارزار میں گونجنے کی بجائے بیم ورجا کے باعث مدھم و خاموش پڑ گئی ہو۔ تو میں اپنے دل سے پوچھا کرتا ہوں۔ کہ کیا میں حقیقت میں بنی اسرائیل کی نسل سے ہوں۔ اور خداوند یہووَہ کا ہزار ہزار شکر بجالاتا ہوں۔ کہ اُس نے کم ازکم مجھے اس مسکنت سے محفوظ رکھا ہے۔ جس کے باعث میرے برادران قوم پر سود خواری اور غلامی کی بجلی گری ہے۔"

زمین نے مصلحتاً اس جوشیلی تقریر کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ نہ تو اسے اس سے تعلق تھا۔ اور نہ وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک مختصر خاموشی کے بعد گفتگو کا رُخ دوسری جانب بدل لیا۔

تو حضور نے یہ ارادہ کر لیا ہے۔ کہ نصرانیوں کی عہد شکنی سے کچھ اندیشہ نہ کیا جائے۔ اور موروں سے انتقام

لیا جائے؟

ہاں۔ انسانی لہو کے بخارات آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔ اور گرجنے والے بادلوں کی مانند جمع ہو کر اس فنا ہو جانے والے ناپاک شہر پر گھر آئے ہیں۔ اور زمین! اب میرے لئے ان موروں سے نفرت کرنے کا ایک اور باعث بھی پیدا ہو گیا ہے۔ جس پھول کو میں نے حفاظت اور محنت سے پالا گلچین اُسے میرے باغ میں سے توڑ لے جانے کی فکر میں ہے۔ زمین! تو نے لیلےٰ کی حفاظت اچھی طرح نہیں کی۔ اور اگر تو خود اپنی کینہ توزی اور بدکاری کی وجہ سے میرا منظور نہ ہوتا۔ تو طلوع آفتاب سے پہلے تیرا سر دھڑ سے جُدا ہو کر ڈارو ندی میں بہتا نظر آتا۔

زمین نے جواب دیا۔ "میرے مالک اگر تو خود کہ ہم سب میں سے دانا ہے۔ ایک دوشیزہ کو محبت سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ تو تُو ایک مصیبت زدہ ضعیف کی دھندلی آنکھوں اور مختل حواس کو کیسے مجرم قرار دیتا ہے؟"

اسرائیلی نے کچھ جواب نہ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے بڈھے کا یہ ملامت آمیز جواب سنا ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالات میں مستغرق رہا۔ اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "ایسا ہونا ضروری ہے گو قربانی بہت مشکل اور خطرہ عظیم ہے۔ مگر اس موقع پر اور بھی ضروری ہے لیکن یہ ضرور ہو گا۔ (اس کے بعد بآواز بلند کہنا شروع کر دیا) زمین کیا تجھے کامل یقین ہے۔ کہ میرے اپنے ہموطن اور میرے اپنے ہمقوم بھی مجھے اپنوں میں سے نہیں سمجھتے؟ اگر میری قابلِ نفرین اصل و نسل اور مذہب کا اعلان کر دیا جائے۔ تو غدار ہونے کی حیثیت سے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے جائیں۔ اور قبالہ کی تمام چالیں بھی میری جان کو نہ بچا سکیں۔"

میرے آقا! تو کچھ شک نہ کر۔ تیرے وفادار زمین کے سوا تمام غرناطہ کا کوئی متنفس تیرے راز سے آگاہ نہیں۔"

"تو مجھے اسی خواب و خیال اور امیدوں میں محو رہنے دے۔ لیکن اب کام کرنا چاہئے۔ کہ یہ رات دماغ سوزی اور دیدہ ریزی میں صرف ہونی ہے۔"

یہودی نے چند عجیب آلات جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اپنے سامنے رکھ لئے۔ اور حجرہ کے طاقوں میں سے کئی قلمی مسودے نکالے۔ بوڑھا اس کے قدموں میں اس کے احکام کی تعمیل کے لئے منتظر بیٹھا تھا۔ بظاہر ایک جسم بے روح کی طرح ساکن و جامد تھا۔ اور اس کے چہرے کی مُردنی اور اس کا سکڑا ہوا بدن موت کی تصویر پیش نظر کر رہا تھا۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی غار کے اندر ایک ساحر اپنے طلسمی شعبدوں میں مشغول

ہے۔ اور کسی ضعیف شخص کی نعش اس کی فسوں سازی اور احکام ساحرانہ کی تعمیل کے لئے قبر میں سے نکل آئی ہے۔

مذکرہ بالا تذکرے سے ناظرین پر روشن ہو گیا ہوگا کہ وہ یہودی (جو ظاہر ہے کہ المامن الحمرا ہے) اپنی قوم کا کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس کا حسب و نسب اسکی پُراسرار قوم کی گذشتہ تاریخ میں پوشیدہ تھا۔ جو اپنے زمانۂ عروج میں اس قدر متمول تھی۔ کہ قوم گاتھ کے شاہوں کا تمول ان کے مقابل میں افلاس معلوم ہوتا تھا۔ اس عجیب شخص کی جوانی۔ سوداگری اور خرید و فروخت میں نہیں۔ بلکہ سیر و سیاحت اور مختلف علوم و فنون کی تحصیل میں صرف ہوئی تھی۔

اس کا بچپن غرناطہ میں گذرا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو شاہ سابق مولائے ابوالحسن کے ہاتھوں قتل ہوتا دیکھا تھا۔ جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ وہ بیحد مالدار تھا۔ اور محض اس شک پر کہ کہیں جواہرات نگل نہ گیا ہو۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا۔ باپ کی روح فرسا موت کا نظارہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور بچپن ہی میں انتقام کی قسم کھائی تھی۔ ایک دور کا رشتہ دار اسے دور دراز مقامات پر لے گیا۔ جو ظلم و ستم سے محفوظ تھے۔ اور جس طرح سے یہودی اپنی دولت مختلف شہروں میں منتشر کر کے چھپا دیتے ہیں۔ اسی طرح اس عزیز نے المامن کے باپ کی بیشمار دولت غرناطہ کے غاصب فرمانروا کی دست برد سے بچالی۔ جو آخر کار المامن کے ہاتھ آگئی تھی۔

اس نے اس وقت کی دریافت شدہ دُنیا کا بہت سا حصّہ دیکھ لیا تھا۔ اور کئی برس تک مصر کے دربار شاہی میں بھی رہا تھا۔ جہاں عملیات سحر و نجوم وغیرہ کا خاص چرچا رہا کرتا تھا۔ اس دلفریب اور خیالی تحقیقات میں جو وقت اُس نے صرف کیا۔ وہ رائگاں نہیں گیا۔ بلکہ بہت سے ایسے اسرار اس پر روشن ہو گئے تھے۔ جو اب شاید دُنیا کے واسطے ہمیشہ کے لئے خزانہ سربمہر ہیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں۔ کہ المامن نے اس علم کو حاصل کیا تھا۔ جسے روایت اور باطل پرستی ہمارے مذہب میں ساحری کے نام سے پکارتی ہے۔ نہ عناصر اسکے تابع تھے۔ اور نہ وہ مستقبل کا نقاب چاک کر سکتا تھا نہ ایک لفظ سے افواج کو منتشر کر سکتا تھا۔ نہ کوئی افسون پڑھکر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا تھا۔ لیکن وُہ اشخاص جنہوں نے جُہلا کو متحیر اور مرعوب کرنے والی باتوں کی اختراع میں عمریں گذار دیں۔ وہ چند ایسے اسرار کا انکشاف کئے بغیر نہ رہے۔ جنہیں عہد حاضر کے دانشمند نہ تو حل کر سکتے ہیں۔ نہ ان کی نشاۃ الثانیہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس قسم کے اکثر ہنر خود بخود حاصل ہوتے تھے۔

(ان کی ایجاد اکثر کسی اتفاقی کیمیائی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے) ان کے مخترع نہ ان کی تشریح کر سکتے تھے۔ اور نہ اپنے پیدا کئے ہوئے مظاہر کی وجہ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی اپنی شعبدہ بازیوں کی عظمت ان کو دھوکا دیتی تھی۔ اور انہیں اکثر اس امر کا یقین ہو جاتا تھا۔ کہ وہ قانون قدرت پر حاوی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اس کے گمراہ اور پریشان خیال پیرو تھے۔ اس خوفناک غار کا رہنے والا محقق بھی اسی قبیل سے تھا۔ اور اپنی ہی عقل پریشان اور رفیع الشان و پُرجوش گرمیٔ اندیشہ سے کسقدر دھوکہ کھاتے ہُوتے تھا۔ اس کی پرتمکنت خود بینی اسے مخمور کردیتی تھی۔ اگر یہ بات تاریخ کی رُو سے صحیح ہے کہ ازمنہ قدیمہ کے بادشاہ خود اپنی قوت پر نازاں ہوکر اپنے آپ کو اور انسانوں سے بہتر اور بالا سمجھنے لگتے تھے۔ تو یہ کہنا بھی کچھ ناواجب نہیں۔ کہ حکما، جو بادشاہوں سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ویسی ہی دیوانگی یا شاندار آشفتگیٔ خیال میں مبتلا ہوکر یہ سمجھنے لگے۔ کہ عوام کے اعتقادات نے انہیں جس عجیب و غریب عقل و حکمت اور عطیات الٰہی کا سرمایہ دار تصوّر کر رکھا ہے وہ فی الحقیقت ان میں موجود ہیں۔ اور عوام ان کی تعظیم و تکریم میں بالکل حق بجانب ہیں۔

لیکن اگرچہ المامن نے حسب و نسب کی گمنامی اسے خواہشات عالی کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کے قابل نہ قرار دیتی تھی۔ اسی خیال نے اس کے زبردست دماغ کو فکر و غور اور تحصیل علم کی جانب متوجہ کردیا تھا۔ لیکن فطرت کبھی اسقدر تیز مزاج شخص کو ایسے سکون و خاموشی اور تخیل کے مقاصد کے لئے موزوں نہیں ٹھیراتی۔ جس کے حصول کا وہ اسقدر مشتاق تھا۔ حکماء و انبیا کی تحریرات میں اس نے کوشش و کامرانی کے طریق تلاش کئے۔ اور چونکہ اس کے مذہب کو ہر مُلک اور ہر مذہب کے لوگ حقارت سے ٹھکراتے تھے۔ اور اُسے ہر طرف ظلم و ستم ہی نظر آتا تھا۔ اس لئے ہزیمت خوردہ انسان کی طرح اس کی اندرونی طاقتیں بھڑک اُٹھیں۔ اور وُہ عظیم الشان مگر بے بنیاد تجاویز سوچنے لگا۔ آخر وہ تجاویز تو ایک ایک کرکے دماغ سے نکل گئیں لیکن تاریک سنگدلی اور شدید انتقام کے جذبات باقی رہ گئے۔

اگر اس کے مذہب کو عروج و اقبال حاصل ہوتا تو شاید وہ دہریہ ہوتا لیکن ظلم و ستم اور جفاکشی نے اسے مجنون مذہبی بنادیا تھا۔

باینہمہ وہ اپنی قدیم قوم یہود کی خصوصیات پر قائم تھا۔ جو مسیح موعود کو محض جنگجو اور فرمانروا تصوّر کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ جو انہیں اپنی تمام امیدیں اور منصوبے دُنیاوی قوّت و فتوحات سے وابستہ کرنا

سکھاتی تھیں۔ المامن پابندی مذہب کی بجائے مادی ترقی کا زیادہ خواہشمند تھا۔ مذہبی عقائد کی اسے چنداں پروا نہ تھی۔ مذہب کے مسلمات پر کبھی اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ بلکہ مذہب کے دنیاوی تسلط کے خیالات میں شب و روز سرگرداں رہتا تھا۔

اس زمانے میں مور ہسپانیہ کے یہود پر عیسائیوں کی بہ نسبت زیادہ ظلم کیا کرتے تھے۔ ساحل کے ہسپانی شہروں میں اس تاجر قوم نے عیسائیوں سے خرید و فروخت کے وہ تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ جو افراد دو اقوام دونوں کے لئے مفید تھے۔ اور نہ صرف مذہبی معاملات میں ان سے رواداری کا برتاؤ ہوتا تھا۔ بلکہ جس بازار میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں ان میں باہمی مراسم دوستانہ قائم ہوگئے تھے۔ اور وہ اندھا دھند کور باطن تعصب ابھی تک ظاہر نہ ہوا تھا۔ جس نے بعد میں فرڈیننڈ اعظم کی شہرت پر داغ لگا دئے۔ اور محکمۂ احتساب کے دل دہلا دینے والے وحشیانہ مظالم کا آغاز کیا۔ اگر کبھی وہ اس کا مرتکب ہوتا بھی تھا۔ تو نام کو۔ لیکن موروں نے اس بدنصیب قوم کی بڑی تعداد پر انتہا درجے کی وحشت روا رکھی تھی۔ جب غرناطہ میں ابوعبداللہ کا تند خو باپ جسے شیر دل بادشاہ کہتے تھے۔ حکمران تھا۔ اس زمانے میں تو یہود درحقیقت انسانیت کے دائرے سے خارج کر دئے گئے تھے۔ اور حلیم الطبع اور وہی ابوعبداللہ کے عہد حکومت میں بھی وہ بلا رحم لوٹے جاتے تھے۔ اور اگر کسی پر زر و جواہر چھپا رکھنے کا شبہ ہوتا تھا۔ تو بلا تامل اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ ضروریات سلطنت کی وجہ سے نہایت بیدردی کے ساتھ ان پر جھوٹے الزامات لگائے جاتے تھے۔ ان کا ناقابلِ معافی گناہ صرف یہ تھا۔ کہ وہ دولتمند تھے۔

جب سے المامن کے کانوں میں اپنے باپ کے عالم نزع کی چیخیں گونجی تھیں۔ اس کے بعد اوّل مرتبہ وہ دفعتاً ان وحشیانہ مظالم کے درمیان غرناطہ واپس آگیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے دردناک مصائب کو دیکھا۔ اپنے عہدِ انتقام کو یاد کیا۔ اور اپنے ارادے کو مضبوط کر لیا۔ چونکہ اس نے اپنا نام بدل لیا تھا۔ اور اس کے عزیز مر چکے تھے۔ اس لئے اس پختہ عمر کے المامن کو کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ یہ وہی اسحٰق یہودی کا خوردسال بچہ ہے۔ اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ وہ اپنے مذہب کو چھپائے رکھے۔ چنانچہ وہ افریقہ کے تمام ممالک میں صاحب عظمت متبرک درویش اور دانشمند ساحر کے نام سے مشہور تھا۔

اس شہرت نے اسے غرناطہ کی مجلسوں اور درباروں میں معروف کر دیا۔ مولائے حسن کا محرم راز بنکر اس نے ابوعبداللہ اور ملکہ کے ساتھ بادشاہ کے خلاف سازش

کی۔اور اُس نے باپ کے قاتل سے انتقام لیا۔
ابو عبداللہ سے بھی اس کا کچھ رابطہ نہ تھا۔لیکن جو لوگ اس کے اپنے مذہب کے دائرے سے باہر تھے ان کی محبت و اُلفت کے لئے اس کا دل پتھر تھا۔بادشاہ کے اعتماد ابلہانہ کو وہ ایک صید مظلوم کی فریب خوردگی سمجھتا تھا۔
گویا ایک زہریلا سانپ تھا۔اس بات سے نڈر کہ ڈسنے سے پیشتر اس کے مکر و فریب کی کن غلاظتوں اور مکاری و دغا کی کن مکروہ ولولوں میں سے بل کھاتے ہوئے رستہ نکالنا پڑیگا۔قدرت نے اسے ذہانت عطا فرمائی تھی۔اور قوت واقعات و حالات کی ذلیل مجبوریوں نے اس کے غرور کو توڑ دیا تھا۔لیکن ان ہی مجبوریوں نے اسے عجز و انکسار سے مانوس بھی کر دیا۔ وہ سانپ کی طرح مٹی میں رینگتا تھا۔لیکن سانپ کی طرح وہ زہر سے بھرا ہوُا تھا۔ڈس سکتا تھا۔اور ہلاک کر سکتا تھا۔

قصور معاف

ہو تو جائے مرا قصور معاف
نہیں کرتا ترا غرور معاف

خواہش دید، اے معاذ اللہ
ہو چکا یہ گنہ ضرور معاف

نہیں جاتی کدورتِ خاطر
کر بھی دیں وہ اگر قصور معاف

زاہدا، یہ شراب ناجائز؟
اور شوقِ مئے طہور معاف

اُن کو پہلے تو چھیڑ بیٹھے ہم
پھر یہ کہنا پڑا "حضور معاف"

ہم کسی پر مٹیں، تمہیں کیا کام
جلوۂ طور و حسنِ حور، معاف!

مَیں وہ بیخود ہوں، جس کو ہے عابد
نشۂ بادہ و سرور معاف

جنونِ تحائف

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

اشخاص

(۱) جوگندر بابو (ایک خوبصورت نوجوان)
(۲) سوشیلا (ایک خوبصورت نوجوان عورت (جوگندر بابو کی منکوحہ)
(۳) دوارکی (خادمہ
(۴) دوکاندار نمبر۱
(۵) دوکاندار نمبر۲
(۶) چائے فروش
(۷) ایک مالک مکان
(۸) اس کی بیوی

ایکٹ اوّل سین اوّل

ہدایات:۔ ایک متوسط درجے کے مکان میں ایک خاصا سجا ہُوا ڈرائنگ روم ہے جس کے اندر ایک زینہ ہے جو اوپر کی منزل کو جاتا ہے۔ جوگندر بابو ایک آرام کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ سوشیلا زینہ پر سے اُتر کر جوگندر بابو کے پاس آتی ہے۔

سوشیلا (خوشی کے لہجہ میں) دیکھئے پوجا کے دِن قریب آ رہے ہیں۔

جوگندر بابو (چونک کر) ہاں۔ واقعی ایک مہینہ باقی رہ گیا ہے۔ تمہیں سب انتظام کرنا ہوگا۔ اور ہاں بتاؤ تو اماں جان کو پوجا کے موقع پر کیا بھیجیں۔

سوشیلا۔ ایک کشمیری شال بھیجدیں۔

جوگندر بابو۔ نہیں۔ مَیں ہر سال ایک چیز بھیجنا پسند نہیں کرتا۔ اب کے کوئی اور چیز بھیجنی چاہیئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک وقت دل چاہتا ہے۔ کہ کچھ بھی نہ بھیجوں۔ پھر خیال آتا ہے۔ کہ وہ سمجھیں گی کہ مَیں بدل گیا ہوں۔

سوشیلا۔ آپ مطلقاً فکر نہ کریں۔ مَیں سب کچھ سمجھ لونگی آج موسم کیا ہی اچھا ہے۔ کیا آپ کل کرکٹ کا میچ کھیلنے جائیں گے۔

جوگندر۔ ہاں ضرور جاؤنگا۔ مجھے دوستوں نے بنا کت

تاکید کی تھی۔ کہ ضرور آنا۔
سوشیلا۔ تو کیا وہی پرانا بوٹ پہنینگے۔ وہ تو بالکل خراب ہو گیا۔ اس کو کہیں پھینک دینا چاہیئے۔
جوگندر۔ وہ پرانے ہی اچھے ہیں۔ اور بہت آرام دہ ہیں۔ آج کچھ سردی زیادہ ہے۔ میرا گلا بند ہو رہا ہے۔
سوشیلا۔ مَیں نے کئی بار کہا ہے۔ کہ آپ گلوبند پہنا کریں اسی طرح کہیں دشمنوں کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔
جوگندر۔ وہ گم ہو گیا ہے۔
سوشیلا۔ تو نیا خریدنا چاہیئے۔
جوگندر (شرارت سے) یہ آج کیا بات ہے۔ مجھ پر نظر عنایت ہو رہی ہے۔ بوٹ اور گلوبند کے متعلق گفتگو پوجا کے دنوں میں خاص معنی رکھتی ہے۔
سوشیلا (ایک نازک ادا سے جوگندر کو گھورتے ہوئے) میرا مطلب ہے کہ مَیں آپ کو ——
جوگندر (بات کاٹ کر) تم بڑی اُستاد ہو۔ لیکن مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔ مَیں تحفہ تحائف کی رسم کو نہایت معیوب اور فضول سمجھتا ہوں۔ مَیں نے کئی مرتبہ پہلے بھی کہا ہے کہ یہ تمام رسومات بالکل لغو ہیں۔ ہم کو انہیں یک قلم موقوف کر دینا چاہیئے۔
سوشیلا (ذرا شوخی سے) تو کیا تم مجھے کوئی تحفہ نہیں دو گے۔
جوگندر۔ ضرور دونگا۔ لیکن صرف اس لئے کہ تم ایک سڑی عورت ہو۔ جسے ہر وقت رسومات کی پابندی میں دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال کرنا پڑتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی۔ کہ لوگ مجھے کیوں تحائف دیں۔ جن کی مجھے ضرورت نہیں۔ اور نہ میرے دوستوں کو میرے تحائف کی حاجت ہوتی ہے۔
سوشیلا۔ مَیں ان فلسفیانہ باتوں سے باز آئی۔ نہ تو مَیں انہیں سمجھ سکتی ہوں۔ اور نہ ہی سُننا چاہتی ہوں۔ سوال یہ ہے۔ کہ تمہیں آجکل دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ گلوبند اور کرکٹ بوٹ کی۔ اور مَیں ان میں سے کم از کم ایک تو ضرور تحفہ کے طور پر پیش کرونگی۔
جوگندر۔ پھر وہی ہٹ دھرمی۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو مَیں خرید لونگا۔ خدا کے فضل سے ہم میں استطاعت ہے۔ کہ جو چیز چاہیں خرید سکیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ تم مجھے بوٹ یا گلوبند تحفہ میں دو۔
سوشیلا۔ میری بھی ضد ہے۔ میری خواہش ہے کہ مَیں ضرور تمہیں کچھ پیشکش کروں۔ مجھے تم سے اُلفت ہے۔ اور مَیں اس کے ثبوت میں کچھ نشانی دینا چاہتی ہوں۔
جوگندر۔ یہ خوب محبّت ہے۔ تمہیں میرے لئے چیزیں خریدنے کی ضرورت نہیں۔ آخر بات تو ایک سی ہی ہے۔ اگر مَیں خریدوں یا تم خریدو۔ تم ان چیزوں کو میرے ہی روپے سے خریدو گی۔ مجھے کچھ ضرورت نہیں ہے۔

(جوگندر بابو جلدی سے جاتا ہے)

سوشیلا (اپنے آپ سے) یہ آجکل کے تعلیم یافتہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ کہ اپنے مُلک کی رسموں کو بھولتے جاتے ہیں۔ بلکہ جان بوجھ کر ان سے کنارہ کش ہوتے جاتے ہیں۔ ان کو اتنی سمجھ نہیں۔ کہ جو رسومات ہمارے بزرگ قائم کر گئے ان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہے۔ اب اسی تحفہ دینے کی رسم کو لو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جب کبھی تمہاری نظر ان چیزوں پر پڑتی ہے۔ تو تمہیں اس کا دینے والا یاد آجاتا ہے۔ اور محبت و اخلاص بڑھتا ہے۔ خیر چاہے کچھ ہو میں ان کو ضرور تحفہ دونگی لیکن میں روپیہ کہاں سے لاؤں۔ واقعی بات تو ایک ہی ہے۔ اگر میں خریدوں یا وہ خریدیں لیکن کسی چیز کا تحفہ کے طور پر دینا اور بات ہے۔ مجھے تو کوئی کسب بھی نہیں آتا۔ جس سے بارے کچھ روپیہ کما سکوں۔ سوائے نقاشی اور گانے کے میں کچھ نہیں جانتی۔

دوارکی (خادمہ) یہ خط ڈاک کے ذریعہ آیا ہے۔ اور ہاں آپ آج کچھ اُداس سی نظر آرہی ہیں۔

سوشیلا۔ نہیں تو۔ میں بہت خوش ہوں (خط کھولتی ہے) مکرم بندہ۔ ہم نے ایک ایجنسی کھولی ہے۔ جو کہ بیکاروں اور بے روزگاروں کے لئے بہت فائدہ مند ہے کیونکہ اس میں مختلف کام ہیں۔ اگر آپ کو ضرورت ہو۔ تو جو کام آپ کر سکتے ہوں۔ مندرجہ ذیل کے آگے نشان کر دیں۔ کیا آپ کھانا پکا سکتے ہیں۔ کیا آپ بچوں کی پرورش کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کو سینا آتا ہے۔ وغیرہ

سوشیلا (پھر اپنے آپ) اے کاش میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ اس دُنیا میں میرے پیدا ہونے سے کیا فائدہ تھا۔ لیکن ہاں میں نقاشی جانتی ہوں۔ میں کچھ تصویریں بنا کر بازار میں بیچونگی۔ کچھ نہ کچھ تو مل ہی رہیگا۔

سوشیلا ایک درجن تصاویر بناتی ہے۔ اور اس امید پر کہ پانچ چھ روپے تو مل ہی جائینگے۔ بازار جاتی ہے۔

سین دوم۔ بازار

سوشیلا (ایک دوکان پر جاکر) کیا آپ ان تصویروں کو خریدیں گے۔

دوکاندار۔ بیگم صاحبہ آپ تصاویر خریدیں گی؟ میرے پاس بہت بڑھیا تصویریں موجود ہیں۔

سوشیلا۔ نہیں مجھے ان تصویروں کو بیچنا ہے (تصویریں دکھاتی ہے)

دوکاندار (سرسری نظر سے دیکھ کر) یہ تصویریں تو بالکل ناقص ہیں۔ اگر میں ان کو خرید بھی لوں۔ تو انہیں خریدیگا کون۔ معاف کیجئے گا۔ میں انہیں نہیں خرید سکتا۔

ایک اور دوکاندار۔ کہیں بیگم صاحبہ کیا چاہئے۔

سوشیلا۔ مجھے یہ تصویریں بیچنی ہیں۔
دوکاندار نمبر ۲۔ میرے پاس اتنا انبار ہے۔ کہ مَیں انہیں نیلام کرنیوالا ہوں۔
سوشیلا تنگ آکر اور کچھ کھسیانی ہوکر گھر کا راستہ لیتی ہے۔ اور راستہ میں ایک اشتہار پڑھتی ہے "ایک ہفتہ میں دس روپے کما لو۔ جو شخص ہماری چار کے چالیس ڈبے ایک ہفتہ میں بکوا دیگا۔ اسے دس روپیہ ملیں گے۔"
سوشیلا (دل میں) یہ بہت آسان کام ہے میرے اتنے واقف ہیں۔ اور دوسرے ہمیں خود چاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ سے پہلے چالیس تو کیا اگر سو ڈبے بھی ہوں تو بک سکتے ہیں۔ لیکن پہلے تین چار ڈبے منگانے چاہئیں۔ راستے میں ہی تو دوکان ہے۔ اہا وہ سامنے دوکان ہے۔
سوشیلا۔ کیا وہ اشتہار آپ ہی کا ہے
دوکاندار۔ جی ہاں۔
سوشیلا۔ آپ مجھے چند ڈبے دیدیں۔ مَیں کوشش کرونگی کہ وہ بک جائیں۔
دوکاندار۔ بہت بہتر (چار ڈبے دیدیتا ہوں)
سوشیلا۔ تھوڑی دور جاکر ایک مکان پر دستک دیتی ہے دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک مرد باہر آتا ہے۔
مرد۔ تم کون ہو۔ اور کیا کام ہے۔
سوشیلا۔ کیا آپ کو چاء چاہیئے۔
مرد۔ نہیں (ذرا سوچکر کہ یہ عورت چاء بیچنے والی نہیں) ٹھیرو مَیں دریافت کرتا ہوں (پھر اندر چلا جاتا ہے)
ایک ادھیڑ عورت (باہر نکل کر) نوج کوئی ایسی ہو۔ شکل سے تو شریف زادی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لچھن خراب ہیں۔ لوگوں کے گھروں پر دستک دینا اور مردوں سے اس طرح بیباکانہ گفتگو۔ خبردار جو پھر یہاں آئی۔
(سوشیلا بھاگتی ہے۔ اور گھبراہٹ میں ایک ڈبہ وہیں پھینک آتی ہے)
سوشیلا (گھر پہنچ کر) یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ آخر مَیں کیا کروں۔ تصویریں بنائیں وہ کسی نے نہ لیں۔ چاء گم ہوگئی۔ اور نقصان اٹھایا۔ پوجا کے دن قریب آرہے ہیں۔ پرسوں سب کچھ تیار ہو جانا چاہیئے۔ لیکن یہاں ہنوز دلّی دور است۔ لیکن مَیں بھی ایک ضدی ہوں۔ آہا خوب! دآیا۔ مجھے گانا آتا ہے۔ باہر سڑکوں پر جاکر گاؤں گی۔ دیکھیں کچھ وصول ہوتا ہے یا نہیں (گھنٹی بجاتی ہے) دوارکی (حاضر ہوکر) فرمائیے آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ مَیں کئی دن سے دیکھ رہی ہوں۔ کہ آپ کسی گھبراہٹ میں مبتلا ہیں۔
سوشیلا۔ کیا تو اپنے کپڑے آج کے دن کے لئے مجھے دے سکتی ہے۔ مجھے ایک ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔
دوارکی۔ مَیں کس لائق ہوں۔ آخر یہ سب کچھ آپ کی چیزیں

کی خیرات ہے لیکن ایسی کیا ضرورت ہے۔

سوشیلا: مَیں ابھی نہیں بتا سکتی۔ جلدی سے ایک جوڑا اپنے کپڑوں کا لے آؤ۔ (وہ دار کی جاتی ہے اور کپڑے لے آتی ہے) سوشیلا جلدی سے لباس تبدیل کرتی ہے۔ اور اپنے چہرہ پر ایک قسم کا روغن مل لیتی ہے۔ تاکہ پہچانی نہ جا سکے۔

سوشیلا (بازار میں پہنچ کر اور اپنے آپ میں گانے کا حوصلہ نہ پاکر) اف! یہ تو بہت ہی مشکل کام ہے میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ اب کیا کروں۔ کوشش کرتی ہوں (گانے کے لئے منہ کھولتی ہے) لگو لگو (رک جاتی ہے پھر کوشش کرتی ہے) آخر ایک باغ میں جاتی ہے۔ اور گاتی ہے۔ پھر کچھ تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سو جاتی ہے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن (گھڑیال کی آواز) سوشیلا۔ ایں آٹھ بج گئے۔ معلوم ہوتا ہے مَیں سو گئی تھی۔ بہت دیر ہو گئی ہے اب مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہئے۔ ایں یہ کیا ہے۔ (اپنی مٹھی کو کھولتی ہے اور ایک پانچ روپیہ کا نوٹ پاتی ہے) خدایا تیرا ہزار ہزار شکر ہے۔ کہ تو نے مجھے کامیابی عطا فرمائی۔ اس سے کم از کم ایک چیز تو خریدی جا سکتی ہے (جلدی جلدی گھر کو روانہ ہوتی ہے۔

سین سوم۔ پوجا کا دِن

ہدایات:۔ وہی مکان جو سین اوّل میں ہے۔ کھانے کا کمرہ۔ میز کے پاس کرسی پر جوگندر بابو بیٹھا ہے۔ سوشیلا داخل ہوتی ہے۔ اور میز پر ایک پیکٹ پھینکتی ہے۔

جوگندر بابو۔ یہ کیا ہے۔

سوشیلا۔ کھول کر دیکھو۔

جوگندر (پیکٹ کو کھولتا ہے اور اس میں سے ایک خوبصورت مفلر نکالتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ کہاں سے آیا ہے۔ (پھر آویزاں کارڈ کو دیکھ کر) "پیارے شوہر کو پوجا کے تحفہ کی یاد میں اس کی چاہنے والی بیوی کی طرف سے۔ سوشیلا" پھر وہی بات مَیں نے جب منع کر دیا تھا۔ تو اتنی بے پروائی کیوں ہوتی ہے۔ آخر یہ بھی تو میرے روپے سے خریدا گیا ہوگا۔

سوشیلا۔ نہیں۔ بلکہ خالص اپنی کمائی سے (جوگندر کی طرف شوخی اور ایک خاص ادا سے دیکھ کر) دیکھو ناراض نہ ہونا۔ پہلے بات سن لو (اسے تمام قصہ سناتی ہے)

جوگندر (کچھ سوچ کر بے اختیار کھلکھلا کر ہنستا ہے) آہا! تو وہ ذات شریف آپ ہی تھیں۔ جو باغ میں ایک بنچ پر سوئی ہوئی تھی۔ کیا خوب کہ مَیں اس وقت معلوم نہ کر سکا۔

سوشیلا (گھبرا کر) آپ نے دیکھا تھا۔ کب کیسے اور کس طرح۔

جوگندر (ایک قہقہہ لگا کر) ہاں ہاں مَیں نے ان آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کہ ایک عورت نہایت مایوسی سے گا رہی تھی اور لوگ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوتے تھے۔ مَیں پہلے تو

پاس سے گذر گیا۔ اور جب دوبارہ اسی راستے سے گذرا۔ تو اسے بنچ پر سوتے دیکھا۔ میں نے نیکی کر اور دریا میں ڈال کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ اس کی مٹھی میں دھر دیا۔ اور خود اس کو جگائے بغیر وہاں سے چل دیا۔

سوشیلا (رونے لگتی ہے۔ اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر)...... اب میں کیا کروں۔ یہ تو ہر طرح آپکا روپیہ ہوا مجھے معلوم ہو جاتا تو میں کبھی نہ لیتی۔ بلکہ کوئی بہانہ بنا دیتی۔

جوگندر (ہنستے ہوئے) خیر میں ہار گیا۔ میں اس تحفہ کو قبول کرتا ہوں۔ لو اب رونا بس کرو۔ میں نے یہ روپیہ نہیں تھوڑا ہی دیا تھا۔ کہ تمہیں برا معلوم ہو۔ میں نے تو ایک گانے والی لڑکی کو دیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ میں اپنی بیوی کا جنون پورا کر رہا ہوں۔ آؤ پوجا کی یاد میں گلے تو ملو۔ (وہ دونوں نہایت خوشی سے لپٹ جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

محمد فضل حق معتصم

حسیاتِ فکری

خیالِ خام ہے یہ مُت نکالیں حوصلے دل کے
تقاضا عقل کا یہ ہے کہ ہم تابع کریں دل کو
درِ محبوب تک پہنچا میں دل کی رہنمائی سے
حقیقت انقلاب دہر کی پھولوں سے ظاہر ہے
تصوّر میں بھی جلوہ دیکھنا تھا ناگوار اس کو

کسی کو کیا ملا ہے جو ہمیں مل جائیگا مل کے
یہ نافہمی کی باتیں ہیں کہ بندے بن گئے دل کے
یہ وہ خلوت کدہ ہے جو پتے دیتا ہے منزل کے
ابھی پھولے ابھی مہکے ابھی مرجھا گئے کھِل کے
بُتِ خود بیں نے ٹکڑے کر دئے آئینۂ دل کے

مبارک ہو تجھے فکری وہ قائل ہوتے جاتے ہیں
ترے جذبِ محبت کے تری بیتابیِ دل کے

محمد شریف فکری

جوشِ جوش

افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہُوئے
آیا ہے حُسن بال پریشاں کئے ہُوئے

پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں
ہر شئے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہُوئے

کم ہو چلی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاہشیں
پھر آ گیا وُہ زلف پریشاں کئے ہُوئے

خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت حُسن پھر
کُہنی تک اپنے ہاتھوں کو عریاں کئے ہُوئے

پھر آ رہا ہے میری طرف مطربِ جنون
دُنیا کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہُوئے

پھر آ رہا ہے کوئی نظر دل پہ ڈالتا
ہر جنبشِ نگاہ کو پیکاں کئے ہوئے

پھر پردۂ مجاز میں آیا ہے حُسن دوست
آہنگ آزمائش ایماں کئے ہُوئے

سرگرم اختلاط ہے پھر کوئی حسن کے
سارے خصوصیات نمایاں کئے ہوئے

پھر آ کے اُس نے کُفر کا اقرار لے لیا
مُدّت ہُوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہُوئے

پھر شوق خود نمائی میں نکلا ہے کوئے شوخ
سو طور اِک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے

پھر آ رہا ہے جوشؔ کوئی قتل گاہ میں
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کئے ہوئے

غزل

ہر تازہ مصیبت پر اک عید مناتے ہیں
دل کو تری اُلفت کے انداز سکھاتے ہیں

یہ دست درازی کی تہمت ہے عبث ہم پر
ظالم ترے دامن سے اک داغ مٹاتے ہیں

یا بے سروپا باتیں یا عالمِ خاموشی
یوں ہوش سے جاتے ہیں یوں ہوش میں آتے ہیں

پیراہنِ ہستی میں کیوں آگ نہیں لگتی
شعلے تپشِ دل کے کیا خاک اُڑاتے ہیں

سامانِ جنون لیکر، ہاں وسعتِ صحرا میں
اب ایک نئی دُنیا ہم اور بساتے ہیں

تدبیر نہیں چلتی، تقدیر نہیں پھرتی
ہم اسے طلبِ فانی دھوکے میں کب آتے ہیں

سب چھیڑ کی باتیں ہیں، منظور نہیں پرسش
ہنستے ہیں غریبوں پر، دیوانہ بناتے ہیں

کم ذوقیِ محجوبی، مشکل سے ہے سہاؔ یعنی
وہ اہلِ نظر سے بھی چھپتے ہوئے جاتے ہیں

تنقید و تبصرہ

(مطبوعات جدیدہ)

نگارستان :- مشاہیرِ زبان اُردو کے سلسلۂ اولین میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا نام مخصوص اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کی تالیفات کو "خدمت زبان" کے بے مایہ الفاظ سے معنون نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ تعمیر و تخلیق زبان" کا سرمایہ سمجھنا چاہئے۔ "نگارستانِ فارس" "سخندانِ فارس" کا دوسرا نودریافت حصّہ ہے۔ جو ابو عبداللہ محمد رودکی سے لیکر نورالعین واقف بٹالوی تک کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

اس تالیف کا مقابلہ مولانا شبلیؒ کی کتاب شعرالعجم سے نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ صرف تذکرہ ہے اور وہ تذکرہ و تنقید دونوں پر حاوی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں، کہ تذکرہ کی روحِ رواں مولوی محمد حسین آزاد کی دقیقہ رس نظر، اور وہ قوتِ انشائے اُردو ہے۔ جو صرف مولوی صاحب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نیز یہ کہ یہ تذکرہ عجم تک محدود نہیں نہیں۔ بلکہ شعراء ہند بھی اس میں داخل ہیں۔ ہم آغا محمد طاہر صاحب (نبیرہ آزاد مرحوم) کی اس ترتیب و اشاعت کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ کتابت و طباعت نظر افروز ہے۔ تقطیع ۲۰ × ۲۶ - ⅛ حجم ۲۴۰ صفحات کتاب آغا محمد طاہر، مینیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے تین روپے میں منگائی جا سکتی ہے۔

سیرِ ایران - یہ کتاب مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کی سیاحت ایران کے روزنامچہ اور ایک لیکچر متعلقہ سیاحت مذکور کا مجموعہ ہے۔ جس کو جناب آغا محمد طاہر صاحب (نبیرہ آزاد مرحوم) نے بکمال کاوش جمع و ترتیب دیکر شائع کیا ہے باوجودِ اختصار، جامع و دلچسپ ہونے کے علاوہ آزاد مرحوم کی یادگار ہے۔ اس لئے قابلِ قدر ہے۔

کتابت و طباعت وغیرہ نہایت خوب ہے۔ لیکن کہیں کہیں کتابت میں غلطیاں پائی جاتی ہیں ان غلطیوں کو اس وجہ سے معرضِ ذکر میں لانے کی خاص طور پر ضرورت ہوئی۔ کہ آزاد مرحوم کا معاملہ ہے اگر کسی معمولی شخص کا سوال ہوتا تو چنداں اہمیت نہ دی جاتی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جناب آغا محمد طاہر صاحب آئندہ اشاعت میں تصحیح پر خاص توجہ فرمائیں گے۔ تمثیلاً صفحہ ۳ کی تیسری سطر "اور ہندوستان میں اپنے محقق اور معتبر دوستوں سے سُنا ہُوا تھا" اور اسی صفحہ کی دسویں سطر "میں سنے

سُنا ہُوا تھا۔" نیز صفحہ ۹۴ کی نویں اور دسویں سطر "میں نے . . . . . . تاریخ ہرات میں دیکھا ہُوا تھا۔ قابلِ تصحیح ہیں۔

حجم ۹۶ صفحات قیمت ۸؍ مینجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے مل سکتی ہے۔

پرِ پرواز:۔ یہ مختصر ڈراما' جناب آغا شاعر دہلوی کا تصنیف کردہ ہے۔ زبان کی سلاست اور قوتِ اظہار معیاری ہیں۔ لیکن انگریزی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال بکثرت ہُوا ہے۔ اور "پیکران تمثیل" بجائے انسانوں کے پرندے ہیں۔ بہرحال ڈراما ہے اور دلچسپ ہے۔

حجم ۹۶ صفحات قیمت ۸؍ مینجر صاحب آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے حاصل ہو سکتی ہے۔

روحِ نظیر:۔ میاں نظیر اکبرآبادی مرحوم (جنکے نام نامی کے احیاء کا امتیاز پروفیسر شہباز کا حصہ رہا) سے ملک بے خبر اور ناآشنا نہیں۔ اُن کی شاعری نے ایک خاص طبقہ پیدا کر لیا ہے۔ جو عقیدہ و گرویدگی کے جذباتِ تحسین سے معمور ہے۔ "علوم و فنون" کے اس بہترین "دورِ تہذیب و ترتیب" میں واقعی اگر نظیر جیسے بزرگوں سے بے اعتنائی کی جائے۔ تو ادبی و ملی بدبختی ہو گی۔ اسی تاثر کا انعکاس جناب محمود اکبرآبادی کی تالیف "روحِ نظیر" ہے۔ اور قطع نظر اُن بعض جزئیات کے جن کو ثابت کرنے کے لئے لائق مؤلف و مرتب نے مقدمہ میں بے حد سعی سے کام لیا ہے۔ ہم حضرتِ محمود کو دل سے مبارکباد کہتے ہیں۔ کہ آپ نے جس سلیقہ سے فرضِ ادارت ادا کیا ہے۔ اُردو زبان میں یہ وضاحت و ترتیب اپنی نظیر آپ ہے اور اس مختصر انتخاب کلام نظیر میں دیباچہ' مقدمہ' تبصرہ' فرہنگ اور حواشی وغیرہ اضافات سے آئندہ اداراتِ کتب کی ایک اچھی مثال قائم فرما دی ہے۔ اور ان تمام امور نے کلام کو اور زیادہ وقیع اور کتاب کو دلچسپ کر دیا ہے۔

تقطیع $\frac{22 \times 29}{16}$ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت دو روپے (عـ؍)۔ رام پرشاد اینڈ برادرس' کتب فروش چوک آگرہ کے یہاں سے طلب فرمائی جا سکتی ہے۔

خطوطِ اکبر:۔ یہ کتاب اُن خطوط کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ جو مولوی سید اکبر حسین صاحب مرحوم نے جناب خواجہ حسن نظامی صاحب عم فیوضہ کے نام وقتاً فوقتاً ارسال کئے ہیں۔ سید اکبر حسین صاحب مرحوم خود اپنے مخصوص رنگ نظم سے قبولیت عام اور شہرت حاصل فرما چکے ہیں۔ پھر جن سے وہ اس مراسلت میں مخاطب ہوتے ہیں۔ (یعنی جناب خواجہ حسن نظامی صاحب) وہ بھی انشائے اُردو میں خاص پایہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ خطوط دو مخصوص حیثیتیں رکھتے ہیں۔ اور خواجہ صاحب نے ان کو کتابی صورت میں شائع فرما کر

اضافہ ادب میں نہایت ضروری اور بروقت حصّہ لیا ہے
موضوع مکاتیب بھی بیشتر مبادی و حدود تصوف سے
تعلق کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تہذیب نفس و اخلاق کے
شارات اکثر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور یہ امر افادۂ عام سے
الی نہیں۔ حجم ۱۸۰ صفحات قیمت ۱۲ (ایک روپیہ آٹھ آنہ)
لقہ مشائخ بک ڈپو۔ دہلی سے طلب فرمایئے۔

بنائے سخن:۔ اُردو کی دُنیائے شاعری میں منشی
یر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم کا نام نامی ایسا نہیں
عریف کے اضافاتِ لفظی کا محتاج ہو۔ آپ کا شمار
لم الثبوت اساتذہ میں ہوتا ہے۔ بلکہ اردو شاعری کے
م رنگِ سخن طرازی کی محفل میں آپ آخری مسند نشین
زرے ہیں۔ اصنافِ سخن میں "واسوخت" ایک خاص
ی نظم ہوتی ہے۔ جو حریفانہ جذبات، شکوہ و شکایات
نتقام بیوفائی وغیرہ جذبات کا ایک سلسلہ پیش کرتی
۔ امانت نے اس صنف کو بہت کچھ روشناس اور
ل کردیا ہے لیکن "مینائی سخن" جو اس قسم کی کہی
ں کا مجموعہ ہے۔ اور جو منشی صاحب موصوف مرحوم کے
نِ شعر میں سے ہے۔ کچھ کم سرمایۂ قبولیت نہیں رکھتا
دائرۃ ادبیہ لکھنؤ نے اس مجموعہ کو شائع کرکے
استان کلام امیر پر خصوصاً اور زبانِ اُردو پر عموماً
حسان کیا ہے۔ کتاب مختصر تقطیع کے کم و بیش

دو سو صفحات میں مع دیباچہ و مقدمہ و ضمیمہ ختم ہوئی ہے۔
قیمت صرف ۱۲ ۔ دائرہ ادبیہ۔ محمود نگر لکھنؤ سے ملتی ہے۔

اسلام کا اثر یورپ پر:۔ یہ ایک چھوٹی سی
کتاب ہے۔ جس میں جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر
جوناگڈھی نے مختصر تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے۔ کہ
یورپ "علوم و مدنیت اسلام" کا کیسا کچھ زیر بارِ احسان
ہے۔ یہ کتاب بھی "دائرۃ ادبیہ" کے مساعی اشاعات میں
سے ہے۔ قیمت مجلد ۱۲ غیر مجلد ۸ ۔ "دائرۃ ادبیہ"
محمود نگر لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

حزن اختر:۔ صوبہ متحدہ میں علاوہ "دار المصنفین"
اعظم گڈھ کے جس کا دائرہ عمل مخصوص ہے۔ ادبیات کی
اشاعت کے لئے شاید "دائرۃ ادبیہ" کے ارباب ہی کی
جماعت ایسی ہے جس نے ادبیات کی اہمیت کو محسوس
کرکے اشاعت کا عظیم الشان کام، اپنے ذمہ لیا ہے۔
اور اپنی ممکنہ مساعی کے اچھے نتائج پیش کرسکتی ہے۔
"حزن اختر" بھی اسی سلسلۂ اشاعات کا اہم اضافہ ہے
یہ اودھ کے آخری حکمران اور زندانی مٹیا برج کی ایک
پُرسوز مثنوی ہے۔ اور ایک عجیب بیان درد سے
اور آثار عبرت سے مملو ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے بھی
بہت وقیع ہے۔ دائرہ ادبیہ نے اس کو حاصل و شائع
کرکے اپنی سعی مشکور کی تمثال پیش کردی ہے اگر اس قسم

کی نادرالوجود کتاب یوروپ میں اشاعت پائی، تو اہلِ ادب
اور اہلِ تاریخ انبوہ در انبوہ اُس کی خریداری پر ٹوٹ
پڑتے۔ مثنوی چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحات میں ختم ہوئی
ہے۔ اور مولانا شرر کے تحریر فرمودہ مقدمہ سے بھی مزین
ہے قیمت عہ ۔ دائرہ ادبیہ۔ محمود نگر لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

احسن القصص:۔ اس نام سے ایک سلسلہ کتب جس
کا موضوع "حالات مشاہیر قوم" ہے۔ جناب مولوی
محمد بدرالدین سیوہاروی، بی۔ اے علیگ نے شروع
کیا ہے۔ اور مقصد یہ ہے۔ کہ طلباء اور بچوں کو مشاہیر قوم
کے حالات سے کم از کم سرسری طور پر واقف کرا دیا جائے۔
چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر شائع ہو گیا ہے جس میں اڑتالیس
مشاہیر کے مختصر واقعات درج ہیں۔ اور کتاب لائق
مؤلف کے قابلِ قدر و ضروری مقصد اور مناسب کوشش
کا آئینہ ہے۔ حجم ۴۴ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قیمت صرف
۲/ ۔ ملنے کا پتہ :۔ کیلینز اینڈ کمپنی تاجران کتب رسل گنج علیگڈھ

اخبار الاندلس:۔ ایس، پی، اسکاٹ صاحب نے
"یوروپ میں اسلامی سلطنتیں" کے نام سے ایک ضخیم
کتاب لکھی ہے۔ جو اہم اور مشہور ہے۔ مؤلف موصوف
نے کتاب مذکور کے ابواب قائم کر دیئے ہیں۔ جناب
مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب نے اس کتاب کے باب
"اخبار الاندلس" کا ترجمہ شائع فرمانا شروع کیا ہے۔
اور چونکہ عام اہلِ علم کی طرح مترجم موصوف بھی ناقدرشناسی
ماحول سے متاثر ہیں۔ اس لئے طباعت و اشاعت کا
بار وقت واحد میں ناقابلِ برداشت سمجھا گیا اور بالاقساط
اجزاء خریداروں کے پاس ماہ بماہ پہنچانے کا انتظام کر لیا
گیا ہے۔ اس وقت تک ترجمہ مذکور کی ایک جلد چھ اجزاء
میں ختم ہوئی ہے۔ اور دو جلدیں اور باقی ہیں۔ اردو زبان
میں فنون کی کتابوں کا نہ ہونا۔ اور پھر وہ علاقہ جو مسلمانوں
کو تاریخ اندلس سے ہے۔ ایسے امور نہیں کہ کم التفاتی
عمل میں لائی جاتی۔ اور اس قسم کی کتابوں کا خیر مقدم نہ
کیا جاتا۔ پھر جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے۔ تو اس میں
شک نہیں کہ مترجم موصوف نے بہترین قابلیت کا ثبوت
دیا ہے۔ اور کتاب میں وہ تمام محاسن پائے جاتے ہیں جو ایک ترجمہ
میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے
کہ مترجم موصوف ایک فاضل اور کہنہ مشق مترجم ہیں۔ جو
اس سے قبل عربی زبان کی بھی چند اچھی کتابوں کا اچھا ترجمہ
کر کے شائع فرما چکے ہیں۔ قدردانانِ فن سے عموماً اور
مسلمانوں اور حامیانِ اُردو سے خصوصاً توقع ہے کہ وہ
جناب مترجم کی کاوشوں کی کم از کم اتنی قدرشناسی تو ضرور
فرمائیں۔ کہ کتاب کثیر الاشاعت ہو جائے۔

فرمائشیں جناب مولوی خلیل الرحمٰن صاحب۔ نصیر کاٹج
ریلوے روڈ۔ لاہور کے پتہ پر بھیجنی چاہئیں۔

اُردوے معلّٰے:۔ نفسِ کتاب اور غالبؔ مرحوم کے زبان قلم کے متعلق کچھ لکھنا گویا ایک "نہرِ عسلِ مصفّےٰ" کی موجوں کو روانی کی تعلیم دینے کی سعیِ لاحاصل ہے۔ مقصود صرف اس قدر ہے کہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب نے "اُردوے معلّےٰ" کے دونوں حصّوں کو یکجا کرکے بصرفِ کثیر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اور شیخ صاحب موصوف کی یہ دلچسپی مزید داد کی مستوجب ہے۔ کہ ایک ضمیمہ اضافہ کرکے اُس میں وہ نامعلوم اور غیر مطبوعہ و مروجہ، خطوط غالبؔ حاصل و شائع کئے ہیں۔ جو غالبؔ مرحوم نے اپنے قدردان شاگرد جناب قدرؔ بلگرامی کو وقتاً فوقتاً لکھے ہیں اور ان خطوط کی اہمیت یہ ہے۔ کہ اُن میں اکثر مسائل و اجتہادات متعلقہ زبان' درج ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اضافہ بہت ہی قیمتی اضافہ ہے جس نے شیخ صاحب موصوف کو ایک تاجر کی حیثیت سے بلند کرکے ایک "مکتشف ادب" کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ کتابت و طباعت اور عام تیاری کے اعتبار سے بھی یہ اشاعت بہت شائستہ اور گوارا ہے۔ قیمت عہ/۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری منڈی لاہور۔ کے پتہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔

شفق:۔ جنوبی ہند سے اس نام کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ زیر ادارت حضرت مہاجرؔ، و زیر سرپرستی پروفیسر مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے جاری کیا گیا ہے۔ رسالہ کے مقاصدِ اشاعت نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ یعنی "توسیع زبان اُردو اور جنوبی ہند کی مروجہ زبان کی تصحیح"۔ ایسی صورت میں تمام دُنیاے اُردو پر اس رسالہ کی ہر ممکنہ اعانت فرض ہے۔ اور توقع ہے کہ اہلِ قلم' اپنے انشاء سے اور صاحبانِ استطاعت اپنی خریداری سے رسالہ کا خیر مقدم کریں گے حجم ۶۴ صفحہ۔ پتہ یہ ہے:۔ دفتر "شفق" ۱۴۔ کوچۂ ارنا چلم آچاری نزد ملکھیرڈی۔ مدراس۔

ندیم:۔ ریاست بھوپال سے اسی مہینہ میں ایک علمی و ادبی رسالہ موسومہ "ندیم" جاری ہوا ہے۔ جسکے ایڈیٹر جناب سعید رزمی ہیں۔ اس سے پہلے بھی دارالریاست مذکور سے غیر سرکاری و نیم سرکاری دو ایک رسائل جاری ہو کر بند ہوچکے ہیں۔ لیکن "ندیم" کی موجودہ تیاری سب سے زیادہ خوشنما ہے۔ ترتیب و انتخاب مضامین میں سادگی اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا تنہا مالک' "معارف" کو سمجھنا چاہیے۔ تاہم "ندیم" کی پہلی اشاعت سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ رسالہ اپنے تحریر کردہ مقاصد علم و ادب کی جامعیت میں ایسے اعتدال و تناسب سے کام لیگا۔ جو علمی وقار اور ادبی رنگ کے بین بین ہو امید ہے کہ رسالہ ترقی کریگا، اور ناظرین کی توجہات کو دعوت ذوق دیگا قیمت سالانہ للعہ، نمونہ کا پرچہ ۲ر بمعہ منیجر رسالہ "ندیم" بھوپال سے مل سکتا ہے۔

ہزار داستان

ایڈیٹر، حکیم احمد شجاع بی اے علیگ

جلد ۱ — اشاعت اوّل ماہِ دسمبر ۱۹۲۲ء — نمبر ۱

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

صفِ ادارت

گلابی ساڑی کی آخری قسط آج شائع کی جا رہی ہے۔ ناظرین سلسلہ کیلئے ہزار داستان کی اشاعت نمبر ۷ ملاحظہ فرمائیں۔ مَیں سید امتیاز علی صاحب تاج کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود اس اچھوتے اور دلچسپ ڈرامہ کو اختتام تک پہنچا دیا۔

میرے معزز و محترم دوست نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ میرے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں اپنے نامور بزرگوں کی ایک قلمی بیاض سے جنّت آشیاں حضرت عالمگیر اورنگ زیب نورّ اللہ مرقدہٗ کی نورِ نظر شہزادی زیب النسا کی ایک نادر غزل نقل کر کے ہزار داستان میں شائع کرنے کے لئے مرحمت فرمائی ہے۔ شہزادی موصوف ایک شاعرہ کی حیثیت سے اتنی ممتاز اور مشہور ہیں۔ کہ جس کلام کو ان سے کسی قسم کی نسبت ہو۔ وہ اہلِ ذوق و کمال کے لئے خاص اہمیّت رکھتا ہے۔

'غریب الوطن' سر رابندرا ناتھ ٹیگور کے ایک افسانہ موسوم بہ 'کابلی والا' کا ترجمہ ہے۔ جسے مولانا سیّد ابو محمد ثاقب صاحب ثاقبؔ نے اُردو کا جامہ زیبا پہنایا ہے۔ نامور مصنّف اور قابل مترجم دونوں تعریف و توصیف سے بے نیاز ہیں۔ وُہ خاص جذبات جن کا تعلق فطرت انسانی اور نسبت روحانی سے ہو ٹیگور سے بہتر اور کون لکھ سکتا ہے۔

داستانِ پارینہ کی پہلی قسط پچھلے نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ اس کی دوسری اور آخری قسط ہے۔ مَیں سیّد عابد علی صاحب کو ان کی روز افزوں ترقی فن پر اپنی طرف سے اور بہت سے ناظرین ہزار داستان کی طرف سے جن کے تعریفی خطوط اس دفتر میں موصول ہوتے ہیں۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

کلامِ صولت کی دوسری قسط اس اشاعت کی زینت ہے۔ خاکِ عظیم آباد جسے بیدل جیسے اُستادِ فن کی تربیّت کا فخر حاصل ہو اسی قابل سکتی ہے کہ وہ حضرتِ صولت اور حضرت شاد جیسے قادر الکلام اساتذہ پیدا کرے۔ اگر بیدل اپنے زمانے میں ہندوستانی نژاد ہونے کے باوجود ایران کے لئے موجب ناز ہو سکتا تھا۔ تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ حضرت صولت اپنے زمانے میں کسی ایرانی شاعر سے کم مرتبہ نہ رکھتے تھے۔ اب خُدا حضرتِ شاد کو تا دیر سلامت رکھے۔ کہ اُن کی ذات کے ساتھ اُردو شاعری کی آبرو وابستہ ہے۔

اقبالِ جرم ایک نو عمر طالب علم کا نتیجہ قلم ہے۔ میری آرزو ہے کہ ہزار داستان نوجوانوں میں مذاق تحریر پیدا کرے۔ اور مَیں چاہتا ہوں کہ اس رسالہ کا ایک حصّہ زمانہ مستقبل کے کامیاب مصنفین کی مشق کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اس لئے مَیں اس اظہار جذبات کو جسے مَیں افسانے کے نام سے تو موسوم نہیں کر سکتا۔ مگر جس کی تہ میں ایک حقیقت سے لبریز اور درد سے معمور احساس موجود ہے۔ بکمال شکریہ شائع کر رہا ہوں۔

'مینا' کو لارنس کالج لاہور نے ۹۔ اور ۱۰۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو یونیورسٹی ہال میں تمثیل کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر حضور معلّے القاب گورنر بہادر پنجاب، آنریبل چیف جسٹس ہائی کورٹ پنجاب، آنریبل سر جان مینارڈ، آنریبل نواب سر ذوالفقار علی خاں اور دیگر عمائدین کا موجود تھے۔ مَیں اس قدر دانی کے لئے جو ارزانی فرمائی گئی سب حضرات کی خدمت میں شکریہ پیش کرتا ہوں۔ خُدا کا شکر ہے کہ اردو ڈراما میں اس قسم کی پہلی کوشش کو بنظرِ استحسان دیکھا گیا۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور نے اسے کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا انتظام کر دیا ہے۔ شائقین ۱۹۵ ریلوے روڈ لاہور کے پتہ سے طلب فرمائیں۔

ایڈیٹر

غریب الوطن

(کابلی والا)

(از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری)

(۱)

میری لڑکی منی اگرچہ ابھی پانچ ہی برس کی تھی لیکن وہ اس قدر باتیں کرتی تھی۔ کہ شاید ہی وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں کبھی ایک منٹ کے لئے بھی خاموش بیٹھی ہو۔ اس کی ماں تو اس سے بہت پریشان رہا کرتی تھی۔ مگر میں اُس کی ان بھولی بھالی باتوں سے بہت خوش ہوتا تھا میں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ خاموشی اس کی فطرت کے خلاف ہے میری اور منی کی باہمی گفتگو بچّوں کے جذبات سے محبت رکھنے والوں کے لئے بہت ہی پُرلطف ہوتی تھی۔

ایک دن جبکہ میں اپنے ناول کے سترہویں باب کی تکمیل میں مصروف تھا۔ کہ دفعتاً منی میرے کمرے میں داخل ہوئی اور ایک طفلانہ شرارت کے ساتھ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر پوچھنے لگی۔

"پتا جی۔ مجھے یہ بتا دیجئے کہ رام دیال وربا کو اکو گودا کیوں لکھتا ہے۔ یہ کچھ جانتا بھی ہے یا یونہی" ابھی میں اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے فوراً دوسرا سوال کیا [illegible] لیا یہ ریچھ ہے [illegible] ہاتھی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی سونڈ سے پانی پھینکتا ہے تو پانی برستا ہے"

میں نے ابھی اس کے جواب دینے کا [illegible] کہ اُس نے ایک تیسرا سوال پیش کر دیا۔ [illegible] اماں آپ کی کون ہیں"

میرا کمرہ لب سڑک تھا۔ منی میرے [illegible] آہستہ آہستہ اپنا باجہ بجا رہی تھی۔ اُس وقت [illegible] کے اس حصّے میں محو تھا۔ جس میں پرتاب [illegible] کنچلا (ہیروئن) کو پکڑ کر محل کے تیسرے [illegible] بھاگنے والا تھا۔ کہ یکایک منی اپنا کھیل چھوڑ کر [illegible] "کابلی والا" کہتی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی [illegible] دیکھا تو حقیقت میں ایک کابلی کثیف کپڑے پہنے ہوئے کاندھے پر ایک بڑا تھیلا رکھے اور ہاتھوں میں [illegible] بکس لئے ہوئے سڑک پر جا رہا ہے۔ [illegible] اس [illegible] جسامت دیکھ کر کچھ ایسی مبہوت ہوئی۔ کہ اُس کا صحیح نقشہ کھینچنا غیر ممکن ہے۔ مگر وہ بے اختیارانہ رو سے برابر پکارتی [illegible]

کو پلٹا۔ اور لڑکی کو محبت آمیز نظروں سے دیکھنے
لگا۔ منی اُس کو اپنی طرف دیکھ کر وہاں سے بھاگی۔ اور جاکر
اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی ماں کابلی کو دیکھ کر سمجھی
کہ ضرور اس کے تھیلے میں منی کی طرح چھوٹے چھوٹے
خوبصورت بچے بند ہیں۔ اتنے میں کابلی دروازے سے
داخل ہو کر اندر آیا۔ اور مجھے سلام کر کے مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔
میں نے اُس سے بعض چیزیں خریدیں۔ اور اس کے بعد
امیر عبدالرحمٰن، روسیوں، انگریزوں اور سرحدی لوگوں کے
متعلق گفتگو کرنے لگا۔ جب وہ جانے کے لئے اُٹھا تو
اُس نے پوچھا کہ وہ چھوٹی لڑکی کہاں ہے۔ میں نے منی کا
خوف دور کرنے کے خیال سے اُس کو بُلایا۔ وہ آئی اور میری
کرسی کے پاس ہی کھڑی ہو کر کابلی اور اُس کے تھیلے کو
نہایت غور سے دیکھنے لگی۔ کابلی نے منی کی سراسیمہ نظروں
سے اُس کے دھڑکتے ہوئے دِل کو دیکھ لیا۔ جس کے
ٹھہرانے کے لئے وہ اُسے کچھ کشمش اور اخروٹ دے
کر چلا گیا۔

ایک دن علی الصباح، میں کہیں جانے کے لئے
تیار تھا۔ کہ میں نے منی کو دروازے پر کابلی کے ساتھ
نہایت بے تکلفانہ کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اس کی ساڑی
کا کونہ بادام و کشمش سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔
تم نے یہ بادام وغیرہ اسے ناحق دیئے۔ آئندہ یہ نہ ہونا
چاہیے۔ اور یہ کہہ کر میں نے اُسے ایک اٹھنی دی۔ جسے
اُس نے بلا کسی تامل کے مجھ سے لیکر منی کو دیدیا۔ منی کی
ماں اٹھنی دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔ کہ یہ تم نے کہاں پائی۔
منی نے اپنی اُسی بے پایاں خوشی میں کہا کہ مجھے کابلی والے
نے دی ہے، یہ سُنکر وہ بہت خفا ہوئی۔ اور اُس کو سزا
دینے کے لئے اُٹھی۔ لیکن میں نے فوراً پہنچکر رفع دفع کر دیا۔

اس عرصہ میں منی اور کابلی آپس میں بہت دوست
ہو گئے تھے۔ کابلی نے اس کے خوف کو بادام اور اخروٹ
دے دیکر خرید لیا تھا۔ اور یہ دونوں آپس میں خوب کھیلا
کرتے تھے۔ جب کابلی آتا تو منی اس کی صورت دیکھ کر
بے اختیار ہنسنے لگتی۔ اور نہایت بھولے پن سے پوچھتی۔
"کابلی، کابلی! تمہارے اس تھیلے میں کیا ہے؟" اس
کے جواب میں کابلی اپنے اُسی خاص لہجے میں کہتا۔
"بچہ تم نہیں جانتے اس میں ایک ہاتھی بند ہے۔"
ایک سن رسیدہ شخص سے اس بھولی اور کمسن لڑکی کی
یہ باتیں اور یہ معصومانہ سوالات بہت ہی دلچسپ و
دلفریب معلوم ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ کابلی نے پوچھا: "منی تم اپنے سسرال
کب جاؤ گی؟" غریب منی اُس کے اس سوال کو نہ سمجھ سکی،
وہ سوچ رہی تھی کہ سسرال کے کیا معنی ہیں۔ اس لئے
اس نے یہی سوال اُس سے کیا۔ "کیا تم وہاں جاؤ گے؟"

کابلی تو یہاں رہکر اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ کہ سسرال
کا لفظ کن معنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی
وہ جہاں کسی کی شادی ہو۔

اس پر کابلی نے اپنے کسی خیالی کانسٹبل کو مارنے
کے لئے نہایت سختی سے گھونسا اُٹھایا۔ اور کرخت آواز
میں چلّا کر بولا۔ "ہم اُس سسرے کو مار ڈالیگا"۔

اُس کی اس حرکت پر منی بے اختیار ہو کر ہنسی کہ اُس
کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اور کابلی بھی اس کے ساتھ
ہنستا رہا۔

(۲)

باغوں میں خزاں آ چکی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ اگرچہ
میں اس وقت کلکتے ہی کے ایک گوشے میں مقیم تھا مگر
میری قوت متخیلہ کی پرواز تمام دُنیا میں سیر کر رہی تھی
دوسرے ملکوں کا نام سُنکر میری تمناؤں میں تلاطم
پیدا ہو جاتا تھا۔ اور کسی نووارد شخص کو سڑک پر آتے
جاتے دیکھ کر اُس کے وطن کے خیال میں ایسا مستغرق
ہوتا کہ وہاں کے پہاڑوں کے دلکش مناظر، وادیوں اور
گھاٹیوں کی نمناک شادابی، اور گھنے جنگلوں میں رہنے
والے غریب دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے
میری نظروں میں [illegible]
سے از خود رفتہ ہو جاتا اور اگر کہیں کابلی [illegible]
پاس بیٹھا ہوتا تو کابل کے پہاڑوں کی بلند [illegible]
وادیوں کے نشیب و فراز میرے سامنے [illegible]
معلوم ہوتا کہ سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی لمبی
لمبی قطاریں اور سوداگروں کی اُونچی اُونچی پگڑیاں [illegible]
خود دیکھ رہا ہوں۔

اکثر میرے ان تخیلات کی محویت اُس وقت دور ہوتی
تھی۔ جب منی کی ماں مجھ سے یہ کہتی۔ کہ دیکھو اس آدمی سے
ہوشیار رہنا۔

منی کی ماں دل کی فطرۃً کمزور تھی۔ اگر وہ سڑک پر
ذرا بھی غل سُن لیتی تو یہ سمجھ کر ڈر جاتی۔ کہ شاید لوگ
یا شرابی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ وہ عقل [illegible]
انہیں خیالی پیش آنے والے خوفناک [illegible] کی فکر
میں رہا کرتی۔ اور کابلی سے تو وہ انتہائی طور پر [illegible] تھی
بعض وقت اُس کا شک اتنا گہرا ہو جاتا کہ مجھے اُس پر
بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اور وہ مجھے ہنستے ہوئے دیکھ کر
جھنجھلا کر پوچھتی۔ "کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ کابلی بچوں
کو چُرا لے جاتے ہیں؟" "اور کیا غلامی کی رسم اب تک
کابل میں جاری نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جسیم [illegible]
اس آمد و رفت میں کسی دن میری بچی کو بھی چُرا لے جائے"
[illegible]

ہونا غیر ممکن ہے۔ لیکن میری ان باتوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی۔ میں نے بھی اس سلسلہ میں کبھی اُس کی آمدو رفت پر کچھ خیال نہ کیا۔ اور وہ اسی طرح برابر آتا رہا۔ اس کا معمول تھا کہ ہر سال جنوری میں کابل چلا جاتا اور کچھ عرصہ کے بعد قرض داروں سے روپیہ وصول کرنے کے لئے پھر واپس آجاتا۔

(۳)

آٹھ بج چکے تھے، سردی ابھی زیادہ تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں پر جا رہے تھے۔ آفتاب کی سنہری کرنیں کانپتی ہوئی میرے کمرے میں آرہی تھیں۔ اور میں اپنی کاپیوں کی تصحیح میں محو تھا کہ سڑک پر کچھ شور و غل کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کابلی کو پولیس والے پکڑے لئے جا رہے ہیں۔ میں دوڑ کر مجمع کے قریب گیا لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ کابلی کا کچھ روپیہ کسی پر باقی تھا۔ اُس نے دینے سے انکار کیا۔ آپس میں لڑائی ہوئی۔ اور کابلی نے غصہ میں آکر اُس کے چاقو مار دیا۔

اس وقت کابلی کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا۔ اور پولیس والوں کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ یکایک منی دوڑتی ہوئی آگئی۔ اور اسی طرح کابلی والہ کابلی والہ کہکر پکارنے لگی۔ رحمن (یہ اُس کابلی کا نام تھا) کے جسم میں اس آواز سے ایک برقی رو دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا۔ اس وقت کابلی کے پاس تھیلا نہ تھا جسے دیکھ کر منی ہاتھی کے متعلق اس سے گفتگو کرتی۔ اس لئے وہ پہلی بات یاد کر کے پوچھنے لگی۔ "کیا تم اپنے سسرال جا رہے ہو؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہاں پیاری بچی میں وہیں جا رہا ہوں۔" یہ کہنا ہی تھا کہ اُس کا چہرہ آتشِ غضب سے بھڑک اُٹھا۔ اُس نے ہتھکڑی بھرے ہاتھوں کو ہلا کر کہا۔ افسوس اگر اس وقت میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو ان بدمعاش سسروں کو کافی سزا دیتا۔ لیکن آہ۔ مجبور ہوں۔

پولیس والے کابلی کو عدالت لے گئے۔ جہاں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ اور قاتلانہ حملے کے جرم میں یہ برسوں کے لئے قید کر دیا گیا۔

(۴)

زمانہ گردشیں کرتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ فصلیں ختم ہوتی رہیں۔ اب کابلی کسی کو یاد نہ تھا۔ ذہن نے اُسے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ میں اُسی لب سڑک کمرے میں اپنے کاموں میں مشغول رہا۔ اور کبھی اُس غریب قیدی کا خیال تک نہ آیا۔ جو قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اپنی اسیری کے سخت دن گذار رہا تھا۔ یہ الزام صرف مجھ پر ہی نہیں۔ بلکہ منی کو بھی اپنا یہ پرانا اور

مخلص دوست کبھی یاد نہ آیا۔ اب اس میں جوانی کی امنگیں تھیں۔ اور وہ زیادہ تر اپنی ہمجولیوں میں رہا کرتی تھی۔

رات دن صبح و شام میں تبدیل ہوتے رہے، مہینے آتے اور گذر گئے۔ سال آئے اور ختم ہو گئے۔ پھر وہی جاڑے کا موسم تھا۔ منی کی شادی کا سب سامان ہو چکا تھا۔ پوجا کی تعطیلوں میں شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اور فراق کا وہ غمگین زمانہ قریب آتا جاتا تھا۔ جس میں کہ والدین کے دلوں کی تسلی ہمیشہ کے لئے اُن سے چھن جانے والی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں کلکتے کے بلند مکانوں پر پڑ رہی تھیں۔ پانی برس کر کھل چکا تھا۔ ہوا نہایت سرد چل رہی تھی۔ آج منی کی شادی کا دن تھا۔ صبح ہی سے باجے بجنے لگے جن کی آوازوں کے ساتھ میرا دل بیقرار ہوا جاتا تھا۔ فراق کی شدید ترین گھڑیوں کو بھیرویں کا غمگین راگ اور بھی رقت انگیز بنا رہا تھا۔

صبح کی رفتار کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی بھی تعداد بڑھ رہی تھی۔ شامیانے نصب کئے جا رہے تھے ہر شخص نہایت سرگرمی کے ساتھ کمرے اور دالانوں کی آرائش میں مصروف تھا۔ اور میں اُسی کمرے میں اپنے ناول کے پلاٹ پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک تو میں اُسے

نہ پہچان سکا۔ لیکن جیسے ہی یہ مسکرایا میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ رحمٰن ہے۔ اب نہ اُس کے پاس وہ پہلا تھیلا تھا۔ نہ وہ لمبے لمبے بال تھے۔ اور نہ وہ اگلی سی طاقت و بیخوفی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ "رحمٰن تم کب آئے؟" اس نے سُکتے ہوئے کہا۔ ... میں کل شب اپنی میعادِ قید ختم کر کے حاضر ہوا ہوں۔ ... یہ سُننا تھا کہ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے تمام عمر کبھی ایسے شخص سے گفتگو کی تھی۔ جس نے کسی پر قاتلانہ حملہ کیا ہو۔ ... اب میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور خیال کر رہا تھا۔ کہ کاش یہ نہ آتا۔

میں نے اس سے کہا کہ آج میں شادی کے کاموں میں بہت مصروف ہوں۔ بہتر ہوتا کہ تم اور کسی وقت آتے۔ یہ سُنتے ہی وہ جانے کے لئے پلٹا۔ لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر پھر ٹھہر گیا۔ اور پوچھنے لگا۔ کیا میں اپنی اُس چھوٹی بچی کو دیکھ سکتا ہوں؟

آہ! اُس کا خیال تھا کہ منی اب بھی وہی چھوٹی منی ہو گی جو اُسے اسی طرح "کابلی والا" "کابلی والا" کہہ کر پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ آج بھی ہم دونوں اُسی شان بے تکلفی سے کھیلیں گے۔ آج بھی وہ ... لئے ایک کاغذ میں کچھ انگور اور کشمش لپیٹ کر لایا

میں نے [illegible] سے پھر وہی کہا۔ کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں [illegible] گفتگو کا موقع نہیں۔ بہتر ہو تا کہ پھر کسی وقت [illegible] وہ نا اُمید ہو گیا۔ اور میری طرف حسرت بھری نظروں سے [illegible] دیکھتا ہوا اسلام کر کے چلا گیا۔

اُس [illegible] چلے جانے کے بعد ہی میرا دل خود بخود گھبرانے لگا۔ میں اپنی [illegible] سے اُٹھا اور اُس کو پکارنے جا ہی رہا تھا کہ وہ خود [illegible] پس آیا۔ اور بعض چیزیں نکال کر کہنے لگا۔ یہ چند ناچیز [illegible] میں اپنی اُس چھوٹی بچی کے لئے لایا تھا [illegible] مہربانی یہ اُسے دے دیجئے۔ جنہیں میں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لے لیا۔ اور بطور معاوضہ کے اُسے کچھ [illegible] دینے لگا۔ مگر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر نہایت لجاجت سے کہا۔ کہ بس میرے لئے آپ کی اتنی محبت کافی ہے۔ کبھی کبھی اس غریب الدیار کو یاد فرما لیا کریں۔ میں [illegible] محبت ہوں۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی [illegible] طرح میری بھی ایک لڑکی وطن میں ہے۔ کہ جب وہ [illegible] یاد آتی ہے۔ تو میں اُس کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔ اور اُسی محبت میں منی کے لئے یہ چند حقیر چیزیں لے آتا ہوں۔ جس سے خدانخواستہ مجھے نفع کی غرض [illegible] کاغذ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا [illegible]

[illegible]

لڑکی کے سیاہی بھرے ہاتھ کا نشان تھا۔ جسے وہ اپنی پیاری بچی کی ایک نشانی سمجھ کر جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

یہ دیکھ کر میری آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں اور میں اسے بالکل بھول گیا۔ کہ وہ ایک غریب میوہ فروش کابلی ہے۔ اور میں . . . . لیکن کیا مرتبے میں میں اُس سے زیادہ ہوں . . . . نہیں ہرگز نہیں۔ وُہ بھی کسی کا شفیق باپ ہے۔ آہ اُس معصوم بچی کے (جو یہاں سے بہت دُور افغانستان کی شاداب پہاڑیوں میں آزادانہ زندگی بسر کرتی ہے) ہاتھ کا نشان دیکھ کر میرے مغموم جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا۔ اور بیساختہ مجھے اپنی منی یاد آ گئی۔ میں نے اُسے باوجود عورتوں کی سخت مخالفت کے اپنے پاس بلوا بھیجا۔

وہ شادی کے سرخ ریشمی کپڑے پہنے ہوئے آئی مانگ پر صندلی ٹیکہ لگا ہوا تھا۔ اور تمام جسم شرم سے پسینے پسینے کابلی اُسے اس حالت میں دیکھ کر تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ اور پھر یکایک کچھ یاد کر کے بولا۔ "بچی کیا تم اپنے سسرال جا رہی ہو"۔ اس وقت منی بچپن میں کابلی کی زبانی سُنے ہوئے اس لفظ کا مفہوم سمجھ گئی۔ مگر وہ جواب دینے کی بجائے شرم سے سُرخ ہو [illegible] اپنی نظروں کو نیچے کئے ہوئے خاموش کھڑی رہی

آہ جب میں کابلی اور منی کی پہلی ملاقات کو یاد کرتا

ہوں۔ کہ وہ ایام کس قدر خوشگوار تھے۔ تو میرے سینے میں غم کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔ . . . . . جب منی واپس چلی گئی، تو رحمن بے اختیار ہوگیا۔ اور ٹھنڈی سانس لیکر زمین پر بیٹھ گیا۔ شاید اُس نے یہ خیال کیا ہوگا کہ میری بیٹی بھی اب جوان ہوگئی ہوگی۔

شادی کے رسمی باجے بجنے لگے۔ موسم سرما کے کانپتے ہوئے آفتاب نے اپنی سُنہری کرنیں دُنیا والوں پر ڈالنی شروع کیں۔ اس حال میں کہ رحمن کا تصور افغانستان کے لق ودق میدانوں اور اُونچے اونچے پہاڑوں میں اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ مَیں نے اُسے وطن جانے کے لئے ایک نوٹ دیا۔ اور کہا۔ کہ رحمن خدا کے لئے تم اپنے وطن جاؤ۔ اور اپنی بچھڑی ہوئی بچی سے ملو۔ شاید تم دونوں کا یہ ملنا میری لڑکی کیلئے برکت کا موجب ہو۔ چونکہ مَیں نے ایک نوٹ رحمن کو دیدیا تھا اس لئے مجھے آرائش کے فضول اور غیر ضروری سامانوں میں تخفیف کرنا پڑی، اگرچہ عورتیں اس سے بہت بددل ہوئیں مگر مَیں نے بجلی اور فوجی باجہ بند کرا دیا۔

اس وقت میری آنکھیں ایک دور دراز ملک میں دُنیا کی انتہائی مسرت کا وہ دلکش منظر دیکھ رہی تھیں جبکہ ایک اکلوتی لڑکی اپنے غریب الدیار باپ کی آغوش شفقت سے ہم آغوش ہوئی ہوگی۔

(ترجمہ ٹیگور)

تصویر جذبات

خوگر رنج [illegible] تھا [illegible] | [illegible] دل یوں کبھی ناشاد نہ تھا
کس طرح عہد تمنا کا ہوتا پھر آغاز | حسن نظارہ اگر عشق کی [illegible] تھا
اے [illegible] کیا تو نے | ہائے [illegible] مجھے اپنا [illegible] تھا
کیوں نکلتا [illegible] | لب خاموش اگر مائل [illegible] نہ تھا
دیکھ کر مجھ کو مری آنکھوں کے آنسو رُک گئے | ورنہ اے دوست سر شکوہ بیداد نہ تھا
کیا کیا تو نے یہ اے میری امید موہوم | اُس کو پھر یاد دلایا جو مجھے یاد نہ تھا
موت نے ضبط کی کچھ شرم ہی رکھ لی ورنہ | مَیں یہ کیونکر کہوں دل مائل فریاد نہ تھا

اسقدر کیوں غم ویرانی دل ہے ثاقب
آج برباد ہے کیا یہ کبھی برباد نہ تھا

سید ابو محمد ثاقب

داستانِ پارینہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

دوسرے دن میں گیا تو اسے بہت بہتر حالت میں پایا۔ وہ کھڑکی کے [illegible] یب لیٹا ہوا تھا۔ اور اگرچہ زردیِ رُخ و [illegible] انداز جو غمازی کرنے کے لئے بہترین ذرائع ہیں [illegible] [illegible] مگر وہ جنون اور دیوانگی، جو کل اِس کی باتوں [illegible] شح ہو رہی تھی۔ وہ بہت کچھ کم ہو چکی تھی۔ میں [illegible] کے [illegible] گیا۔ تو دیکھا کہ وہ ایک عجیب حسرت کے انداز [illegible] کے بیرونی منظر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سانس [illegible] سے چل رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے [illegible] دبا لیا۔ مگر اس کو چھوتے ہی یوں محسوس ہوا گویا اپنا [illegible] کسی جلتے ہوئے انگارے پر رکھ دیا ہو۔ میں [illegible] کی طرف دیکھا۔ وہ نیم وا آنکھیں کئے ہوئے [illegible] میری حالت کو دیکھ کر بولا۔ "ہاں، بے شک [illegible] کل بالکل حرارت نہ تھی۔ مگر گاہ بگاہ مجھے ایسے دورے ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

[illegible] میرا ہاتھ اٹھانا چاہا۔ اصغر نے بہت بے تابی [illegible]

[illegible] نے جواب دیا [illegible] [illegible] ہی صحت [illegible]

کی اتنی بھی پروا نہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے باتیں بنا رہے ہو۔"

اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کیلئے کہا۔ "لاہور کا مشہور ترین ڈاکٹر ابھی ہو کر گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میری زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں۔ اور مجھے اس قلیل وقت میں بہت کچھ کرنا ہے۔ بیٹھ جاؤ تو تمہیں کچھ سُناؤں۔"

الفاظ، میری حیرت، تعجب اور غصّہ کو بیان کرنے سے قاصر ہیں، اصغر تو موت کا ذکر یوں کر رہا تھا۔ جیسے زندگی کے معمولی حوادث میں سے ایک حادثہ وہ بھی ہو! میرا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار کے رو دوں۔ مگر میں دل مسوس کے رہ گیا۔ اور ایک مصنوعی تبسم سے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ ابھی تمہاری زندگی کے بہت دن باقی ہیں۔ ڈاکٹر کبھی کبھی اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے بھی ایسا کہہ دیا کرتے ہیں۔"

اصغر نے میری طرف حیرت [illegible] دیکھ کر کہا۔ "آپ کو یقین ہی نہیں آتا، یا آپ یقین کرنا نہیں چاہتے!"

بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ میری زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ تپ دق نے میرے جسم کو گھن کی طرح کھا لیا ہے۔ ہڈیوں کا تمام گودا پگھل چکا ہے۔ اور اب جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی۔ کہ وہ رُوح کے گرانبار طائر کو مقید رکھ سکے مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ مَیں بہت جلد مر جاؤنگا" یہ کہکر اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ "آہ اس عمر میں! اور ایسے وقت مرنا بھی کتنا ناگوار ہے۔ بہار کس چمک دمک سے شروع ہوئی ہے۔ سبز پتّے اور دھانی کونپلیں، بہت فراوانی میں پیدا ہوئی ہیں پھولوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ہوا کے معطر جھونکے، اٹھکھیلیاں کرتے پھرتے ہیں۔ ان تمام دلفریب چیزوں سے جُدا ہونا کسقدر شاق گذرتا ہے مانوس چہرے اور شکلیں نظروں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ مگر مَیں دُنیا کے بغیر رہ کر کیا کرونگا۔ میرے لئے تو تمام مسرت، تمام شادابی، تمام بہار، اسی کے وجود کے ساتھ رُخصت ہوگئی۔ مگر غالباً آپ بیتاب ہوں گے کہ میرے فسانۂ اُلفت کو آخری دفعہ میری زبان سے سُن لیں۔ آئیے ادھر میرے پاس بیٹھ جائیے" اس کے بعد کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ مَیں نے اپنی کرسی اس کے قریب کھینچی اور خاموش بیٹھ گیا۔

اصغر نے کہنا شروع کیا۔ "تقریباً دس ماہ کا واقعہ ہے۔ مَیں لکھنؤ سے واپس آ رہا تھا۔ لاہور کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ تو صبح کا وقت تھا۔ مَیں بھی کمرے میں سے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مسافر گروہ در گروہ دھکا پیل کرتے ہوئے درجوں میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند اور اصحاب بھی مغربی لباس میں ملبوس ایک عجیب شان تفاخر سے یورپین زنانہ درجوں کے آگے ٹہل رہے تھے۔ ان کا کسی رنگین ادا کو دیکھ کر بے تحاشا گھورنا اور پھر رعونت سے اپنے لباس کی طرف دیکھنا، اتنا جاذب نظر نہیں تھا جتنا وہ تبسم حقارت آمیز تھا۔ جو اس حرکت خود آرائی کے جواب میں نظر آتا تھا۔ اسی طرح ٹہلتے ٹہلتے مَیں اپنے درجے سے بہت دُور نکل آیا۔ سامنے سے چند برقع پوش عورتیں شرم و حیا کی گٹھڑی بنی ہوئی چلی آ رہی تھیں تم جانتے ہو کہ مجھے اسٹیشن پر پردہ نشین عورتیں دیکھنے سے کسقدر نفرت ہے۔ مَیں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ دو قدم آگے چلکر زمین پر ایک چھوٹی سی شے گری ہوئی دکھائی دی مَیں نے جُھک کر اُٹھا لی۔ معلوم ہوا کہ ایک پنکھا ہے نہایت نازک اور نفیس، کناروں پر ریشمی جھالر لگی ہوئی، زرتاری کام میں نسوانی دماغ کی لطیف ترتیب و تدوین کی گئی معلوم ہوتی تھی۔ مَیں یہ سمجھ کر کہ [illegible] گری ہے

کے قریب ... کا مالک بھی ہوگا۔ مرزا اور پنکھیا کو ایک لڑکی ... ہیں دے دیا۔ میں اس غیر متوقع ملاقات سے کچھ متعجب سا ہوگیا۔ اور وہ تو فوراً محجوب ہوکر پیچھے ہٹ گئی ... کچھ میں نے اس ایک نگاہ میں دیکھ لیا وہ اب ... عمر نہ بھولوں گا تمہیں یاد ہوگا کہ میں کس دیدہ دلیری ... سے انگریزی ضرب المثل "محبت بیک نظر" کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ مگر اس ایک لمحے میں اس کلیئے کی تصدیق ہوگئی۔ مجھے یوں معلوم ہوا گویا میری رُوح کھینچ کر کسی اور جگہ چلی گئی ہے۔ جس لڑکی کو میں نے دیکھا اس کا حلیہ بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ ایسا حیرت خیز اور عجیب انگیز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا چوڑا خوبصورت سفید ماتھا نیلگوں آنکھیں جس میں دو ستارے چمکتے ہُوئے دکھائی دے رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گویا ان بند آنکھوں میں آنسو بھرے ہُوتے ہیں۔ مگر ٹپک نہیں پڑتے، عاقلانہ، صاف سنجیدہ نظریں، سر کے بال سُنہری تھے جن پر ... سورج کی شعاعیں پڑتی تھیں۔ تو عجیب محبوب جھلک اُن کا مزا پیدا کرتے تھے۔ نیلے پیازی ہونٹ جنہیں عرف عام میں کیوپڈ کی کمان کہا جاتا ہے چھوٹے چھوٹے ریشمی گھونگر والے گچھے کانوں کے قریب لٹک ... تھا ... مرعوب ... کر لیتا ... ایک ...

انبساط روحانی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے انداز میں اسقدر دوشیزگی اور بھولا پن تھا کہ اس کی نسبت ہوس کو دماغ میں ذرا سی جگہ دینا بھی ناممکن تھا۔

مَیں اس کے بعد اسٹیشن پر بہت عرصہ ٹہلتا رہا کہ شاید وہی شکل پھر نظر آجائے۔ مگر بے سود، آخرکار جب مَیں مایوس ہو کے جانے والا تھا۔ ایک عورت کمرے میں سے گلاس لیکر نکلی اور نل کی طرف جانے لگی۔ انداز رفتار وگفتار سے انا معلوم ہوتی تھی۔

مَیں نے اس کے قریب جاکر پوچھا۔ "بوا! تم کہاں جاؤ گی؟"

اس نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر میری شکل وشباہت سے مطمئن ہو کر بولی۔ "کیوں، کوئی کام ہے۔"

مَیں نے کہا "نہیں، مجھے شبہ سا تھا۔ کہ میرے دوست آغا حسین کے گھر سے سواریاں جا رہی ہیں"

اُس نے میری طرف دلچسپی سے دیکھا، پھر بولی "کیا نام بتایا آپ نے؟"

"آغا حسین"

اس نے کہا "نہیں یہ تو محمد علی صاحب کے گھر کی سواریاں ہیں۔ وہ جو مراد آباد میں ... ہیں ... ابھی ... کے ہاں سے آئی ہے۔

میں نے جرأت کر کے پوچھا "کیا اکیلی ہیں؟"

اُس نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے کہا، "نہیں مردانہ میں ان کے کئی نوکر ساتھ ہیں۔" اور یہ کہتی ہوئی قدم بڑھاتی ہوئی چلی گئی۔

میرا ارادہ مستقل ہو چکا تھا۔ فطرت میری تباہی کے سامان کر چکی تھی۔ میں نے مراد آباد کا ٹکٹ لیا اور اسی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

. . . .

مراد آباد جا کر میں نے ایک چھوٹا سا مکان اُن کے قریب لے لیا۔ اور وہاں رہنے لگا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ محمد علی صاحب پولیس میں انسپکٹر ہیں اور بہت شریف اور با وضع آدمی ہیں۔ شہر میں اُن کی شرافت اور اتقا کی دھوم تھی۔ یہ بھی سنا کہ ان کی ایک ہمشیرہ ابھی کنواری ہے۔ جس کی تعلیم، شائستگی اور اخلاق کی وجہ سے اس کے لئے کئی جگہ سے پیغام آ چکے ہیں۔ مگر محمد علی صاحب نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

اس اثنا میں میری عجیب حالت تھی۔ جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے۔ اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ حالت جوش و خروش کے درجے سے بڑھ کر جنون تک پہنچ چکی تھی۔ ہر وقت ایک اضطراب سا محسوس ہوا کرتا تھا گویا خفیف سی حرارت ہو۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ نیند تو ایک طرف کبھی کبھی کروٹیں بدلتے بدلتے تھک جاتا، تو اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگ جاتا۔ اور اسی طرح صبح ہو جاتی۔ ہاں میرے تصوّر کا ایک دلفریب باغ آنکھوں کے آگے موجود تھا۔ کبھی کبھی آنکھ جھپک جاتی تو عجیب عجیب خواب نظر آتے۔ ایک پُر بہار مرغزار ہے ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ وادی کے خاموش گوشے میں آبشار، اپنی پوری قوت کے ساتھ بہ رہا ہے۔ اور وہ اس حالت میں اپنے رقصِ ناز سے پھولوں کے تختوں کو پامال کرتی پھرتی ہے۔ پھر یوں معلوم ہوتا گویا کس... میں خاموشی کا عالم ہے۔ گھاس شبنم کے قطروں سے نم ہے۔ کوئی زندگی کا خدشہ یا دغدغہ نہیں ہے۔ اور وہ اس عالم میں گا رہی ہے۔ اس کی سُریلی تانیں میرے دل میں اُتری جاتی ہیں۔ کہسار اور دشت، اس کی موسیقی سے گونج اُٹھتے ہیں۔ ہر طرف ایک سماں بندھ جاتا ہے پھر دیکھتا ہوں کہ شام کا وقت ہے۔ آسمان پر شفق پھول رہی ہے۔ بادل کے لکّے رنگین ہو رہے ہیں اور وہ ان تمام اشیا کے درمیان ایک نور کے اُڑن کھٹولے میں پرستان کی پری کی طرح مصروف پرواز ہے۔ اس کے بعد آنکھ کھل جاتی۔ تو عجیب حالت ہوتی۔ بہت دل گرفتہ آشفتہ، میرے لئے یہ لذّت و الم کی آمیزش کا پہلا تجربہ تھا۔ ہر وقت سر پر ایک جنون سا سوار رہتا تھا۔

... [illegible] ت بھلتی ہی نہ تھی۔ آخر کار جب یہ حالت
... [illegible] تو میں نے ان کارستانیوں اور کارگزاریوں
... [illegible] کے ہاں رسائی حاصل کی جنکا خیال
... [illegible] رسندہ کر دیتا ہے۔ ان کی خوئے کریمانہ
... [illegible] مدبے تکلف ہونے کا موقع دے دیا
... [illegible] معلوم ہوا کہ میں مصوّر بھی ہوں تو بالکل
... [illegible] بد قسمتی یا حسنِ اتفاق سے انہیں
... [illegible] کچھ ذوق ہے۔
... [illegible] جانا وہاں مسلم ہوگیا تھا۔ اور بعض دفعہ
جب [illegible] ب ابھی زنانے میں ہی ہوتے تو
مجھے اندر [illegible] بلا لیا کرتے تھے۔ جہاں میں جا کے بیٹھا
[illegible] کے عین مقابل ایک کھڑکی تھی۔ جو
[illegible] نے میں کھلتی تھی۔ اس پر ہمیشہ ریشمی پردا
پڑا رہتا [illegible] کبھی اس پردے کا ارتعاش اور کبھی
ایک دست [illegible] کی جھلک میرے مضطرب دل کے
[illegible] باعث ہو سکتی تھی۔ کہ رضیہ بھی میرے
سوزِ دل سے [illegible] ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں شام کے وقت محمد علی صاحب کے ہاں گیا۔ تو وہ موجود نہ تھے۔ میں اندر کمرے میں بیٹھ گیا۔ اور ان کا انتظار کرنے کا بہانہ کر لیا۔ کہ شاید اس عرصے میں کچھ نظر آ جائے۔ مجھے ابھی بیٹھے ہوئے بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ کہ میں نے دیکھا کہ زنان خانے کی طرف سے رضیہ چلی آ رہی ہے! اُس نے میرے کمرے کے آگے پہنچ کر رفتار دھیمی کر دی یا کم از کم مجھے تو یہی معلوم ہوا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ گویا کسی نے میرے ہاتھ پاؤں کو جکڑ دیا ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا بے تکلف گون پہنے ہوئے تھی۔ جوگیئ رنگ کا، بس ایک پری، جوگن کے بھیس میں معلوم ہوتی تھی۔ وہ بھرے بھرے بازو، جیسے سنگ مرمر کی مورت، وہ لباس کی سادگی جس میں ایک پھول کی گنجائش بھی نہ تھی۔ میں تڑپ گیا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ شاید میں بہت بیتاب ہو گیا تھا۔ یا اپنے ہوش میں نہ تھا۔ بہر حال میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اور اسے زبردستی اندر لے آیا۔ اُس نے بھاگنا چاہا۔ اس طرح جیسے کوئی خوفزدہ بچہ کسی ہیبتناک شے کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ مگر میں نے اس کے ہاتھ مضبوط تھام رکھے تھے۔ اب میں نے تقریر شروع کی۔ نہیں معلوم اس وقت میری زبان میں وہ درد و شور کہاں سے آ گیا تھا۔ گویا ایک دریا تھا۔ کہ موجیں مار رہا تھا۔ فراق، انتظار، شوق، آرزو، امید، یاس یہ سب جذبات الفاظ کا لباس پہن پہن کر میری زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ میں سراپا قوتِ گویائی تھا۔ اس کے حسن عالم آشوب کا بیان، اپنی بیتابی، عشق، جنون، شوق

نازآفرینی، ناز برداری؛ یہ سب باتیں بہت بے تکلفی اور
سلاست سے بیان ہو رہی تھیں۔ معلوم نہیں کہ میرے
ان فقرات میں کوئی ترتیب یا موزونیت تھی یا نہیں۔
ہاں اتنا جانتا ہوں کہ دلکش اور فصیح ضرور تھے۔ خدا جانے
مَیں اس عالم میں کیا کیا کہہ گیا۔ اور کیا کچھ بک گیا۔ اتنا
کہہ چکا تو ہاتھ پھیلا دئے، گویا رضیہ کو سینے سے لپٹانا
چاہتا ہوں۔ مگر اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک دیا اور
میری طرف کڑے تیوروں سے دیکھا۔ مجھ پر ایک ایسی
تیز نگاہ ڈالی کہ مَیں جل بھُن کر خاک ہوگیا۔ رعب حسن کی
دورباش کوسوں پرے پھینک دیتی ہے۔ مجھے بھی
ہوش آگیا۔ اب مَیں منفعل کھڑا تھا۔ اور وہ مجھے تیز
تیز نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ مگر ان اشاروں میں بھی
وہ رقیق جذبات ادا ہو رہے تھے۔ کہ نہ کسی قلم سے
لکھے جا سکتے ہیں۔ نہ کسی زبان سے بیان ہو سکتے ہیں،
آخرکار اُس نے کہا۔ "کیا مجھے رسوا کروگے"

مجھے پھر جرأت ہوئی، مَیں نے کہا " رضیہ، مَیں
مرد ہوں، مَیں رُسوائی سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصد کی
طرف راہی ہوں، ایسا کرنا میری فطرت میں داخل ہے
تم مجھ سے بگڑو نہیں، بیشک یہ انتظار کا لطف چند
روزہ ہے۔ کہ اب کوئی دن میں پانسہ اِدھر ہو جائیگا یا
اُدھر، خوش نصیبوں کو ہی یہ لذت نصیب ہوتی ہے۔
جب تک مشکلیں نہیں پڑتیں محبت کی گتھیاں نہیں
سلجھتیں۔ مگر اب مجھ میں بالکل تاب نہیں رہی یا تو
ملاقات کی کوئی سبیل نکالو، یا مَیں جان دیدونگا"

رضیہ نے جواب دیا۔ "مَیں کیا کرسکتی ہوں بھائی جان
کو ہر طرح کا اختیار ہے" اور یہ کہکر بجلی کی طرح کوند کر
کمرے سے باہر نکل گئی۔

. . . . . .

اس کے دوسرے دن مَیں نے محمد علی صاحب سے
رضیہ کی نسبت بات چیت شروع کی۔ مگر جیسا کہ مَیں
پہلے کہہ چکا ہوں۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت گیر
واقع ہوئے تھے۔ اُنھوں نے مجھے صاف جواب دیدیا۔
مَیں ان کے گھر سے نکلا تو عجیب حالت تھی۔ دل و دماغ
پر ایک مدہوشی کا پردہ مسلط معلوم ہوتا تھا۔ باہر بہت
زور سے بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کا جھکڑ قدموں کو اکھاڑے
دیتا تھا۔ اور مَیں وہاں اس طرح کھڑا تھا۔ جیسے کوئی
خواب میں کھڑا ہو۔ مجھے نہ مینہ کے خوفناک چھینٹوں
کی پروا تھی نہ ہوا کے طوفان کی، آسمان پر بادل
چھائے ہوئے تھے۔ سیاہ بادل پہاڑ کے پہاڑ جمع
ہو رہے تھے۔ اس حالت میں بجلی کی طرح واقعیت
اپنی پوری قوت کے ساتھ میرے دماغ میں چمکی، وہ
روح فرسا خیال، کہ دُنیا کا میرے لئے خاتمہ ہو گیا

ی، مسرت، شادمانی اور وہ تمام ولولے جن پر زندگی منحصر ہے، تمام ہو چکے۔ امیدیں خاک میں مل گئیں میرے لئے اب [illegible] رہا۔ وہی بیکار و بے حرفہ مشغولیتیں۔ رونا دھونا [illegible] ینا اور سو رہنا۔ اب دراصل زندگی باقی نہ رہی تھی۔ زندگی کا پرتو رہ گیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ درختوں کی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ تند ہوا [illegible] میں سائیں کرتی ہوئی میرے کانوں کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی پوری بے بسی اور بیکسی کا احساس ہوا۔ میں اس خیال میں تھا کہ [illegible] اپنی باقیماندہ حیات میں کونسا اسلوب اختیار کروں [illegible] و مسرت کے دن، وہ تخیّل کا ابھرا ہوا [illegible] جوانی کی راتیں گذارنا ایک جوش آیند [illegible] تھی [illegible] رہی۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ عشق و محبت کی ناکامی [illegible] سب نے مل کر تاخت کیا۔ آنسو ابل پڑے [illegible] حلق خشک ہونے لگا۔ سر میں شدت کا درد محسوس ہوا مگر میں وہاں بیٹھا رہا۔ مجھے یہ بات معلوم نہ تھی کہ میں سردی سے کانپ رہا ہوں، کہ میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ [illegible] تاریکی کے عالم میں کب تک بیٹھا رہا ہوں اور کب [illegible] گھر گیا ہوں۔ ہاں اس کے بعد پھر مجھے صحت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی رات کے بخار نے

صاحب فراش کر دیا۔ اور وہی بخار رفتہ رفتہ تپ دق میں تبدیل ہو گیا۔

اس کے بعد میں پھرتا رہا۔ اپنی صحت سے بے پروا ہو کر پھرتا رہا۔ نئے نئے مناظر اور انوکھی دلچسپیوں کے درمیان رضیہ کو بھلانے کی کوشش کی مگر ناکام، اسی دوران میں مجھے اس کا ایک خط اور اس کا آخری خط موصول ہوا ہے۔" (یہاں اصغر نے اپنی جیب میں سے ایک خط نکالا اور مجھے دیدیا)

میں نے خط کو کھولا، صاف، سادہ کاغذ تھا۔ جس میں ایک ہلکی سی خوشبو ابھی تک باقی تھی۔ لکھا تھا۔

"آخرکار میری خانماں بربادی کا دن قریب آگیا۔ پرسوں ایک محض اجنبی شخص مجھے اپنی جائز بیوی سمجھ کر لے جائیگا۔ اصغر، کاش میں تمہیں اس وقت محسوس کرا سکتی کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے، میری زندگی محض تمہارے لئے خلق کی گئی تھی۔ اور تمہارے ساتھ ہی ختم ہو جائیگی۔ محبت سے پہلے انسان کو اپنی حیات کی پروا نہیں ہوتی۔ بحر کائنات میں اس کی کشتی بھی اپنا سفر کرتی ہے۔ لہریں اٹھتی ہیں طوفان آتے ہیں۔ مگر انسان کا دل غیر متزلزل رہتا ہے۔ ہر ایک شے دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہے۔ گرد و پیش کی اشیاء ایک بے معنی زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں پھر حیات عاشقہ

کا دور یک بیک شروع ہو جاتا ہے۔ نقاب پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اور درد، سوزش، جلن، ہر ایک کے اصلی مفاہیم سے دل آشنا ہو جاتا ہے۔ انسان گویا نئی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ بھی ہُوا۔ جب تک میری زندگی میں تم داخل نہ ہوئے تھے۔ میرے لئے کوئی شے دلچسپ اور دلفریب نہ تھی۔ تمہیں دیکھتے ہُوئے مجھے پوشیدہ جذبات کا احساس ہونے لگا۔ ہر چیز کی ماہیت سمجھ میں آنے لگی۔ دورانِ خون میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ایک نیا منظر پیشِ نظر ہو گیا۔ ایک خاص لذّت، ایک خاص اضطراب ہر وقت دل کو بیتاب کرنے لگا۔ آہ! کاش مجھے وہ لذّت نصیب نہ ہوتی، آج اُس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی حرام ہے۔ اور یہ بھی جی نہیں چاہتا کہ کسی اور کو مجھ پر کسی قسم کا اختیار حاصل ہو۔ سوچ سوچ کے صرف ایک طریقہ نکالا ہے۔ اپنی وفادار بوا کے ہاتھ آج زہر منگا لیا ہے۔ یہ خط بند کر رہی ہوں۔ اور اسے پھانک رہی ہوں۔ خدا میرے اس گناہ کو معاف کرے۔"

مَیں پڑھ چکا تو خط اصغر کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے مسکرا کے کہا۔ "آہ، وہ عورت تھی۔ مگر کتنی بلند نظر عورت، اس نے اپنی زندگی کو جب چاہا منقطع کر لیا۔ مَیں مرد ہوں۔ اور پھر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر رہا ہوں۔ اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ مگر کس شرمندگی کے ساتھ، اس کا مُسکراتا ہُوا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ وہ ہنس رہی ہے۔ مگر اس کی ہنسی میں ایک محن آمیز مسکراہٹ چھپی ہوئی ہے۔"

اس وقت مجھے تاب نہ رہی۔ مَیں نے اصغر کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اور اس سے لپٹ گیا۔ وہ نحیف آواز میں کچھ کہتا جا رہا تھا۔ اور مَیں! میں، بچوں کی طرح اس کی پائینتی پر سر رکھے ہُوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ مدت سے دل بھرا ہُوا تھا۔ آج زخموں پر نمک چھڑکا گیا۔ آخر انسان تھا۔ تاب نہ رہی، ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔ تھوڑے عرصے کے بعد مَیں نے سر اُٹھایا، تو اصغر کی رُوح اس قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، اور وہاں جا چکی تھی، جہاں نکہت ہے، موسیقی ہے بہار ہے، نغمہ ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ رضیہ ہے، مگر کلفت و رنج کا نام تک بھی نہیں۔

سیّد عابد علی عابد

کلام صولت

(۱)

رنام گذشتن ہمہ نام ست اینجا | دست از کام کشیدن ہمہ کام ست اینجا
ت عشقیم جفا را شناسیم ز لطف | گردشِ ہفت فلک گردشِ جام ست اینجا
نم خم بکش، و نغمہ شکرانہ بسنج | کہ ہمہ عشرت کونین تمام است اینجا
باند از میالائی بر ما واعظ | دور کفر ست با سلام سلام ست اینجا
آغاز سرافرازی انجام بود | یا بد آں پایہ یوسف کہ غلام ست اینجا
ب و بد را گلے از گلشنِ وحدت وانیم | گلہ از جور فلک شکوۂ عام ست اینجا
رخوشم از مے عشق خم ابروے کسے | دم شمشیر ہمانا خط جام ست اینجا

نرود از دل ما مصرع طالب صولت
"شعلۂ طور کمند افگن بام ست اینجا"

(۲)

ہے ز خار رہت گل بجیب آبلہ ہا | عبیر خلد بکوسے تو گرد قافلہ ہا
راہِ شوق ترا بسپرد کہ دشوار است | نگاہِ داشتنِ دِل زنار مرحلہ ہا
یاد زلف تو اندر کشاکشم چو نفس | مداں کہ ہست قرارم بہ بند سلسلہ ہا
وی کہ مرا می برد دل بیتاب | برنگ ریگ روان ست خون قافلہ ہا
بدامنش ہمہ گلہاے بوستانِ وفا | بمن نگار داگر آں نگار من گلہ ہا
چو وادی ست محبت کہ در نخستیں گام | چو نقش ہاے فرو ماند پاے راحلہ ہا
ور گرمی حسن تو بتواں افروخت | برنگ آتش سوزاں ز آب مشعلہ ہا
چگونہ جاں بسلامت برودلم صولت | زوادیٔ کہ زند راہ ناز مرحلہ ہا

اقبال جرم

اشرف منزل

۲ بجے شب

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ تمام عالم میں سکوت کا دور دورہ ہے۔ رات کی سیاہی تمام کائنات کو اپنے دامن میں چھپاتے ہے۔ میں تنہا بے یار و مونس اپنے کمرہ میں پڑا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں لیکن نیند نہیں آتی اُٹھتا ہوں ٹہلتا ہوں سوتا ہوں لیکن نیند کا خیال تک نہیں کتاب کے چند اوراق پڑھتا ہوں کہ شاید دماغ کو تھکا کر نیند لائیں۔ لیکن بیکار دل میں ایک اُلجھن ہے کوئی چیز ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ظاہر ہو نہ اس کا سبب معلوم ہوتا ہے نہ اس سے نجات ملتی ہے۔ میں نے بارہا تاریک راتیں تنہا اس مکان میں بسر کیں۔ لیکن آج تک یہ اُلجھن خلش اور یہ اضطراب پیدا نہیں ہوا بلکہ مجھے راحت آرام۔ اطمینان اور سکون کی دولت ملی لیکن آج خلاف معمول ایسا نہیں ہے، آخر کیوں ؟

مئی ۱۹۱۸ء سے مجھے طاہرہ سے محبت ہے میں نے جب پہلے پہل اسے دیکھا تو اگرچہ میری بہت سی تمناؤں کا خون ہُوا میری بہت سی حسرتیں گھٹ کر مر رہیں اور بہت سی آرزوئیں ہمیشہ کے لئے سینہ میں فنا ہو گئیں۔ لیکن پھر بھی اس کی نیکی اس کی حیا۔ اس کے معصومانہ انداز اس کی شرافت اور سب سے آخر اس کی سچی محبت نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ جب کبھی وہ مجھے کسی کشمکش میں دیکھتی تو وہ خود مجھ سے زیادہ پریشان ہو جاتی بارہا میرے صرف بناوٹی مکارانہ یا مذاقیہ جملوں نے اس کے خوبصورت رُخساروں پر چند موتی دیکھے ہیں۔ جب کبھی میں گھر پر ہوتا اور اُس سے نہ ملتا تو وہ بہت مغموم ہوتی۔ اس لئے نہیں کہ میں نے یہ بے اعتنائی کیوں کی بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ یہ احتراز کہیں میری وجہ سے نہ ہو۔ جب میں ملتا تو وہ گھنٹوں اسی کی جستجو میں رہتی۔ میرے ایک ایک لفظ پر غور کرتی اور جب اس کو معلوم ہو جاتا کہ یہ صرف میری جوانی کی لاپروائی تھی تو آہ سرد بھر کر رہ جاتی۔

میں نے اسے پڑھانا چاہا وہ راضی ہو گئی اور ایک قلیل عرصہ میں خاصی اُردو اور کچھ انگریزی و فارسی بھی سیکھ گئی۔ میں نے اسے پُر جذبات خطوط لکھے، ناول پڑھ کر سنائے اشعار کے مطالب سمجھائے۔ حسن و عشق کی داستانیں کہیں۔ وہ سب سُنتی لیکن اس کا مصرف [illegible] سمجھ سکا کہ آخر اس

کا کیا مطلب ہے اس کی تمام دُنیا ہیں اور نہایت فخر سے کہتا ہوں کہ میں تھا مجھے جہاں ایک طرف اس کی اس ...بے حسی پر غصّہ آتا تھا۔ وہاں اس کی سادگی پر رحم اس ...کی ...بے ...پر پیار آتا تھا۔

...ہاں میرے ساتھ اور بہت سی بدقسمتیاں تھیں ...ں ایک یہ بھی تھی کہ میں ماں کی محبّت بھری نظر سے ...وم تھا۔ لیکن ایک خاتون جس کو میں ان کا عوض اور البدل سمجھتا تھا میری تمام خوشیوں کے لئے موت ...یری تمام آرزوؤں کے لئے ہلاکت اور میری تمناؤں کے ...ئے قضا ثابت ہوئی۔ گھر میں بارہا ایسے واقعات پیش آتے جن سے مجھ کو روحی تکلیف پہنچی۔ لیکن میں نے صرف ...ن ظن کی وجہ سے اس کے اچھے معنے پہنائے۔ میں نے ...کھا۔ کہ اس نے میری مرحوم بہنوں کو کوسا' گالی دی اور ...ا۔ لیکن میں نے اسے برداشت کیا۔ میں نے خود بارہا ...پنے کو اس کی ملامت کا نشانہ بنایا' بارہا مجھے اس کے لئے بھوکا رہنا پڑا۔ اور اکثر میں تنہائی میں بیٹھ کر رویا۔ لیکن پھر بھی میں نے اس کی عزّت و حرمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا ...گر آہ صد آہ۔ شادی کے بعد سال بھر تک طاہرہ اس کی پیاری بہو رہی اس کے لئے قسم قسم کے کپڑے آتے زیور ...بنے اس کی تعریفیں ہوتیں اور یہاں تک تھا کہ اگر کسی دن طاہرہ سے ملنے میں نہ جاتا تو وہ مجھ پر خفا ہوتی۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ یہی گل خار یہی نور نار اور یہی رحم ستم اور یہی کرم ظلم ہو جائیگا۔

۱۹...ء جہاں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ وہاں میرے روزنامچہ میں بھی ایک فصل شروع ہوتی ہے۔ آہ "یہ کوئی فصل نہ تھی۔ بلکہ ایک انقلاب تھا۔ اور خوفناک' خوفناک تھا۔ اور موت سے بدتر اور دوزخ کے تصوّری تکالیف سے زاید سخت' یکایک اس کی توجہ طاہرہ کی طرف سے پلٹی۔ پلٹی اور بُری طرح پلٹی۔ وہ محبت عداوت سے' وہ پیار نفرت سے' اور وہ اُلفت دُشمنی سے بدل گئی۔ جہاں ایک طرف یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص طاہرہ کی بُرائی کرتا تو وہ ایک شیرنی کی طرح بپھرتی۔ لیکن اب کیا تھا ایک حیرت انگیز تغیر۔ اس نے خود اس کی شکایت شروع کی۔ اب سراپا خوبی طاہرہ مجسم بُرائی تھی۔ بارہا اس نے پیاری طاہرہ سے مجھ کو برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ اوّل اوّل میں اس کے مکر و فریب کا شکار ہو گیا۔ لیکن جب واقعات معلوم ہوئے تو خود ہی شرمندگی سے گردن جھکا دینی پڑی۔ اس کے بعد میں نے بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا شروع کیا۔ میں نے بارہا طاہرہ۔ بے قصور طاہرہ۔ معصوم طاہرہ پر دباؤ ڈال کر اور اب اقرار ہے کہ ناجائز دباؤ ڈال کر اس سے معافی منگوائی۔ اس کے سامنے ہاتھ جڑواتے۔ اور خدا معلوم اپنی

کمزوریوں کی وجہ سے اور کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن آفتاب ہمیشہ بادل میں چھپا نہیں رہتا۔ مجھے اب تمام شکایات کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ اور میں جو کچھ وہ کہتی تھی۔ سرتاپا غلط سمجھتا تھا۔ لیکن میرا دل لڑکپن سے اس سے اتنا خائف تھا۔ کہ کبھی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ کہ صاف صاف اس کی باتوں کی تردید کر دوں۔ یا اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دوں اور میری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اس نے آج ایک حکم سے نادر شاہی حکم سے ایسا کر دیا ہے کہ دو بج چکے ہیں۔ لیکن نیند کا نام نہیں گھر میں ہوں معصوم طاہرہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اتنی ہمت نہیں کہ اس کے پاس جا سکوں۔ میرا دستور تھا کہ میں جب کبھی تعطیل کے اختتام کے بعد کالج جاتا تو طاہرہ سے رُخصت ہو لیتا لیکن گذشتہ جولائی میں ایسی بے سروسامانی سے گھر سے نکالا گیا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت جب کہ برسات کی گرمی اپنی پوری قوت کے ساتھ تمام جینے والی جاندار ہستیوں کو پریشان کئے ہوئی تھی۔ مجھے ۹ میل پیدل چلنا پڑا اور اتنا بھی موقع نہ ملا کہ میں اپنی پیاری طاہرہ سے مل سکوں۔ اُس بیچاری کو کیا خبر کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے دوسری رات بارہ بجے تک میرا انتظار کیا آخر مایوس ہو کر سو رہی ہے۔ صبح کو اسے میرے جانے کا حال معلوم ہوا۔ حسب عادت ڈری کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ اس کا خط گیا۔ خط سرتاسر خوف و شکایت سے بھرا تھا۔ لیکن میں نے اسکی تسکین کر دی۔

جولائی کے واقعہ کے بعد میرا ارادہ تھا کہ [illegible] مکان نہ جاؤں۔ چنانچہ اکتوبر میں میرے دوست و برادر ہم کی شادی ہوئی لیکن میں نہیں گیا۔ اور سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ میری انجمن کا سالانہ جلسہ تھا۔ جس کو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اور [illegible] نائب ناظم تھا۔ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میرے [illegible] چچا محبت و احسان والے چچا کے یہاں شادی [illegible] کا اصرار دوسری طرف تھا۔ طاہرہ کی محبت تیسری طرف اور حب الوطنی کا جذبہ چوتھی طرف ان تمام چیزوں نے [illegible] کیا کہ ٹھیک اس وقت ہفتہ کے لئے گھر آیا۔ [illegible] ۵۰ گھنٹہ ریل کے سفر میں کیا کیا کچھ نہ سوچا کبھی [illegible] کی محبت کا تصور ہوتا۔ اور کبھی پیاری معصوم طاہرہ کی صورت سامنے ہوتی۔ خیال تھا کہ اس کے ملنے کے بعد اس سے گذشتہ غلطی کی معافی مانگ لونگا لیکن کیا معلوم "من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال" گھر پہنچکر سب سے پہلے جس صورت پر نظر پڑی وہ اُسی کی تھی جس کے احسانات میں گنا چکا ہوں۔ اور جو خطرہ میرے دل میں اس کے [illegible]

نِکلا یعنی اُس نے کہا کہ دیکھو آجتک تم سے کبھی کوئی بات نہیں کہی لیکن آج کہتی ہوں۔ وُہ بات ایسی تھی جِس نے میرے ہوش وحواس گم کر دئے۔ سچ کہتا ہوں ایک بجلی تھی۔ جو گری اور اس نے میری دل کی امید کو جلا کر خاکسیاہ کر دیا۔ اُس نے کہا اور اف نہایت ہی خوفناک لہجے میں کہا۔ کہ "طاہرہ سے نہ ملو۔ اور صرف آج ہی نہیں بلکہ"

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا میرے دل و دماغ پر کیا اثر پڑا دیر تک حیران رہا۔ جب کچھ سوچنے کے قابل ہُوا تو دیکھا کہ گھر میں صرف مَیں ہوں اور ایک بڑھی اندھی خادمہ، لوگوں نے مجھے خلاف معمول سُست دیکھا کیونکہ مَیں سب سے زیادہ زندہ دل مشہور ہوں۔ لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے اس کا نتیجہ نکال لیا۔ شام تک بارات کی تیاری میں رہا۔ دن بھر کا انتظار کرنے کے بعد دس بجے طاہرہ کی دائی آئی۔ اس نے مجھے دعوت دی۔ شوق بلا چل لیکن ہمت نے جواب دیا۔ پھر بھی صاف انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ اور دفع الوقتی کے خیال سے کہدیا کہ اچھا تمام مراسم ختم ہولیں۔ تو آنا ساڑھے گیارہ بجے تمام مراسم ختم ہوئے۔ اور وہ پھر بارہ بجے آئی۔ مَیں اپنی کمزوری سے خوب واقف تھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا۔ کہ اگر آج مَیں طاہرہ سے ملنے گیا۔ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں کوئی جواب سمجھ میں

نہ آیا۔ ایک طرف شوقِ ملاقات تھا۔ دوسری طرف ایک خونخوار قاتلہ کی غضبناک آنکھیں اس کی گالیاں اس کے غلط دفاترِ شکایت۔ لیکن پھر بھی ہمت کی ٹوپی سر پر رکھی۔ شال بدن سے لپیٹا۔ اور ارادہ کیا۔ کہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہُوا۔ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم روانہ ہُوا۔

لیکن افسوس اس مرتبہ پھر کمزور دل نے ایک عورت سے ڈرنے والے دل نے دھوکا دیا۔ اور مَیں یک بیک قسم کھا بیٹھا کہ خدا کی قسم نہ جاؤنگا میری قسمت کے آخری نوشتہ پر مہر لگ گئی۔ اس کے بعد ایک دوست ہارمونیم لے آئے۔ دوسرے نے گانا شروع کیا۔ مَیں مشرقی شعرا کی خیالی پرواز کا مخالف تھا لیکن آج ہجر وفراق درد والم۔ کرب و بلا دوری ومجبوری بےبسی وبیکسی کے جتنے مضامین تھے وہ سب صحیح حرف بہ حرف صحیح اور اپنی واردات معلوم ہوتے تھے۔ ایک صاحب نے حافظ کی وہ غزل شروع کی جس کا مطلع یہ ہے"

اے نسیم سحر آرام گہ یار کجاست
منزل آں مہ عاشق کش عیار کجاست

اس کا ایک ایک لفظ تیر ونشتر بن کر دل کے پار ہو رہا تھا۔ لیکن جب وہ اس شعر پر پہنچے" — حسرت
بادہ ومطرب وگل جملہ مہیاست ولے۔ عیش بے دوست مہیا نشود یار کجاست

تو میں اپنے قابو میں نہ رہا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور
یہ بہانہ کر کے کہ سفر کا تھکا ماندہ کئی راتوں کا جاگا ہوا آیا ہوں
چلا آیا یہاں آکر پہلے دل کھول کر رو دیا۔ پھر کوشش کی کہ
سو جاؤں۔ لیکن آج فراق یار میں نیند کو بھی نیند آگئی ہے
دل میں ایک درد ہے۔ ایک ٹیس ہے اور اس احساس
کی تکلیف ہے کہ میں نے فضول بلا وجہ بغیر سبب
جنس لطیف کی سب سے زیادہ لطیف جنس، اپنے جان و
ایمان کی ملکہ اور دنیا کے نازک سے نازک، سریع الحس سے
سریع الحس، درد مند سے درد مند اور معصوم دل کو صدمہ
پہنچایا۔ میں نے اپنے ساتھ کسی اور کی بھی سینکڑوں حسرتوں
اور ارمانوں کا خون کیا کیا وہ میری غلطیوں کو معاف
کر دیگی نہیں ہرگز نہیں۔

دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

میرا دل، میرا ضمیر، میری روح مجھ پر لعنت بھیج رہی
ہے۔ اس تنہائی میں اور ہاں اس تاریک تنہائی میں
حق تلفی ظلم اور ہلاکت کا خوفناک دیو مجسم مجھے سامنے
نظر آ رہا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ وہ میرے سینے کو زور زور سے پیٹ رہا ہے۔ ڈر کر
آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ اللہ رحم کرے۔

طاہرہ! میں اپنی روح کی تکلیف سے محسوس کرتا
ہوں۔ کہ تجھے بھی تکلیف ہوگی۔ لیکن اس کا اندازہ نہیں
میں نے اگر ایسا کیا تو مجھے اس کی سزا بھگتنی چاہیے۔ لیکن آہ
تو محبت مجسم سراپا الفت پریم کی دیوی آج کی رات صرف
ایک کمزور ظالم ذلیل ہستی کے اعمال کی وجہ سے کس دکھ و کرب
میں کروٹیں بدل بدل کر کاٹ رہی ہے۔ اور تیری معصوم
روح دنیا کی تمام کائنات اور ایمان کے فرشتے مجھ پر لعنت
بھیج رہے ہیں۔ آہ دنیا میں کوئی مجھ سا بدبخت ہوگا

پیاری! میں تجھے معصوم سمجھتا ہوں۔ میرا دل گواہی
دیتا ہے کہ تو بے گناہ ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے [illegible]
اور تیری ننھی جان پر سراسر ظلم ہے۔ [illegible] مجھے [illegible] کہیں
میری مرحوم بہن کی طرح تو بھی [illegible] شاد
نہ ہو جائے۔ لیکن اس میں سب سے بڑا فقرہ [illegible] ہے
خدا تیری کمزوریوں کو دور کرے۔ محبوبہ مظلوم! [illegible] دست بستہ
تیرے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ خدا کے لئے معاف کر دے
آہ میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیج رہا ہے۔ وہ دیکھو [illegible]
لعنت کی صدا اٹھی۔ خدا کے لئے مجھ کو تیر[illegible]
مجھے معاف کر دے . . . .

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور رات کی تاریک
خوفناک ساعتیں جلد جلد گذر رہی ہیں۔ تم [illegible]
گھر جا چکے ہونگے۔ گھر میں رہ کر غریب الوطن [illegible] طاہرہ
کے پاس رہ کر اس سے دور الگ بے یار [illegible]
بدل رہا ہوں۔ رات کی سیاہی تو گواہ رہ کر [illegible]

طاہرہ کے لئے ہے۔ ستارہ شاہد رہو کہ یہ اضطراب صرف طاہرہ کے لئے ہے

لیکن آخر کوئی اس کا حل بھی ہے۔ بارہا اس سے بڑے بڑے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ لیکن میرا دل ایسا بیٹھا نہ تھا۔ میری رُوح ایسی افسردہ نہ تھی۔ میرے ہاتھ پیر ایسے سرد نہ تھے۔ میرا دماغ ایسا معطل نہ تھا اور مَیں خود ایسا مایوس نہ تھا لیکن اس مرتبہ نہ معلوم کیا ہے۔ تمام دُنیا تاریک معلوم ہوتی ہے۔ زندگی صرف مصائب و آلام کا ایک سلسلہ ہے۔ تو پھر اس قیدِ غم سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان اس بندِ حیات اس رشتۂ زندگی کو توڑ ہی کیوں نہ ڈالے سامنے کے کمرہ میں چچا کا دواخانہ ہے وہاں ہر قسم کی زہریلی دواؤں سے بھری ہُوئی شیشیاں موجود ہیں کیا مجھ کو ان شیشیوں سے مدد لینی چاہیے۔ مگر آہ . . . . طاہرہ کی بیوگی!

معین

رشحاتِ محوی

وہ غم دِئے کہ خاک میں مجھ کو ملا دِیا
میری وفا کا آپ نے اچھا صلا دِیا

آغازِ عشق میں وہ فریبِ دغا دِیا
خود اپنی زندگی کو کسی نے مٹا دِیا

ساقی کی چشمِ مست نے کل کیا مزا دیا
محفل میں بے پئے مجھے بیخود بنا دِیا

بیزار اس وفا سے نہ ہووے تو کیا کرے
ٹوٹی امید بھی تو نہ کچھ آسرا دِیا

کیا پوچھتا ہے چارہ گر انجامِ آرزو
اِک نقش تھا کہ ہم نے بنا کر مٹا دِیا

دیتا ہوں جان ہائے اس اندازِ خاص پر
دیکھا مجھے تو پھیر کے مُنہ مُسکرا دِیا

وہ میرا ضبطِ غم ہے، ترا شیوۂ جفا
جس نے تمام ولولۂ دِل بجھا دِیا

آتا ہے کوئی گورِ غریباں میں اس طرح
دامن اُٹھا لیا، کبھی آنچل گرا دِیا

دیتا ہوں میں دُعا تجھے اے مرگِ بیکسی
تو نے امید و یاس کا جھگڑا مٹا دِیا

رو رو کے چُپ ہُوا تھا ابھی محویِ حزیں
لو پھر کسی کی یاد نے اس کو رُلا دِیا

مینا

از بابو کشیرود چندر چٹرجی ——— مترجمہ و ممثلہ حکیم احمد شجاع بی۔ اے

دُوسرا باب

پہلا منظر

بنائے بھوشن متر کا دفتر

ھدایات :- بنائے اور سریش آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور سگرٹ پی رہے ہیں

سریش۔ مگر اس بات کی تو مَیں ضرور تعریف کرونگا کہ تم نے مس گنگولی کو اس قدر جلد بُھلا دیا۔

بنائے۔ سچ سچ پوچھتے ہو۔ . . . . . مَیں اندو کو ابتک نہیں بُھلا سکا۔

سریش (کچھ حیران ہوکر) تو پھر تم نے شادی کرنے میں ایسی جلدی کیوں کی۔

بنائے۔ مَیں نے صرف ایک اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔ مَیں اس ذلیل بدمعاش ناگن بوس کو کبھی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ کہ وہ مینا کی سی بھولی لڑکی کی زندگی کو برباد کر دے

سریش (سوچتے ہوئے) تو تم نے ایک بُرائی کا علاج ایک دُوسری بُرائی سے کیا ہے۔ اب کیا ہوسکتا ہے [illegible]

بنائے (فوراً) نہیں سریش مَیں مینا سے محبت [illegible] سے بھی زیادہ محبت کرونگا۔

سریش۔ مگر بنائے ان دونوں محبتوں میں بڑا فرق [illegible] مینا بہت عقلمند ہے۔ وہ اس ظاہرداری کے پردے [illegible] حقیقت کو دیکھ لیگی۔

[سریش کی نظر البم پر جا پڑتی ہے]

بنائے تم کتنے بیوقوف ہو۔ تمہاری شا[illegible] اس البم کو یہاں نہ رہنا چاہئے۔ تم عورتوں کی طبیعت سے واقف نہیں۔

بناتے (البم کو اُٹھاتے ہوئے) لو میں اسے بند کئے دیتا ہوں۔ ابھی ابھی اسے میں نے ذرا دیکھنے کو نکالا ہے۔

[میز کے دراز میں رکھ کر اسے بند کر دیتا ہے]

سریش۔ میرے خیال میں تو تمہارے گھر میں اس کی موجودگی ہی اچھی نہیں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے میں اپنے پاس رکھوں۔

بناتے۔ جب تمہاری شادی اندو کے ساتھ ہو جائیگی تو میں اسے تمہیں دے دونگا

سریش۔ دیکھ [illegible]

[illegible] میں نہیں کھلی جاتی

بناتے۔ اوہ، یہ تو ایک معمولی بات ہے۔

سریش۔ یہی معمولی باتیں بڑھتے بڑھتے بہت اہم ہو جاتی ہیں۔ تم اس البم کو مجھے دیدو۔

بناتے (مُسکرا کر) تو یہ کیوں نہیں کہتے تمہیں اندو سے محبت ہو گئی ہے۔ سچ سچ کہو سریش، ہے نا؟

سریش (بڑی متانت سے) جس دن سے میں نے اندو کو دیکھا ہے۔ اسی دن سے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ مگر بناتے، میں نے عہد کر لیا تھا۔ کہ جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائیگی میں اس کا ذکر تک نہ کرونگا۔

بناتے (مُسکرا کر) تو خیر تمہیں اس عہد پر قائم رہنے کیلئے کچھ ایسی تکلیف برداشت کرنا نہیں پڑی۔ اب تو میری شادی ہو چکی ہے۔ تم بھی اندو سے شادی کا سوال کر دو۔

سریش۔ مجھے اس کے دل کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے خُدا جانے وہ مجھے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں؟

بناتے۔ یہ بات تو بینا اچھی طرح معلوم کر سکتی ہے۔ عورتیں اپنے راز عورتوں سے نہیں چھپایا کرتیں۔

سریش۔ مگر مجھے عورتوں کی قوت فیصلہ پر اعتماد نہیں وہ ہر معاملے میں بہت جلد رائے قائم کر لیتی ہیں۔ ہاں اگر تم یہ خفیہ [illegible] تو میں بہت ممنون ہونگا۔

بناتے۔ [illegible] اچھا۔ میں اندو سے اس کے خیالات معلوم کر لونگا۔ غالباً وہ مجھ سے سب کچھ کہہ دیگی۔ (اُٹھکر) لو آؤ ذرا ہوا خوری کر آئیں۔ بیٹھے بیٹھے جی اُکتا گیا ہے۔

سریش۔ نہیں بھائی میں تمہارے ساتھ نہ جاؤنگا۔ مسز متر خفا ہو جائیں گی۔ اب تمہارے وقت پر اُنہیں کا حق ہے۔

بناتے۔ اجی نہیں وہ تو مکان کی آراستگی میں اس قدر مصروف ہیں کہ اُن کو خفا ہونے کی بھی فرصت نہیں۔

سریش۔ تو چلو۔

[جاتے ہیں، بینا دوسرے دروازے سے داخل ہوتی ہے]

بناتے (سوچتے ہوئے) میرا خیال غلط تھا۔ ان کو اندو سے محبت نہیں۔ نہ اندو کو ہی ان سے محبت ہے اگر اسے محبت ہوتی تو وہ ان کی شادی ہی مجھ سے کیوں ہونے دیتی

اندو یقیناً سریش بابو کو چاہتی ہے۔

[اس کی نظر کنجیوں پر جا پڑتی ہے]

اوہ اپنی کنجیاں تو یہیں بھول گئے۔ کتنے بے پرواہ ہیں۔ مگر یہ کنجیاں ہیں کیسی۔ گھر بھر کی کنجیوں کا گچھا تو میرے پاس ہے وہ ایسا کونسا قیمتی خزانہ ہے جس کی کنجیاں وہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس میز کے دراز کو کھول کے تو دیکھوں اس میں کیا رکھا ہے۔ . . . .

[کنجیاں لیکر میز کی طرف بڑھتی ہے پھر کچھ سوچکر رک جاتی ہے]

جانے بھی دو مناسب نہیں۔

[کنجیوں کے گچھے کو اچھال اچھال کر سوچتی ہے اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر کنجیوں کو باری باری دراز کے تالے میں لگاتی ہے تالا کھل جاتا ہے اور وہ دراز کو ایک بار کھینچ لیتی ہے]

واہ وا اس میں تو تصویروں کا البم ہے۔

[البم کو نکال کر دیکھتی ہے]

یہ تو اندو کی تصویر ہے۔ مگر اس وقت کی جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

[پھر دوسرا ورق الٹتی ہے]

یہ بھی اندو ہی کی تصویر ہے۔

[پھر جلدی جلدی ورق الٹتی ہے اور پریشان و مغموم ہو جاتی ہے]

ہیں! یہ تو سب کی سب اندو ہی کی تصویریں ہیں۔ بس میں اتنے ورق خالی ہیں۔ میری تصویروں کو اس البم میں نہیں رکھا

[پھر کھلی ہوئی دراز کی طرف دیکھتی ہے اور بہت سے خطوط دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے]

اس دراز میں تو خط ہی خط ہیں۔

[ایک خط اٹھا کر دیکھتی ہے]

"میرے پیارے بناتے

اب تمہارے بغیر وقت کاٹنا مشکل ہو گیا ہے ... تمہیں میری کیا پروا۔ وہاں ہر وقت مہ جبینوں کا جمگھٹا ہو گا۔ تمہیں کیوں یاد آتی . . . . مگر میرا تمام وقت تمہاری یاد میں ہی گذرتا ہے . . . . .

تمہاری

اندو"

"تمہاری اندو" کیا کوئی عورت اپنے شوہر کے سوا کسی اور کو ایسا خط لکھ سکتی ہے . . . . . . دیکھوں تو ان خطوں میں کیا لکھا ہے . . . . . .

[ایک ایک کر کے کئی خط کھولتی ہے اور انہیں سرسری نظر سے پڑھتی جاتی ہے]

"تمہاری پیاری اندو" "تمہاری وفادار اندو" "تمہاری اور صرف تمہاری اندو"

[خطوں کو دراز میں پھینک دیتی ہے]

آہ میں اب نہیں پڑھ سکتی۔ اس سے زیادہ مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں . . . .

[سوچتے ہوتے] تو یہ شادی محض ایک بہانہ ہے تاکہ وہ اس پردے میں کھلم کھلا عیش کریں۔ آہ میں نے کتنا دھوکہ کھایا کتنی بڑی غلطی کی . . . .
اگر میں ناگن سے شادی کر لیتی . . . . . . ہیں!
ہیں!! ہیں!!! کیا کہہ گئی۔ وہ بُرے سہی۔ اندو بدعصمت سہی نگران کے ساتھ میں بھی بدکار ہو جاؤں۔ . نہیں! ہرگز نہیں!!
[استقامت سے اُٹھکر البم کو دراز میں بند کر دیتی ہے]

(پردہ)

دوسرا منظر

ابونی بابو کا کمرہ ملاقات

ہدایات۔ ناگن کمرے میں بیٹھا ابونی بابو کا انتظار کر رہا ہے اور خود بخود اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔

ناگن۔ بنائے کی قسمت ہے تو زبردست! سچ ہے خدا جسے دیتا ہے اسی طرح دیتا ہے۔ اور جسے محروم رکھتا ہے . . . مگر میرا خیال تھا کہ بنائے اندو سے محبت کرتا ہے اور اُس نے صرف مجھے ذلیل کرنے کے لئے بینا سے شادی کر لی ہے . . . . . نہیں نہیں وہ ضرور بینا سے محبت کرتا ہے . . . . . .

[ابونی شاردا اور سریش داخل ہوتے ہیں]

ابونی (ناگن سے ہاتھ ملا کر) معاف کیجئے گا۔ ڈاکٹر بوس۔ مجھے آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ میں کچھ ایسا ہی مصروف تھا۔

ناگن۔ کچھ مضائقہ نہیں کہیئے آپ کی طبیعت تو اچھی ہے

ابونی۔ آپ کی مہربانی (سریش کی طرف متوجہ ہو کر) ہاں سریش تم نے تو کہا تھا کہ میں اکثر آیا کرونگا۔

شاردا۔ اُس دن کے بعد آج ہی تو تم آئے ہو۔

سریش۔ میں ان دنوں اتنا مصروف رہا ہوں کہ بنائے تک سے ملنے کی فرصت نہیں ہوئی۔ (دروازے کی طرف دیکھ کر) آہا کیا اچھا ہوا بنائے اور مسز متر بھی یہیں آگئے۔

[سب ایک دوسرے سے ملتے ہیں]

شاردا۔ (بینا سے) بینا تم کچھ بیمار ہو گیا؟ تمہارا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔

بینا۔ نہیں تو۔ میں تو بالکل تندرست ہوں۔

ناگن (علیحدہ ہو کر) ہوں! ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اس موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ (پھر مجلس سے

مخاطب ہو کر بڑی ہمدردی کے انداز سے) تندرست رہیں بھی کیسے مسٹر متر تو دن رات اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ نہ کبھی سیر نہ کوئی تفریح۔ ہر وقت گھر میں بند رہنے سے چھوٹ اُترے تو اور کیا ہو۔ (سریش سے مخاطب ہو کر) ڈاکٹر چیٹرجی اگر مسٹر متر کو فرصت نہیں تو آپ ہی ان کیساتھ ہوا خوری کو تشریف لے جایا کریں۔

بناسے۔ سریش کو اتنی فرصت کہاں۔ ہاں ڈاکٹر بوس اگر آپ ہی کبھی کبھی یہ تکلیف گوارا فرمالیا کریں تو بڑی عنایت ہو۔ آپ کے تو ان کے خاندان سے دیرینہ تعلقات ہیں۔

ناگن۔ بھلا مجھے کیا عذر ہوتا۔ مَیں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ آہا۔ خوب یاد آیا۔ کل پکچر پیلیس میں کلوپٹرا کا مشہور ڈراما دکھایا جائیگا۔ اگر آپ انہیں وہاں لے جائیں تو یقیناً ان کا دل بہل جائیگا۔

بناسے۔ کل شام کو؟ مَیں تو کل سات روز کے لئے بھاگلپور جا رہا ہوں۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔ اور مَیں دس ہزار روپے فیس بھی لے چکا ہوں۔

مینا۔ کلوپٹرا کا ڈراما دیکھنے کا تو مجھے مدت سے اشتیاق تھا۔ لیکن خیر پھر بھی دیکھ لیا جائیگا۔

ناگن (جلدی سے) مگر کل تو اس ڈرامے کی آخری رات ہے۔ پھر کیا معلوم کبھی ہو یا نہ ہو۔

بناسے۔ تو کیا حرج ہے مینا تم شوق سے جاؤ۔ ڈاکٹر بوس تمہیں اپنے ساتھ لے جائینگے۔ (ناگن سے) کیوں ڈاکٹر بوس آپ کل شام کو مصروف تو نہیں۔

ناگن۔ مصروف ہوتا بھی تو کیا تھا۔ یہ تو ایک ضروری کام ہے۔ مَیں ضرور حاضر ہونگا۔

مینا۔ نہیں نہیں مَیں نہ جاؤنگی میری طبیعت اچھی نہیں۔

بناسے۔ اسی لئے تو تمہیں جانا چاہئے۔ میری مصروفیتوں کی وجہ سے تم پر بڑا ظلم ہو رہا ہے (ناگن سے) ڈاکٹر بوس آپ کل انہیں ضرور لے جائیے گا۔

ناگن۔ بہت بہتر

مینا (علیحدہ ہو کر) ان کو میری ذرا بھی پروا نہیں۔ ایک غیر آدمی کے ساتھ مجھے باہر جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔ ایسی محبت جس میں رشک نہ ہو محبت ہی نہیں ہو سکتی۔

بناسے (ناگن سے) ہاں میری غیر موجودگی میں آپ کبھی کبھی آکر ان کی خیریت دریافت کرتے رہئے گا (سریش سے) سریش تمہیں بھی اگر فرصت ہو تو آتے جاتے رہنا۔

سریش۔ بسر و چشم۔ آپ کے کہنے کی کیا ضرورت ہے کیوں بناسے آج گانا وانا کچھ نہ ہوگا۔

بناسے۔ دیکھئے اگر [illegible] مہربانی کر دے تو شاید کچھ ہو جائے۔

مینا (خود بخود) گویا مجھ سے [illegible] کا کوئی حق ہی نہیں

اندو۔ مجھے تو آج زکام سا ہو رہا ہے۔ ہاں بینا گائیگی آؤ بینا کچھ سُنادو۔

بینا (اظہار خفگی سے) نہیں میں نہیں گا سکتی۔

ناگن (علیحدہ ہو کر) آج تو بہت خفا ہیں۔

اندو۔ (بینا سے) نہیں گاؤ گی کیا؟ ہم تو آج تمہیں سے سُنیں گے۔

سریش (مصنوعی عاجزی سے) ہم غریب مردوں کو بھی زکام ہو سکتا ہے۔

شاردہا (سریش سے) اب تم بھی عورتوں کی طرح تکلف کرنے لگے۔ سریش گاؤ بھی۔

سریش (مجبور سا ہو کر) فرمایئے کیا عرض کروں۔

شاردہا۔ جو تمہارا جی چاہے۔ کوئی غزل سُنادو۔ تو کیا کہنا۔

سریش۔ بہت بہتر جو ارشاد۔

(سریش گاتا ہے مگر بار بار اندو کو مخاطب کرتا ہے)

غزل

کس قدر ستمگر ہیں اور جفا نہیں کرتے
غمزہ بھی تغافل میں وہ روا نہیں کرتے
عشق میں عزیزوں کی چارہ سازیاں معلوم
اب دوا نہیں ہوتی اب دعا نہیں کرتے
رہ گئے ہم آخر کو سادگی امیدوں کی
اسقدر بھی اسے ہمت حوصلا نہیں کرتے
مَیں غریب کیا کہتا تم کو آرزو دشمن
ورنہ تم جو کرتے ہو آشنا نہیں کرتے
کیا اُنہیں سے کہدو گے مدعا سہاؔ اپنا
وہ جو مُسکراتے ہیں اور سُنا نہیں کرتے

اندو (الگ ہو کر) کیا واقعی سریش مجھ سے محبت کرتا ہے۔ غزل گاتے وقت وہ میری طرف کیوں دیکھتا تھا۔

بنائے (اندو کو علیحدہ کھڑے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے) اوہو مَیں سریش کا کام تو بھول ہی گیا۔ اندو! ذرا ادھر تو آنا مجھے تم سے ایک کام ہے۔

اندو (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) کیا۔

(دونوں جاتے ہیں)

بینا۔ (یکلخت بیقرار ہو کر اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر) اُف میرا سر چکرا رہا ہے، مجھے غش سا آرہا ہے۔ مَیں گھر جاؤنگی۔

ناگن (کچھ سمجھ کر) سمجھ گیا۔

شاردہا (بینا سے) تو بنائے کو بلاؤں؟

ناگن (علیحدہ ہو کر) یہی وار کرنے کا موقعہ ہے (آگے بڑھکر) نہیں آپ انہیں کیوں تکلیف دیتی ہیں۔ مَیں بھی جا رہا ہوں۔ انہیں لیتا جاؤنگا۔

شاردہا (گھبرا کر) آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟

ناگن۔ معاف کیجئے گا۔ میری طبیعت

اگر آپ کو ان کے میرے ساتھ جانے پر اعتراض ہو تو الگ
بات ہے۔

شاردہا (مجبور ہو کر) نہیں اعتراض بھلا کیا ہو سکتا ہے (مینا سے) مینا کیا واقعی تم گھبرا گئی ہو۔

مینا (بہت لاچاری سے) ہاں اب میں بالکل ٹھیر نہیں سکتی۔

ناگن (جلدی سے) تو پھر آیئے تشریف لے چلئے۔

[دونوں جاتے ہیں]

شاردہا (عذر خواہی کے انداز سے) ناگن آدمی ملنسار ہے میں اسے اتنا اچھا نہ سمجھتی تھی۔ سچ ہے۔ انسان کے ظاہر اور باطن میں بہت فرق ہوتا ہے۔

(اندو اور بناسے واپس آتے ہیں)

شاردہا۔ بناسے۔ مینا کے سر میں درد تھا۔ ناگن بابو تمہارے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے اسے اُنکے ساتھ بھیجدیا ہے۔ وہ پہنچاتے جائیں گے۔

بناسے۔ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں ناگن کا شکریہ ادا کرونگا۔ ہاں اندو کچھ گاؤ تو! تمہیں نکام دُکام کچھ نہیں۔

اندو۔ مینا کی طبیعت اچھی نہیں۔ تم گھر جاؤ۔

بناسے۔ تو کیا آج کھانے سے جواب رہیگا۔ (شاردہا سے) مینا کے سر میں درد ہی تھا نا؟ یہ عورتوں کو ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔

سریش (بناسے کو الگ لے جاتے ہوئے) بناسے ذرا ایک بات تو سُننا۔

اندو (جاتے ہوئے) میں دیکھتی ہوں کھانے میں کتنی دیر ہے۔

شاردہا (اُٹھ کر ابونی کے ساتھ جاتے ہوئے) اندو کی شادی اگر سریش کے ساتھ ہو جائے تو کیسا۔

ابونی۔ ہوں ہوں۔

[شاردہا اور ابونی جاتے ہیں۔ سریش اور بناسے واپس آجاتے ہیں]

بناسے (زور سے) میں جو تم سے کہتا ہوں کہ اسے تم سے محبت ہے۔ تم ابونی بابو سے شادی کا سوال کر دو۔

سریش۔ نہیں بھائی میں انکار سے ڈرتا ہوں۔ جبتک ان کے دل کا حال بھی نہ معلوم ہو جائے۔ میں کچھ نہ کہونگا

بناسے۔ تو تمہاری شادی ہو چکی۔ دُنیا کے کھیل میں جیت اُسی کی رہتی ہے۔ جس میں کام کر گذرنے کا حوصلہ ہو

سریش۔ یہ تو تمہارا ہی حصّہ ہے۔ مجھ میں اتنی ہمّت نہیں۔

بناسے۔ تو پھر دُنیا کے دھندوں میں تمہاری کامیابی مشکل ہے۔

سریش۔ خیر دیکھا جائیگا۔ ہاں تم کو گھر جانا چاہئے۔ مینا بیمار ہے وہ کیا کہیگی۔

بناسے۔ لیکن کیا۔ وہ بیمار ہی کہاں ہے جب ذرا غصّہ ٹھنڈا ہو جائیگا تو میں منالونگا

سریش۔ عورت کو منانا اسقدر آسان نہیں۔

اندو (داخل ہوکر) آئیے کھانا تیار ہے

بناسے (اظہار مسرت سے) حاضر۔

[دونوں جاتے ہیں]

پردہ

تیسرا منظر

بناسے کا کمرہ نشست

ہدایات۔ مینا ایک صوفے پر بیٹھی ہے، سامنے تپائی پر بناسے کی تصویر رکھی ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

مینا۔ صورت سے کس قدر شریف معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کرتوت تو دیکھو! بھلا ایسی کیا بات تھی۔ جو میرے سامنے نہ ہو سکتی تھی۔ کس ڈھٹائی سے اندو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے گئے۔ میرے سینے میں تو جیسے دل ہی نہیں؟ اندو کے ماں باپ تو یہ کھیل دس سال سے دیکھ رہے ہیں وہ کیوں بُرا مانتے۔ . . . میں اب یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ . . . ناگن بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا کہ وہ ہر تمن نہیں ورنہ اندو اُس کے سر تھوپ ہی دی جاتی . . . . ہائے باوا کو ان ہی دنوں ولایت جانے کی سوجھی ورنہ میں یہاں ایک منٹ کے لئے بھی نہ رہتی . . . . . میں ناگن کے ساتھ گھر آؤں یا کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں اُن کو کچھ پروا نہیں . . . .

[رومال کو آنکھوں پر رکھ کر سوچتی ہے]

کلو پیٹرا . . . . اُف کتنی خوفناک عورت تھی . . .

[ملازم داخل ہوتا ہے]

ملازم۔ حضور ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔

مینا۔ بلالو۔

[ملازم جاتا ہے مینا سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے ناگن داخل ہوتا ہے]

مینا (دیکھ کر) آپ ہیں ناگن بابو؟ میں تو سمجھی تھی کہ سریش بابو آئے ہیں۔

ناگن (لفظوں پر زور دیتے ہوئے) سریش بابو کو اتنی فرصت کہاں تھی (مینا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے) کیوں طبیعت کیسی ہے۔ آج تو آپ کا چہرہ بہت اُترا ہُوا ہے۔

مینا۔ ہاں طبیعت کچھ اچھی نہیں۔

ناگن۔ دیکھوں تو آپ کی نبض؟

[کرسی آگے بڑھا کے بالکل مینا کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور نبض دیکھنے کے بہانے سے اس کے ہاتھ کو بہت دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے رہتا ہے]

ناگن۔ بخار تو نہیں۔ کچھ کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی پورٹ پی لیں۔ بلکہ ہر روز پی لیا کریں تو طبیعت کبھی سُست نہ ہو۔

مینا (ہاتھ کو ذرا درشتی سے کھینچ کر) مجھے معاف ہی رکھئے مَیں ایسی علّتوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔

ناگن۔ تو آئیے تھیٹر چلئے۔ طبیعت بہل جائیگی۔

مینا۔ ابھی کل ہی تو سینما گئے تھے۔

ناگن (فوراً موقعہ دیکھ کر) کلوپیٹرا کس قدر خوبصورت تھی۔

مینا۔ مگر مجھے اس کی محبّت کے سین پسند نہیں۔

ناگن۔ کیوں وہی تو اس تماشے کی جان ہیں۔ اور اگر سچ پُوچھئے تو وہی زندگی کی دلچسپی کا سامان ہیں۔ اگر مرد اور عورت اپنی محبّت کا اظہار نہ کریں تو وہ دن جینا مشکل ہو جائے اب اپنی زندگی کو ہی دیکھ لیجئے نا۔

مینا (بگڑ کر) کیوں میری زندگی میں کیا کمی ہے۔

ناگن۔ اس ذکر کو جانے دیجئے۔ جس عورت کا شوہر کسی دوسری عورت سے محبّت کرتا ہو۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔

مینا (ناراض ہو کر) معاف کیجئے ناگن بابو مَیں اپنے شوہر کے متعلق ایسے الفاظ نہیں سُن سکتی۔

ناگن (ڈھٹائی سے) یہ تو آپ کی شرافت ہے وہ آپ کی پروا نہیں کرتے۔ اُن کو اگر کسی چیز سے محبّت ہے۔ تو پیسے سے۔ مَیں تو دس لاکھ کی خاطر اپنی بیوی کو تن تنہا چھوڑ کر نہ جاتا۔

مینا۔ وہ یہ سب کچھ میرے لئے ہی تو کرتے ہیں۔

[اُٹھ کر جانا چاہتی ہے کہ اس کی آنکھ میں تنکا گر جاتا ہے۔ وہ فوراً رومال سے آنکھ کو دبا کر پھر جاتی ہے]

ناگن (مصنوعی فکر سے) کیوں خیر تو ہے کیا ہُوا؟

مینا (آنکھ ملتے ہوئے) کوئی چیز آنکھ میں پڑ گئی ہے۔۔۔۔ اُف کتنی جلن ہے۔ جیسے کسی نے دھکتا ہُوا انگارہ رکھ دیا ہو۔

ناگن۔ دیکھوں تو کیا ہے۔

[آگے بڑھ کر دیکھتا ہے۔ اور آنکھ پر رومال رکھ کر مُنہ سے پھونکتا ہے۔ پھر آہستہ سے رومال کھینچ کر آنکھ کو چوم لیتا ہے]

مینا۔ (ناگن کو زور سے دھکا دیکر) یہ کیا۔ تمہیں یہ جراءت کیسے ہوئی۔ جاؤ میرے گھر سے ابھی نکل جاؤ۔ تم ہرگز کسی

شریف کے گھر آسکو۔

ناگن (عاجزی سے) معاف کیجئے۔ میں نے ارادتاً کچھ نہیں کیا۔ میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ یہ آزمائش بہت سخت تھی۔

مینا۔ بس میں آپ کی زبان سے ایک حرف نہیں سُننا چاہتی آپ تیار ہو جائیں۔ میں آپ کی گاڑی منگاتی ہوں۔

[جاتی ہے]

ناگن (سوچتے ہوئے) میں تو سمجھتا تھا کہ میں نے اس پر قابو پالیا...... مجھے گھر سے نکالتی ہے.... اچھا اچھا میں دیکھ لونگا یہ کتنے پانی میں ہے۔

مینا (واپس آکر) ناگن بابو آپ کی گاڑی تیار ہے۔ آپ تشریف لے جائیے۔

[ناگن دروازے کی طرف جاتے ہوئے مینا کے قدموں پر گر جاتا ہے۔ اور اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے]

ناگن۔ میں جاتا ہوں، میں پھر کبھی نہیں آؤنگا۔ مگر مجھے ایکدفعہ معاف کردو..... جبتک تم معاف نہ کروگی میں تمہارے پاؤں نہ چھوڑونگا۔

مینا (اسے الگ ہٹاتے ہوئے) جاؤ میں نے معاف کردیا۔ مگر پھر مجھے اپنی صورت کبھی نہ دکھانا۔

[دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے]

ناگن تسلیم.....

[جاتا ہے]

[مینا ناگن کے جانے کے بعد واپس آتی ہے]

مینا۔ یہ کیا ہوا۔ اگر میں ذرا نرم ہو جاتی تو بس آج گئی گذری تھی۔ اسی طرح ذرا سی کمزوری عورت کو بدکار بنا دیتی ہے۔ اُف گناہ کا راستہ کتنا سیدھا اور پھولوں سے بھرا ہوا ہے...

[سوچتی ہے]

مگر ناگن تو مجھ پر جادو سا کر گیا۔ جس غصے سے میں نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ اس کا اب میرے دل میں نام ونشان تک نہیں..... کیا عورت ذات اتنی کمزور اس قدر ذلیل ہے..... کیا عصمت وعفت صرف شاعروں کی نظموں میں ہی ملتی ہے......

[پھر سوچتی ہے]

میں ضرور بگڑ گئی ہوں۔ ورنہ ایسے خیال میرے دماغ میں کبھی نہ آتے۔ میرے چہرے پر یقیناً ایک نیک عورت کا جلال نہیں رہا۔ ورنہ ناگن کبھی اتنی جرأت نہ کرتا.... مگر نہیں میں اس دل کو ان خیالوں سے پاک کرونگی.... میں ناگن کو بھلا دونگی۔

[گھٹنوں کے بل کھڑی ہوکر دعا کرتی ہے]

پرماتما میں نے تجھے کبھی نہیں پکارا.... میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تجھے کیسے پکارا جاتا ہے۔ سکھا دے مجھے اپنے آپ کو پکارنا سکھا دے..... میں کمزور ہوں مجھے طاقت دے۔ میں بے بس ہوں میرا سہارا بن میں گر رہی

ہوں مجھے سنبھال !

[صوفے پر سر رکھ دیتی ہے پھر اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتی ہے]

[ناگن پردے کی آڑ سے باہر نکل جاتا ہے]

ناگن۔ بیوقوف عورت سمجھتی ہے مَیں مٹھی میں آئی ہوئی چڑیا کو پھر اُڑ جانے دُونگا۔ ایسے موقعے روز روز نہیں آیا کرتے یا تو آج سب کچھ ہوگیا۔ یا کچھ نہیں اور کبھی نہیں . . . .

[بتی کو گل کرکے دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ بینا کو اطمینان سے سوتے ہوئے دیکھ کر پھر واپس آجاتا ہے]

جانے دو، جانے دو، ایک بے بس عورت کو ستا کر کیا کروگے۔ اتنا ظلم اچھا نہیں . . . . چلو گھر چلو . . . .

[باہر کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ مگر پھر رُک جاتا ہے]

سوتی ہوئی عورت کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے پھر ایسا نظارہ کب نصیب ہوگا۔ ایک بار پھر دیکھ لوں۔

[پھر واپس آتا ہے مگر رُک رُک کر سوچتا ہے]

کیا مَیں یہ سب کچھ صرف اس سے انتقام لینے کے لئے کر رہا ہوں . . . . نہیں . . . . نہیں مجھے اس سے محبت ہے۔ بنائے اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ بینا کی محبت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ بینا ضرور مجھ سے محبت کرتی تھی۔ بنائے نے محض مجھے ذلیل کرنے کے لئے بینا سے شادی کی . . . . تو کیا مَیں اس کا انتقام نہ لونگا....

[دوسرے کمرے کے دروازے کے اندر جاکر اسے بند کر دیتا ہے۔ اور اندر کی بتی گل کر دیتا ہے]

[بنائے داخل ہوتا ہے۔ ایک نوکر اس کا اسباب سفر اُٹھائے ہوئے ہے]

بنائے۔ اچھا ہوا مقدمے میں راضی نامہ ہوگیا۔ ورنہ ستا روز گھر سے باہر رہنا پڑتا۔ بینا مجھے اسقدر جلد واپس آتے دیکھ کر حیران ہوجائیگی . . . . .

[اندر کے کمرے کی طرف دیکھ کر]

بینا سوگئی ہے، اِس وقت کیا جگاؤں۔

[ملازم سے] تم سامان یہیں رکھدو اور جاؤ۔

[ملازم سامان رکھ کر جاتا ہے]

[بنائے دروازے کی طرف بڑھتا ہے مگر اُسے اندر سے بند پاتا ہے]

تنہائی کی وجہ سے دروازہ بند کرکے سوئی ہے، اب جب کبھی باہر جایا کروں گا۔ بینا کو ساتھ لے جایا کروں گا . . . . . خیر مَیں غسل خانے کے دروازے سے جاتا ہوں۔

[جاتا ہے]

[اندر کے کمرے سے شور و غل کی آواز آتی ہے]

بنلاتے۔ جاتا کہاں ہے بدمعاش میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا۔

[ناگن بھاگتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بنلاتے اُس کے پیچھے بھاگتا ہوا آتا ہے اور ٹھوکر کھا کر گرتا ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور وہ معاً بیہوش ہو جاتا ہے]

بنلاتے۔ ہائے۔

[مینا گھبرائی ہوئی آتی ہے اور بنلاتے کے زخم کو دیکھ کر اور اُسے بیہوش پاکر حواس باختہ ہو جاتی ہے]

مینا۔ ان کا تو سر پھٹ گیا اُف بالکل بیہوش،

[اپنا سر پیٹ کر] او ڈائن تو نے اپنے شوہر کو مار ڈالا۔

[زمین پر سر پٹک کر بیہوش ہو جاتی ہے]

پردہ

غم نصیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۹ جون

کچھ یاد نہیں آتا کہ میں تم سے اپنی کہانی کہاں تک بیان کر چکا ہوں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ رات کے دو بج چکے تھے، جب کہیں جا کر میں بستر پر لیٹا اور اگر اُس وقت ہم تم اکٹھے ہوتے، تو پھر خلوتیانِ راز کی کیسی صحبت گرم ہوتی! سچ جاننا مجھے تم سے اتنا کچھ کہنا تھا کہ گمان غالب ہے رہی سہی رات بھی باتوں باتوں میں کٹ جاتی۔

شاید میں نے تم سے ذکر نہیں کیا کہ جب ہم ناچ گھر سے واپس آ رہے تھے، تو اثنائے راہ میں کیا واقعہ ہوا۔ اس وقت کچھ عجب سہانا سماں تھا۔ دیہات کی کھلی فضا ابرِ باراں کے فیض سے شاداب تھی۔ اور جنگل کے درختوں سے مینہ کا پانی قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک رہا تھا۔ ہمارے ساتھی پڑے سوتے تھے۔ چارلوٹی نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ سونا تو نہیں چاہتے؟" اور کہا کہ اگر جی چاہتا ہو تو میری خاطر کوئی تکلف نہ کیجئے اور سو رہیئے۔" میں نے اُس کے چہرے پر نظر جما کر جواب دیا۔ "جب تک وہ آنکھیں بے خواب ہیں، میری آنکھوں کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔" ہم دونوں جاگتے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد چارلوٹی کے گھر پہنچ گئے۔ خادمہ نے ہلکے سے دروازہ کھولا۔ اور چارلوٹی کی فکر آمیز پوچھ پکار کے جواب میں اُسے یقین دلایا۔ کہ اُس کے والد اور بہن بھائی بخیر و عافیت تھے۔ اور ابھی تک سو کر نہیں اُٹھے تھے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے دن کے دوران میں اُس کے ہاں آنے کی اجازت چاہی۔ اُس نے اس درخواست کو بطیبِ خاطر منظور کیا۔ اور میں خوشی خوشی اپنے گھر چلا آیا۔ اُس وقت سے تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ چاند سورج اور تارے پڑے اپنے اپنے چکر کاٹیں، مجھے اُن کی کوئی خبر نہیں۔ دن جائے، رات جائے، میرے لئے وہی سرخوشی کا عالم ہے۔ دُنیا کا ہونا نہ ہونا میرے لئے ایک برابر ہے۔

---

۲۱ جون

میری زندگی کے دن خوشیوں سے بھرپور ہیں۔ خدا نے ایسی خوشی اپنے بندگانِ خاص کو بھی عطا نہ کی ہوگی۔ آگے چلکر قسمت خدا جانے کیا دکھائے، لیکن میں یہ کبھی نہ کہہ سکونگا۔ کہ میں نے اچھے دنوں کا منہ نہیں دیکھا۔ مجھے کبھی اس کا انکار نہ ہوگا کہ میں دُنیا کی پاکیزہ ترین مسرت کا لذت کش رہ چکا ہوں۔ تم والہیم کے نام سے آشنا ہو۔ ان دنوں میں نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس جگہ سے کہ میں چارلوٹی سے صرف

دو ایک میل دُور رہتا ہوں۔ اس لئے میری زندگی وہاں سُکھ چین سے بسر ہوتی ہے۔ اور مَیں اُن تمام خوشیوں اور خرّمیوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہوں، جو کبھی انسان کے نوشتۂ ازل میں لکھی جا سکتی ہیں۔

جب مَیں نے اوّل اوّل والیم کو اپنی مرغوب سیرگاہ انتخاب کیا۔ تو یہ میرے خواب و خیال میں بھی کب آیا تھا۔ کہ راحت آباد فردوس یہاں سے اس حد تک نزدیک ہے۔ کتنی مرتبہ مَیں نے دامنِ کہسار میں، یا دریا پار کے سبزہ زاروں میں گشت لگاتے ہوئے اس شکارِ قلب و نگاہ کو دیکھا ہے۔ جو کہ آج میرے دل کی تمام خوشیوں کا نشیمنِ راحت ہے!

میرے عزیز دوست! مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ لوگوں کو سیر و سیلان سے اتنی رغبت کیوں ہے؟ اُنہیں نئے نئے انکشافات کا شوق کیوں چراتا ہے، اور پھر وہ کونسی مخفیہ قوت ہے۔ جو بعد؟ اُنہیں مجبور کرتی ہے کہ اپنے محدود دائرۂ حیات میں واپس آجائیں، رسمِ دُنیا کے پابند ہوکر رہیں۔ اور جو کچھ اُن کے گرد و پیش واقعہ ہو رہا ہے اُس میں خواہی نخواہی داخل نہ دے کر اپنے آپ کو تنقیح کی اُلجھنوں سے رہائی بخشیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جب یہاں اوّل اوّل میرا گذر ہوا ہے۔ اور مَیں نے بلندیٔ کہسار پر سے اس دلکشا وادی کا نظارہ کیا ہے۔ تو دیکھتے ہی منظر کی طلسمی دلفریبی میرے دل میں کھب گئی۔ وہ سامنے کا چھوٹا سا جنگل۔ اُس کے سایہ دار خلوت خانوں میں بیٹھنا کیسا فرحت بخش مشغلہ ہے! اُس چٹان پر سے ارد گرد کا منظر کیسا پُر فضا نظر آتا ہے! اور پھر وہ دُور تک پھیلا ہوا سلسلۂ کوہ، اور اُس کے دامن میں کی وہ خوش منظر وادیاں! دل نے چاہا آؤ اس نیرنگِ نظر میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ مَیں گیا بھی، لیکن جس چیز کی جستجو تھی وہ نہ پائی۔ اور بے نیلِ مرام لوٹ آیا۔

فاصلہ، میرے دوست، مستقبل کی تصویر ہے۔ ایک ناپیدا کنار دھندلکا ہماری رُوحوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے جس میں ہماری نظریں بھٹکتی پھرتی ہیں لیکن دیکھا کچھ نہیں جاتا، جس میں ہماری عقل سرگرداں رہتی ہے لیکن پتہ کچھ نہیں چلتا۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہو سکے۔ تو اپنے تمام وکُل وجود کو اس پہنائے پُر اسرار کے سپرد کر دیں، تاکہ وہ پیش بینی کی کامل و شاندار مسرت سے معمور ہو جاتے لیکن افسوس، جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے، جب دُور کی دُھندلی دُھندلی نظر آنے والی چیزیں نزدیک کی آشکار چیزیں بن جاتی ہیں، تو پھر صورتِ حالات پلٹا کھاتی ہے، ہم پھر وہی پہلے سے مفلس و نادار ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے وہی گھٹا ٹوپ دُھند ہوتی ہے۔ اور ہماری رُوحیں اُسی طرح مسرت کے سرابِ تشنہ فریب کو پالینا چاہتی

ہیں لیکن نہیں پاتیں۔

اسی طرح تھکا ہارا مسافر سرزمینِ وطن کی جستجو میں دشت غربت کے اوگھٹ راستوں پر ہانپتا کانپتا چلا جاتا ہے اور اپنے غریب خانہ کی محدود چاردیواری میں، اپنی بیوی کے آغوشِ محبت میں، اپنے بچّوں کی پیار بھری حرکات میں اور اُس محنت و مشقت میں جو اُسے اُن کو پالنے پوسنے کے لئے کرنا پڑتی ہے، اُسے وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جس کی تلاش میں اُس نے دُنیائے بسیط کا ذرّہ ذرّہ چھان ملا۔

صبح، طلوعِ آفتاب کے وقت، جب میں والیم جاتا ہوں اور باغ میں جاکر اپنے کھانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے سٹر توڑتا ہوں۔ جب میں اُنہیں چھیلنے بیٹھتا ہوں اور وقفہ لے کر ساتھ ساتھ ہومر کا مطالعہ بھی کرتا جاتا ہوں پھر باورچی خانہ سے ایک دیگچی اُٹھا کر مکھّن اُس میں ڈالتا ہوں اپنی خوراک آگ پر رکھ دیتا ہوں۔ اور اُسے ڈھانپ کر پاس ہی بیٹھ جاتا ہوں۔ کہ موقعہ بموقعہ اُسے اُلٹتا پلٹتا جاؤں تو اُس وقت میرے تصوّر میں پینیلوپ کے نامدار شیدائیوں کی تصویر پیش رہی ہوتی ہے۔ وہ مجھے ہُو بہُو اپنے ہاتھوں سے جانوروں کو ذبح کرتے، کھاتے پکاتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ مجھے دُنیا بھر کی کسی اور چیز سے اتنی پاک اور سچّی خوشی حاصل نہیں ہوتی جتنی خانگی زندگی کے ان لطیف پہلوؤں سے، جن کی ذوق شناسی کا بہرہ وافر قدرت نے مجھے عطا کر رکھا ہے ——— اور میں اس احسان کے بدلے اُس کا جتنا بھی شکر و سپاس کروں کم ہے۔ میرے لئے اس سے بہتر خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ مجھے دہقان کی پاک و سادہ مسرت کا احساس ہے۔ جس کے دسترخوان پر گاڑھے پسینے کی کمائی نان و نمک کی صورت میں چنی ہوتی ہے۔ اور جو صرف کھانے پینے کا لُطف ہی نہیں اُٹھاتا بلکہ اُن شاد کام دنوں اور درخشاں صبحوں کو خوش ہو ہو کر یاد کرتا ہے۔ جو اُس کو اپنے پودوں کی دن دونی رات چوگنی بڑھتی سے حاصل ہوتی تھی۔

پرسوں کا ذکر ہے کہ جج صاحب کے ایک ملاقاتی ڈاکٹر صاحب شہر سے تشریف لائے۔ میں اُس وقت نیچے کی منزل میں بچّوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا۔ ان میں سے بعض ہنسی ہنسی میں میرے ساتھ لڑتے بھڑتے تھے۔ بعض دائیں بائیں اُچھلتے کودتے پھرتے تھے۔ اور جب میں اُنہیں لپٹ کر چٹکیاں بھرتا یا گدگدیاں کرتا تو وہ شور و غل سے سارے مکان کو سر پر اُٹھا لیتے۔ ڈاکٹر صاحب ذرا طرحداری کے دلدادہ اور رُوکھے پھیکے سے آدمی ہیں۔ اُنہیں حفظِ وقار کا بیحد خیال رہتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی پوشاک کی شکنیں درست کرتے رہتے ہیں کسی سے گفتگو کر رہے ہوں۔ تو بھی لگاتار اپنے کپڑوں کی ساخت و پرداخت میں مصروف

رہیں گے اگر کہیں بھولے سے کوئی سلوٹ نہ رہ جاتے۔
مجھے اُن کے چہرے سے صاف صاف نظر آ رہا تھا کہ انہیں میرا اعدیہ پسند نہیں آیا۔ وہ اسے ایک معقول آدمی کے لئے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ لیکن میں نے اُن کی رائے کو چنداں وقیع نہ خیال کیا۔ اور انہیں اپنی پُر مغز گفتگو میں مصروف چھوڑ کر چپکے سے بچّوں کو کھلونے بنا بنا کے دیتا رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب یہ شکایت کرتے ہوئے شہر چلے گئے کہ "یہ بچے تو پہلے ہی بگڑ چکے ہیں۔ اور جو رہی سہی خوبیاں لے دے کر اُن میں ہیں اُنہیں ویرٹر تہس نہس کر دیگا۔"

میرے عزیز دوست، روئے زمین پر کوئی چیز مجھے بچّوں سے زیادہ پیاری نہیں۔ جب میں ان پر غور و فکر کرتا ہوں، جب میں اس ننھی مخلوق میں اُن تمام نیک اوصاف و اطوار کو دیکھتا ہوں جو ایک دن اُن کے لئے لازمۂ حیات ہونگے، جب میں اُن کو ضد کرتے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہی ضد ایک دن استقلال اور ثابت قدمی بن جائیگی۔ جب میں من موجی بچّوں میں اُس خوش باشی اور سُبک روحی کو دیکھتا ہوں جو انہیں سیلِ حوادث کے ریلے سے بلند، بہت بلند، ہوا کے نشاط میں لئے پھریگی تو اُس وقت مجھے بنی نوعِ انسان کے رہبرِ ہدایت یسوع مسیح کے یہ زرّین الفاظ یاد آتے ہیں۔ کہ "اگر تم اُن میں سے ایک کی طرح نہ ہو جاؤ!" اور یہاں تو یہ حالت ہے۔ کہ یہ بچے جو ہمارے برابر کے ہمجولی ہیں۔ جن کا حق ہے کہ ہم انہیں اپنے ہم چشم سمجھیں۔ اپنا نمونہ سمجھیں۔ ہم اُن سے ماتحتوں کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ اپنی رضا و رغبت سے کیا مجال جو قدم تک بھی اُٹھا سکیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو اُنکی قوتِ ارادی کو غصب کر لیتے ہیں۔ کیا ہمارے پاس اپنی کوئی قوتِ ارادی نہیں؟ اور یہ حق، یہ شرف، ہمیں کیوں حاصل ہے؟ کیا اس لئے کہ ہم سن و سال میں اُن سے بڑے ہیں۔ اور دُنیا کی اونچ نیچ کو اُن سے زیادہ دیکھ بھال چکے ہیں؟ اے خدائے ذو الجلال! تو جو فرازِ عرش سے ہم سب کو دیکھتا ہے، تیری نظروں میں چھوٹے بڑے سب یکساں ہیں۔ تجھے سب بچّے ہی بچّے نظر آتے ہیں، اور تیرے پیامبر فرزند نے آج سے سالہا سال پہلے اعلان کر دیا تھا۔ کہ کن لوگوں کو تیری نظروں میں شرفِ قبول حاصل ہے۔ لیکن لوگ اُس کے ارشادات کو سُنتے ہیں۔ اور اُن پر عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنے بچّوں کو بھی اپنا ہی نمونہ پیشِ نظر رکھ کر تربیت کرتے ہیں۔ اور اپنے مذموم خیالات اُن کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں ـــــ یہ تو ایک پُرانی رام کہانی ہے! اس کا انجام معلوم۔

خدا حافظ، ولیم، اب مجھ میں اس مضمون پر خامہ فرسائی کرنے کی تاب باقی نہیں رہی۔

(باقی باقی)

محمد ہادی حسین

نغمۂ صبح

صبح خنداں ہے موسم گل ہے — نعرہ زن اپنی لَے میں بُلبل ہے
موجزن چار سُو تبسّم ہے — یہ سماں پیکرِ ترنّم ہے
دلربا گیسوئے پریشاں ہیں — ان پہ لاکھوں بناؤ قرباں ہیں
دامنِ کوہ میں کوئی جوگی — بیٹھ کر ہے بجا رہا بنسی
سب سے بہتر یہی عبادت ہے — لب پہ بس نغمۂ محبّت ہے
نغمۂ سرمدی کی تانیں ہیں — بزم بالا کی داستانیں ہیں
رُوح لرزاں ہے مثلِ تارِ رباب — جس کو نغمے کی موج ہے مضراب
وجۂ تسکیں یہ بے قراری ہے — نشّہ آگیں یہ بے قراری ہے
روح مضطر نہیں ہے رقصاں ہے — فرطِ نغمہ سے تار لرزاں ہے

عالمِ بیخودی میں جاتا ہوں
تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

جامِ سُرور

شام کا دلفریب منظر ہے — رُوح پرور ہے کیف آور ہے
مشک افشاں ہے تیرگی شب کی — کیف میں خامشی ہے ڈوبی ہوئی
ہے خراماں ہوائے عنبر بار — ہے فضا رشکِ طبلۂ عطّار
دامنِ آسماں شفق سے پُرخوں — ہے رواں بحرِ بادۂ گلگوں
خوب جی بھر کے پی رہے ہیں سبھی — چھا رہی ہے ہر اک پہ مستی سی

میکدہ ہے کہ بزمِ ہستی ہے | ذرّے ذرّے پہ جوشِ مستی ہے
مَیں بھی جامِ طہور پیتا ہوں | بادۂ پُر سرور پیتا ہوں

عالمِ بے خودی میں جاتا ہوں
تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

پیکرِ نغمہ

چاندنی شب کنارِ دریا ہے | ہلکا ہلکا سا ابر چھایا ہے
چاند کی چاندنی سُریلی ہے | پھیکی پھیکی ہے پیاری پیاری ہے
ساغرِ ماہ میں شرابِ سرود | کہکشاں میں رواں ہے آبِ سرود
فلکِ نیلگوں میں موسیقی | عالمِ پُر سکوں ہے موسیقی
کوہ و صحرا میں نغمۂ دلگیر | موجِ دریا میں نغمۂ دلگیر
یہ ستارے جو ٹمٹماتے ہیں | رقص کرتے ہیں گیت گاتے ہیں
نغمہ پیرا ربابِ ہستی ہے | "پیکرِ نغمہ" ساری بستی ہے
ذکر میں تیرے محو ہے عالم | شورِ ہو حق ہے اُٹھ رہا پیہم
راگ تیرا سکوت گاتا ہے | مست و بیخود مجھے بناتا ہے

عالمِ بیخودی میں جاتا ہوں
تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

صہبائی

تبصرہ کتب و رسائل

مکاتیب اکبر۔ اس نام سے لسان العصر سیّد اکبر حسین اکبر الہ آبادی مرحوم کے خطوط کا یہ ایک اور مجموعہ "دائرہ ادبیہ لکھنؤ" نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے موسومہ خطوط شائع فرما چکے ہیں۔ دائرہ ادبیہ کی اس اشاعت میں وہ خطوط فراہم کئے گئے ہیں۔ جو اکبر مرحوم نے، اودھ کے ممتاز و شہیر شاعر، جناب مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں، کہ اکبر مرحوم کے بے شمار ارادتمندوں کے لئے ہر وہ نقطہ جو رشحات اکبر سے منسوب و موسوم کیا جا سکتا ہو۔ ادبی و تاریخی اور ناگزیر اہمیت رکھتا ہے۔ اور قابلِ تحفظ ہے لیکن بہتر ہوتا کہ وہ تمام خطوط، جو اکبر مرحوم نے اپنے متعدد احباب و اقارب اور شناسا لوگوں کو مدت العمر میں لکھے ہیں، جمع کر لئے جاتے اور اُن میں سے ایک اچھا مجموعہ جو چند اہم عنوانوں سے متعلق کیا جا سکتا، انتخاب کر کے، بہ یک وقت شائع کر دیا جاتا۔ تاہم، ہم دائرہ ادبیہ کی اس پُر ذوق دکاوش سعی کو مشکور ہی سمجھتے ہیں۔ اور توقع کرتے ہیں کہ لوگ اس مجموعے کی قدر کرینگے۔ اور دائرہ ادبیہ کی کوشش کی داد دینگے۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ۔ ناظم صاحب دائرہ ادبیہ محمود نگر لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔

حیات خسرو۔ اس کتاب کے تعارف اور جذب پسندیدگی کے لئے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا۔ کہ ہندوستان کے غیر معمولی صاحب دماغ اور مقدس بزرگ، حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی ہیں۔ اور ہندوستانِ جدید کے امام المصنفین علامہ شبلی مرحوم کے مرتبہ ہیں۔ "دائرہ ادبیہ" کے مجاہدات علمی کا ثبوت اس کتاب کی اشاعت بھی ہے۔ قیمت آٹھ آنے ہیں دائرہ ادبیہ۔ محمود نگر لکھنؤ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سرگذشت الفاظ۔ یہ کتاب، اپنے موضوع کے اعتبار سے زبان و ادب اُردو میں، ایک بدیعہ فنیہ اور قابلِ لحاظ دخلہ فنِ جدید ہے۔ اربابِ نقد، اور ادیبانِ کامل، الفاظ کی خصوصیات سے واقف ضرور ہوتے ہیں۔ اور رعایات و مناسبات کا ملکہ بھی وسعت مطالعہ اور مشق کہن سے پیدا ہو جاتا ہے اور اہل نقد کسی شعر یا کسی عبارت کی خوبی کی یہ تعریف بھی کرتے ضرور ہیں۔ کہ اس لفظ کے بجائے دوسرا مترادف المعنی لفظ اگر رکھا جائے، تو کلام میں لطف کم ہو جائیگا" لیکن باعتبار فن کے کبھی ان خصوصیات الفاظ کو تفصیل و انضباط کے ساتھ زیر مطالعہ و غور نہیں لایا گیا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح ہر لفظ، اپنا محل استعمال رکھتا ہے اسی

طرح اس کا محل وضع بھی ضرور ہوتا ہے۔ اور اس لئے ہر ایک لفظ علاوہ صورت و مفہوم موجودہ کے مختلف قسم کی معاشری و قومی تاریخ کا گنجینہ بھی ہوتا ہے۔ جب ایک شاعر و ادیب محلِ وضع اور محلِ استعمال کے مطابق کسی لفظ کو استعمال کریگا تو قدرتی طور پر محاسنِ کلام میں ایک قسم کا فروغ ضرور پیدا ہو جائیگا غرضکہ یہ موضوع' الفاظ کی تاریخ اور فلسفہ لغت کی جامعیت رکھتا ہے۔ اور ارباب ادب کے لئے اُتنا ہی ضروری ہے جتنے بلاغت، بیان اور بدیع وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ مگر ہنوز فنون ادب اُردو اس بحث سے ناآشنا تھے۔ اب مولوی احمد الدین صاحب بی۔ اے وکیل لاہور نے' اپنی جدید الاشاعت تالیف موسومہ "سرگذشت الفاظ" میں اس موضوع کو بوجہ احسن' بانداز مسلسل شرح و بسط پیش کر کے ایک ایسا قابلِ قدر و یادگار کام کیا ہے جس پر زبان اُردو ہمیشہ آپ کی منت کش رہیگی۔

پھر ترتیب و تدوین کے لحاظ سے بھی "سرگذشت الفاظ" نہایت مکمل کتاب ہے۔ اور مؤلف موصوف نے جس اہتمام و کاوش سے جن عنوانوں کا التزام کیا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موضوع' باوصف' اجنبیت ترتیب' علمی اور نظم منطقی کی دلچسپیوں اور قابلِ قبول خصوصیتوں سے مزیّن ہے اور امید ہے کہ یہ اضافہ و تعارفِ فن' اہل ادب کی توجہات کو پوری کوشش کے ساتھ' معروفِ توسیع و تکمیل کر دے گا۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے تقطیع کے تقریباً تین سو چھپن صفحات پر کتاب ختم ہوتی ہے قیمت عار شیخ مبارک علی تاجر کتب' اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے حاصل ہو سکتی ہے۔

علیگڈھ میگزین۔ یہ طلبائے علیگڈھ یونیورسٹی کا ماہوار ادبی رسالہ ہے۔ جس نے گذشتہ قلیل مدت میں' صوری و معنوی ترقیوں کے مدارج نہایت نمایاں طریقے پر طے کئے ہیں اور اس وقت اس کی دلچسپی و اہمیت ملک کے خاص خاص رسالوں کے پہلو بہ پہلو ہے۔ اگر تبدیلِ ادارۃ کے ضمن میں پابندی وقت کا انقلاب بھی ہو چکا ہے۔ تو امور انتظامی میں سے کوئی امر قابلِ شکایت نہیں ہو سکتا۔ موجودہ نمبر علاوہ محاسنِ مضامین کے اچھی طباعت کا بھی نظر افروز نمونہ ہے۔ گو عام اہلِ ذوق کے لئے رسالہ کافی سرمایۂ دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں اس رسالہ کو بہت ہی خاص ہونا چاہیئے۔ اور علیگڈھ میگزین کو خالص علمی رسالہ بنا دیا جائے۔ تو مناسب ہوگا کیونکہ ایک مرکزی درسگاہ کے رسالہ کے شایانِ شان یہی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ' مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے طلب فرمائیے۔

کلام محروم۔ منشی تلوک چند محروم بی۔ اے پنجاب کے مشہور اردو قادر الکلام شاعر ہیں۔ اصناف نظم و شعر پر پوری قوت سے طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ موصوف کے کلام سے جدت' جذبات' نزاکت' تخئیل معنویت اور خوبی بیان کا ثبوت ملتا ہے قیمت حصّہ اوّل ۱۲ دوم ۱۲ سوم ۱۲ غالباً مسرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

دمر کنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ ... چند پرنٹر چھپا۔ اور دار الاشاعت ادب لطیف کے لئے سیّد افضال علی حسنی پبلشر نے شائع کیا